پریم چند
فن اور تعمیرِ فن

پریم چند: فن اور تعمیرِ فن

اس تحقیقی مقالے کے ہندی مسودے پر الہ آباد یونیورسٹی نے ہندی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے گراں قدر انعام سے نوازا

مصنّف کے بارے میں

نام : جعفر رضا

پیدائش : اتراؤں (الہ آباد) — یکم دسمبر ۱۹۳۹ء

تعلیم : بی کام - ایل، ایس، جی ڈی - ایم اے (اردو) ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو اور ہندی)

مشغلہ : اردو کی خدمت گذاری اور شعبۂ اردو، الہ آباد یونی ورسٹی میں درس و تدریس

بعض اُردو کتابیں

● تنقید و تحقیق

پریم چند کہانی کا رہنما ۱۹۶۹ء

دبستان عشق کی مرثیہ گوئی ۱۹۷۴ء

پریم چند فن اور تعمیر فن ۱۹۷۷ء

● ترتیب و انتخاب

نغات رہیرا ۱۹۶۶ء — توبۃ النصوح ۱۹۶۶ء

نیرنگ خیال ۱۹۶۷ء — میر کی چند مثنویاں ۱۹۶۸ء

گنجینۂ معنی ۱۹۶۹ء — گل نغمہ ۱۹۷۷ء

عوامی اسٹیج کا پہلا ڈراما : راجا گوپی چند اور جالندھر (زیر طبع)

جہانِ پریم چند (کہانیوں کا مجموعہ) (زیر طبع)

● بچوں کے لیے

اردو کی پہلی کتاب ۱۹۶۷ء — بچوں کے اقبال ۱۹۷۴ء

آسان اردو ۱۹۷۷ء

پریم چند: فن اور تعمیرِ فن

اُردو ہندی ناولوں اور کہانیوں کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر جعفر رضا

شبستان
۲۱۸ شاہ گنج الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

PREMCHAND : FAN AUR TAMEER-E-FAN
(Literary Criticism)
by
DR. JAFAR RAZA

طبع دوم : ۱۹۸۰ء
ناشر: شبستان ۲۱۸ شاہ گنج الہ آباد
مطبع: تاج آفسٹ پریس الہ آباد
خطاط: سلیم اللہ نیر الہ آباد

قیمت: ۴۰ روپے

انتساب

ڈاکٹر سیّد مسیح الزّماں مرحوم

"یاد سے تیری دلِ دردآشنا معمور ہے
جیسے کعبہ میں دعاؤں سے فضا معمور ہے"

ترتیب

حرفِ آغاز

منصفو!

اس نو آموز نے اشاعتِ اول کی عرض داشت ۵ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو تحریر کی تھی۔ آج اس عالم میں کہ سوزِ نہاں سے وجود کی ہڈی ہڈی جل رہی ہے، ہوش ربا گرانی نے ذہنی توازن کھو دیا ہے، اپنے کو پرایا بنا دیا ہے ـــ بھلا، علمی موضوعات پر کتابوں کی خریداری کون کرے گا! پھر اتنی "مہنگی کتاب" کی خریداری ـ ایک سال میں دوسری اشاعت کی تیاری!

یہ سپاس گذار آپ کی توجہ خاص کے لیے تشکّر کے الفاظ نہیں لا سکتا، مزید سعادت ہو رہی ہے "پریم چند شتی" کے موقع پر دوبارہ اشاعت ہو رہی ہے!

اتنے کم عرصے میں دوسری اشاعت کے لیے تحقیق و تدقیق کے گہر ہائے آب دار کہاں سے لاؤں۔ اگر کہیں سے حاصل کر سکتا تو بلاشبہ دستارِ فضیلت میں ٹانک دیتا۔ یہ اشاعت، طبعِ ثانی ہے اور بس! البتہ کتابت و طباعت کی صریحی غلطیاں درست کر دی گئی ہیں ـــ

ہاں، چند مقامات پر بعض مباحث میں ضروری ترمیم و اضافہ ہے ـــ ان کے علاوہ کتنی خامیاں ہوں گی، جن تک اپنی رسائی نہیں، معذرت ـــ اگر آپ نے توجہ کی، حیاتِ مستعار باقی رہی تو آئندہ سہی!

شعبۂ اُردو، الٰہ آباد یونی ورسٹی

۲۸ر جنوری ۱۹۸۰ء

یاد بخیر، ۱۹۶۸ء کے اواخر کا ذکر ہے!

یونی ورسٹی کے کسی سرکاری کام سے اُردو کے بزرگ اور نامور عالم ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر آل احمد سرور الہ آباد تشریف لائے تھے۔ استاد محترم پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے مکان پر شرف ملاقات حاصل ہوا۔ سرور صاحب نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں، مجھ پر خصوصی نوازش فرماتے ہیں۔ انھوں نے میری ادبی سرگرمیوں کے بارے میں سوال کیا۔ میرے جواب دینے سے قبل احتشام صاحب نے انتہائی شفقت آمیز الفاظ میں 'پریم چند' کہانی کا رہنما، کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ اس میں ایک سوال اٹھایا گیا ہے کہ پریم چند اردو کے مصنف ہیں یا ہندی کے — ! موصوف نے اپنا فیصلہ بھی دے دیا کہ اس طرح کے مباحث سے اختلاف کی راہیں کھلتی ہیں، اس لیے انھوں نے اس مسئلے کو کتاب میں شامل کرنے سے روک دیا۔ سرور صاحب مسکرائے: "تم کیا چاہتے ہو؟" جواب میں راقم السطور نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا کہ پریم چند بنیادی طور پر اردو کے ادیب و فنکار ہیں۔ ہندی میں اُن کے ترجمے شائع ہوئے ہیں جو زیادہ تر دوسروں کے قلم کے رہین منت ہیں۔ اس لیے علمی و ادبی نہج سے اس کی وضاحت ہونا چاہیے کہ ہندی میں پریم چند کی اصل حیثیت وہی ہے جو کسی ادیب کو کسی دوسری زبان میں تخلیقات کے ترجمے شائع ہو جانے سے حاصل ہوتی ہے۔ میں نے اپنے بیان کی تائید میں محترم ڈاکٹر عابد حسین کی مثال دی جنھوں نے اردو ماہنامہ 'جامعہ' میں اپنے زمانۂ ادارت میں پریم چند کی مشہور و معروف کہانی "کفن" پہلی بار شائع کی تھی۔ بھلا مجھے زیادہ کہنے کی جسارت ہی کب تھی، احتشام صاحب اور سرور صاحب

کے درمیان گفتگو ہوتی رہی۔ آخرکار سرور صاحب نے احتشام صاحب کو رضامند کرلیا کہ پریم چند کی 'ہندیت' اور 'اردوویت' کا سوال کتاب میں اٹھایا جائے۔ سرور صاحب کو اس موضوع سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ایک سلسلے میں موصوف کو امریکا جانا پڑا تو وہاں سے ایک خط میں تاکید فرمائی کہ یہ بحث کتاب میں ضرور شامل کی جائے۔ احتشام صاحب نے اجازت دے دی تھی۔ نتیجہ میں یہ مسئلہ کتاب میں شامل کیا گیا لیکن اس سلسلے میں عملی دشواری یہ تھی کہ کتاب سے زیادہ ترحصے کی کتابت ہوچکی تھی۔ انجام کار درمیان کے چند صفحات کی دوبارہ کتابت کرائی گئی اور آخر میں ضمیمے کے طور پر کہانیوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا۔

متذکرہ بالا کتاب کی اشاعت کے بعد ممتاز ادیبوں، ناقدوں اور دانشوروں نے نہ صرف اپنے شفقت آمیز خطوط سے حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ اس پر تبصرے بھی کیے۔ ان بزرگوں میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر وقار عظیم، پروفیسر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، مدن گوپال، امرت رائے، ڈاکٹر قمر رئیس اور پروفیسر محمد حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس مباحثے کو خصوصی اہمیت اس وقت حاصل ہوئی جب اُردو کے مشہور و معروف شاعر اور پریم چند کے جگری دوست پروفیسر فراق گورکھپوری نے انگریزی ہفتہ وار "لنک" کے یکم فروری ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں متذکرہ بالا کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر راقم السطور کے معروضات پر مہر تصدیق ثبت فرما دی۔

خیال تھا کہ اس کا ہندی ترجمہ بھی شایع ہو۔ کچھ ابتدائی کام بھی کرلیا تھا کہ اسی درمیان ایک موقع پر الہ آباد یونی ورسٹی کے اس وقت کے صدر شعبۂ ہندی ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے سے اس موضوع کا ذکر آگیا۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اس مطالعے کو صرف کہانیوں تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ پریم چند کے تمام افسانوی ادب ــــ ناولوں اور کہانیوں ــــ کا تقابلی مطالعہ زیادہ مفید ہوگا۔ انھوں نے ہمت افزا انداز میں آمادہ کیا کہ مجھے اس موضوع پر ہندی میں ڈی فل ڈگری کے لیے تحقیقی و تنقیدی مقالہ تیار کرنا چاہئے۔ ان کے ارشادات کی روشنی میں 'پریم چند کا ہندی افسانوی ادب: اُن کے اردو افسانوی ادب سے تقابلی مطالعہ' موضوع پر ہندی میں الہ آباد یونی ورسٹی کی ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے داخلہ کی درخواست دے دی گئی حسنِ اتفاق سے اس کام کے نگراں کی حیثیت سے مشہور و معروف ماہر لسانیات ڈاکٹر ہردیو باہری کا تقرر ہوا جن کی شفقت مجھے ہمیشہ حاصل رہی ہے۔ اس مقالے میں اگر کوئی خصوصیت پیدا

ہوئی ہے، تو ان کی گراں قدر رہنمائی کا فیض ہے۔ ڈاکٹر باہری ملک کے اُن معدودے چند ماہرین زبان وادب میں ہیں جن کی ہندی اور اردو زبانوں کی روایات و مسائل پر گہری نظر ہے اور ان دونوں زبانوں پر عالمانہ دسترس رکھتے ہیں۔

یہ میری بدنصیبی تھی کہ متذکرہ بالا موضوع پر رسمی طور پر داخلہ لینے کے بعد میری خانگی زندگی میں مسلسل کئی برسوں تک ایسے روح فرسا حادثات ہوتے رہے، جنھوں نے مجھے انتہائی متاثر کیا۔ اس سلسلے کا سب سے الم ناک سانحہ میرے اکلوتے بیٹے کی اچانک موت ہے جس نے میری تندرستی عزم اور زندگی سب کچھ چھین لی۔ اسی درمیان یونی ورسٹی کی زندگی میں بھی ایسے حالات پیدا ہوتے لگے جن میں پڑھنے لکھنے کا سوال ہی نہیں رہ گیا۔ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو استاد محترم پروفیسر سید احتشام حسین کی رحلت سے شعبۂ اردو میں پڑھنے لکھنے کی روایت ٹوٹنے اور بکھرنے لگی — پھر ۸ ر فروری ۱۹۷۵ء کو استاد محترم ڈاکٹر مسیح الزماں کے اچانک سانحۂ ارتحال نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔ اس زمانے کو میں اپنی زندگی کا دورِ ابتلا کہتا ہوں۔ ان دنوں الہ آباد یونی ورسٹی کا شعبہ اردو کیا تھا عہد مغلیہ کے زمانہ آخر کی دلی تھی جس پر کبھی نادر شاہ کے حملے ہوتے اور کبھی احمد شاہ۔ مکر و فریب، منافقت و ریاکاری اور سازشوں کے جال پھیلے ہوئے تھے جن میں گرفتار ہونے پر تباہی سے بچنا ناممکن تھا۔ کمین گاہوں سے تیر بھی برستے تھے اور آستینوں سے ڈسا بھی جاتا تھا۔ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اپنے دفاع کے لیے سرگرم عمل ہونا پڑا جس کا انجام یونی ورسٹی انتظامیہ کی قربت حاصل کرنا اور ان کا معاون بننا ہے۔ اس طرح کے فرائض کی انجام دہی کا جن صاحبان کو تجربہ ہے وہ میری تائید کریں گے کہ یونی ورسٹی انتظامیہ میں شمولیت اور دیگر 'غیر ادبی' کاموں کا نتیجہ پڑھنے لکھنے والوں کے لیے سم قاتل ہوتا ہے۔ انجام ظاہر ہے۔ قلم سے ٹینک شکن میزائل کا کام لینا پڑا ——!

برادر گرامی ڈاکٹر گیان چند کی آمد سے حالات بدلے ہیں اور شعبۂ اُردو میں علمی ماحول دوبارہ پیدا ہوا ہے لیکن اتنا کچھ بگڑ چکا ہے کہ اس کے بننے میں وقت لگے گا۔ ان حالات میں قلم نے دوبارہ قدیم راہوں کی طرف دیکھا۔ اسے خونِ دل میں ڈبویا تو محسوس ہوا کہ اب نہ وہ عزم ہے اور نہ جسمانی و ذہنی قوت۔ دلِ شورش دروں سے مثل چراغ جلتا ہے، لامتناہی تھکن نے چور کر رکھا ہے، وہ چاند ڈوب گئے ہیں جن کی علمی ضیا باریاں تاریکیوں میں بھی راہیں دکھاتی تھیں! اس حوصلہ شکن پس منظر کے باوجود بعض احباب، اعزا، مخلصین اور رفیقانِ سفر نے تسلّی و تشفی کی منزلوں سے گذارا۔ آخر میری یاس شکستگی کام آئی! ماہ و سال کی اس گردش سے

اتنا فائدہ ہوا کہ اس درمیان کوچہ گردی اور صحرا نوردی کے بجائے کتب خانوں کی خاک چھانتا رہا۔ آج اسی خاک نے اس مقالے کو پاک کیا ہے۔!

زیر نظر مقالے میں پریم چند کے اُردو اور ہندی افسانوی ادب کا تقابلی مطالعہ مقصود رہا ہے۔ ان کے تمام ناولوں اور کہانیوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ڈراموں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کیوں کہ انھیں افسانوی ادب میں شامل کرنا مناسب نہ تھا۔ اسی طرح پریم چند کے دیگر زبانوں سے ترجموں کو بھی جگہ نہیں دی گئی ہے کیونکہ ان میں پریم چند تخلیق کار نہیں، صرف مترجم ہیں۔

یہ تحقیقی مقالہ 'پریم چند: کہانی کا رہنما' کی توسیع ہے۔ اس کے بعض حصے متذکرہ بالا کتاب سے ناگزیر طور پر یکساں نظر آئے اس لیے میں نے ان کو دوبارہ لکھنے کے بجائے اسی سے لے لیا ہے۔ ارادہ ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں کچھ حصے 'پریم چند کہانی کا رہنما' سے حذف کر دیے جائیں گے۔ موجودہ صورت میں زیر نظر مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو ابواب میں ان مسائل پر غور کیا گیا ہے جن سے پریم چند کی تخلیقات متاثر ہوتی ہیں اور باقی تین ابواب میں پریم چند کے تخلیقی ادوار کی تقسیم اور ان کی اردو، ہندی تخلیقات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

اس تحقیقی مقالے میں ہندی اقتباسات ترجمہ کرنے کے بجائے من و عن اردو رسم خط میں لکھ دیے گئے ہیں۔ ان سے ایک طرف پریم چند کی اردو اور ہندی عبارتوں کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے، دوسری طرف اردو اور ہندی کے لسانی اختلافات کے تجربے میں سہولت ہوگی کہ اردو اور ہندی بولیاں ہیں یا دو مختلف زبانیں! نقل لفظ کرنے میں اُردو صوتیات کو اوّلیت دی گئی ہے۔

اس مقالے کی تیاری میں برادر محترم امرت رائے کا تعاون حاصل رہا۔ استاذی ڈاکٹر سید محمد عقیل کی شفقتوں، گراں قدر مشوروں اور تسلی و تشفی سے نامساعد حالات میں روشنی ملتی رہی۔ برادرم ڈاکٹر سید مجاور حسین نے قوت عمل کو مہمیز کیا، کئی مفید و اہم مشورے دیئے اور میری بے راہ روی پر تنبیہہ و تادیب کی۔ میرے شاگردوں میں خصوصیت سے بزرگ شاگرد برادرم سید علی حیدر، عزیزی حامد ندیم اور عزیزی سعید عارفی نے کئی منزلوں پر مدد کی۔ میری دعا ہے کہ انھیں بھی ویسے ہی شاگرد ملیں اور انھوں نے جو سلوک و برتاؤ میرے ساتھ کیا ہے، وہی ان کے ساتھ بھی ہو! اعتراف و تشکر و امتنان کی

فضا میں ایک شخصیت کی یاد بے اختیار آتی ہے، جو عالم آب وگل سے کنارہ کشی کے باوجود میرے لیے شمع ہدایت بھی ہے اور مشعل راہ بھی! اسی یاد کے سہارے یہ حقیر پیش کش ان کے نام معنون کی گئی ہے۔

صاحبو! یہ تحقیقی مقالہ میرے دس برسوں کے مسلسل عزم کا نتیجہ ہے۔ یہ مقالہ ہندی کی ڈگری کے لیے لکھا گیا تھا لیکن زیر نظر کتاب اس کا لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ ان میں فکر و تحقیق یکساں ہے لیکن ان کی پیش کش میں شدید اختلاف ہے۔ اس طرح یہ کتاب اس سے علاحدہ حیثیت رکھتی ہے۔ آخر میں ایک دلچسپ حقیقت کا اظہار کرنا مناسب ہوگا کہ میں نے رسمی طور پر ہندی کا مطالعہ کسی درجے میں نہیں کیا ہے بلکہ خودرَو درخت کی طرح اپنے آپ میں اگا اور بڑھا ہوں! میری گذارش ہے کہ آپ اسے ہندی سے الگ کتاب کی حیثیت عطا کریں، اسی بنا پر اس کا نام مقالے سے مختلف رکھا گیا ہے جو استاذی عقیل صاحب کا عطیہ ہے۔ نام کے ساتھ مقالے کا عنوان بھی درج ہے، تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔ اس کے لیے کوئی تاویل یا عذر نہیں ہے۔ جو کچھ ہو سکا ہے۔ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہے۔

ط ط ط

باب ۱
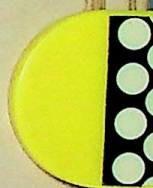
اردو بنام ہندی

اُردو بنام ہندی

پریم چند کے متعلق پنڈت برج رتن داس کا بیان ہے کہ وہ برج یا اودھی سرمایے کو ہندی کا ادب نہیں قرار دیتے تھے موصوف لکھتے ہیں: "ہمیں یہ ٹھیک یاد ہے کہ سورگیہ بھگوان داس جی کے کاشی کے ساہتیہ ودیالیہ میں ایک وارشک ادھیویشن میں سورگیہ پریم چند نے کہا تھا کہ ہندی میں پراچین ساہتیہ ہے ہی کہاں برج بھاشا، اودھی کا ساہتیہ ہے، ہندی کا ساہتیہ نہیں ہے"[۱] اس سے واضح ہے کہ پریم چند کے نزدیک ہندی کی لسانی روایتیں کھڑی بولی تک محدود تھیں جو ادبی معیاروں پر قدیم رنگ و آہنگ نہیں رکھتیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کھڑی بولی کی بنیادوں پر موجودہ ہندی اور اردو نے شاندار محل تیار کیا ہے لیکن پریم چند نے کسی موقع پر اردو کے متعلق اس طرح کے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ ہندی کے برعکس اردو زبان و ادب کے مستقل وجود کے قائل تھے۔ واضح ہے کہ انھوں نے ہندی سے برج اودھی وغیرہ کو جدا کیا تو ان کے پیش نظر اردو سے ہندی کے لسانی اختلافات ختم کرنا اور ان کے مشترک ورثے کو مستقبل کے ہندوستان کے سپرد کرنا تھا۔ اس دور کے اہم ترین سیاسی رہنما بھی پریم چند کی طرح لسانی مسئلے کو اس نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر لیا جائے۔

۱۔ برج رتن داس: کھڑی بولی ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۱۹۱

لسانی پس منظر :

لسانیات کو عہد حاضر میں علمی وقار ملا ہے۔ اس کے واقف کار کم ہیں۔ حالانکہ ہندوستانی اور یونانی علما نے قبل مسیح بھی اپنی اپنی زبانوں کے مختلف مسائل پر غور کیا تھا لیکن اس وقت اسے کسی علم کی شکل میں قبول نہیں کیا گیا تھا۔ زبانوں کی یکسانیت کے بارے میں پہلی بار عیسائی مشنریوں نے توجہ کی۔ اس کے بعد سر ولیم جونس[۵۱] کی کوششوں سے تقابلی لسانیات کی بنیاد پڑی۔ ولیم جونس ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بنگال میں جج تھے۔ انھوں نے سنسکرت، لاطینی، یونانی اور قدیم جرمن زبانوں کا عالمانہ مطالعہ کیا تھا۔ انھیں نے سب سے پہلے ۱۸۸۶ء میں سنسکرت، یونانی اور لاطینی زبانوں کی لسانی بنیادوں پر غور کر کے انھیں مشترک مخرج کی زبان قرار دیا لیکن عرصے تک ہندوستان کی زبانوں میں تنہا سنسکرت لائق اعتنا سمجھی گئی۔ ہندوستانی ماہرین قواعد نے پالی یا پراکرتوں کی طرف توجہ کرنے کی زحمت نہ کی۔ یہ سعادت بھی غیر ملکی علما کے حصے میں آئی جن میں چارلس وکنس، میکس مُلر اور پرنسپ کو خصوصیت حاصل ہے ان کی کوششوں کی بدولت ہندوستانی ادب و فلسفہ کے لیے ہمدردانہ جذبہ پیدا ہوا[۵۲] جدید ہندوستانی آریائی زبانوں کے مطالعے کی ابتدا کرنے والے بھی بعض یورپی علما تھے۔ بعض عیسائی مشنریاں اور بعض سرکاری ملازمین اور افسر۔ جان بیمس، ٹی ٹرمپ، ایس۔ ایچ کیلاگ اور ڈاکٹر روڈولف ہارن لی نے پیش قدمی کی۔ اس ضمن میں سر جارج گریرسن کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، جنھوں نے نہ صرف قواعد اور لغت تیار کی بلکہ مختلف ہندوستانی زبانوں کا جائزہ لے کر، اس دور کی ہندوستانی زبانوں کے متعلق معلومات کا عظیم ذخیرہ یکجا کر دیا۔ انھوں نے ہندوستان کو زبانوں کا عجائب گھر کہا جس میں ۱۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں مروج ہیں[۵۳] یہاں چند 'خاص زبانوں' اور بولیوں کا مطالعہ پیش کرنا بھی طول امل ہے۔

آریائی زبانوں کا سائنسی مطالعہ پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر سر رام کرشن گوپال بھنڈارکر

---

۵۱ سید احتشام حسین : ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص۱۰

۵۲ محمد صادق : اے ہسٹری آف اردو لٹریچر ص ۲۱۹

۵۳ جے۔ اے گریرسن : لنگوئسٹک سروے آف انڈیا، جلد ۱، حصہ ۱ ص ۱۳۶

پہلے ہندوستانی عالم تھے۔ انھوں نے ۱۸۷۷ء میں بمبئی یونی ورسٹی میں ہندوستانی آریائی زبانوں کے ارتقا پر سات خطبے پیش کیے اور سنسکرت، پالی، پراکرت، اپ بھرنش کی تقابلی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی ساتھ جدید آریائی زبانوں میں مستعمل عناصر کا جائزہ لیا۔ آخری خطبے میں انھوں نے قدیم متوسط اور جدید آریائی زبانوں کے رشتے متعین کیے۔

ان کی تیار کردہ بنیادوں پر اس صدی کے اواخر میں زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ اب سنسکرت، پالی، پراکرت، اپ بھرنش پر آزادانہ تحقیق ہو چکی ہے اور جدید زبانوں سے ان کے رشتے واضح کیے جا چکے ہیں۔ عموماً علما نے ہندوستانی آریائی زبانوں کو صوتیات اور لسانی بنیادوں پر تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور، ہندوستان میں آریوں کی آمد سے شروع ہو کر بدھ مذہب کی ابتدا تک ہے۔ دوسرا دور، بدھ مذہب کے زوال اور ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد پر ختم ہوتا ہے۔ تیسرا دور، ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر ملکیوں کی حکومت سے شروع ہو کر عصر حاضر تک ہے۔ یہاں یہ واضح رہنا چاہیے کہ لسانی تبدیلیوں کے لیے مقررہ تاریخ یا سال نہیں دیا جا سکتا۔ ان کا دائرہ اثر کئی کئی برس آگے پیچھے رہتا ہے۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹر جی کے خیال میں ادوار کی تقسیم مندرجہ ذیل طور پر کی جا سکتی ہے:

۱۔ قدیم ہند آریائی زبان۔ آریوں کی آمد سے لے کر تقریباً ۶۰۰ ق م ۔ تقریباً ۹۰۰ برس

۲۔ متوسط ہند آریائی زبان۔ ۶۰۰ ق م سے ۱۰۰۰ء تک = تقریباً ۱۶۰۰ برس

۳۔ جدید ہند آریائی زبان۔ ۱۰۰۰ء سے عصر حاضر تک = تقریباً ۹۵۰ برس

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ادوار کی تقسیم کو ویدک سنسکرت، پراکرت اور بھاشا کا زمانہ قرار دیا ہے۔[۱] ڈاکٹر ہردیو باہری بھی ڈاکٹر چیٹر جی کے خیالات سے تقریباً متفق ہیں اور انھیں دورِ قدیم، دور متوسط اور دور جدید قرار دینا زیادہ مناسب قرار دیتے ہیں۔ علاوہ بریں ڈاکٹر باہری نے ۲۴۰۰ ق۔م بلکہ اس کے بھی قبل سے عصر حاضر تک کی زبان کو 'ہندی' قرار دیا ہے ان کا قول ملاحظہ ہو: "اس بھاشا کے اتہاس کا یہ دُربھاگیہ ہے کہ یگ یگ میں اس کا نام پری ورتت ہوتا رہا ہے۔ کبھی ویدک، کبھی سنسکرت، کبھی پراکرت، کبھی اپ بھرنش اور اب ہندی تمل، روسی، چینی، جرمن سبھی پری ورتت ہو گئی ہیں۔ لوگوں نے ان کے پراچین، مدھ کالین

---

[۱] محی الدین قادری زور: ہندوستانی لسانیات ص ۳۰

اور آدھنک روپ بھید تو بتائے کنتو ان کا نام نہیں بدلا۔ بھارت میں پرتیک یگ کی بھاشا کا نیا نام رکھا جاتا ہے"[۵۱] ہمارے خیال میں جدید زبان کے نام پر قدیم زبان کا نام رکھنا مناسب نہیں۔ اگر اس زبان کی قدیم روایتوں کی بنیاد پر وسیع تر نام عطا کرنا ہے تو ویدک یا برہمہ بھاشا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نہ کہ 'ہندی'، جو لفظ ہی گیارہویں صدی عیسوی میں البیرونی نے سب سے پہلے استعمال کیا[۵۲]

ادبی زبان اور علاقوں کی بولیوں کے درمیان زمانہ قدیم سے فرق محسوس کیا جاتا رہا ہے، جس کے مثبت شواہد کے لیے ویدکا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ گریرسن کا قول ہے کہ ابتدا میں دو طرح کے آریہ تھے۔ داخلی اور خارجی۔ متعدد علما نے ویدک زمانہ کے دونوں طرح کے آریوں کی زبانوں میں امتیاز کیا ہے۔ سنسکرت اپنی فضیلت کے دور میں تعلیم یافتہ طبقہ، رشیوں، گیانیوں اور راجاؤں کی زبان تھی۔ دیگر پراکرتیں معیاری زبان نہ بن سکیں لیکن عوامی زندگی کا جزو ضرور رہیں۔ سنسکرت ناٹکوں میں راجا، منتری اور گیانی سنسکرت بولتے ہیں لیکن عورتیں اور عوام پراکرت بولتے ہیں۔ اس میں طبقاتی نظام کے قاعدوں نے مزید شدت پیدا کردی جس میں برہمنوں کی زبان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ نتیجہ میں برہمنیت کے زوال پر پالی اور پراکرتوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ یہاں مہاتما بدھ کے دور رس فیصلے کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، جس نے ملکی لسانی مسئلہ میں انقلابی کیفیت پیدا کردی۔ واقعہ یوں ہے کہ جب مہاتما بدھ نے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی اور بدھ دھرم کی وسعت و فراخ دلی نے عوام کو اپنی طرف متوجہ کیا تو متعدد علما و حکما بھی مہاتما بدھ کے مقلد و ہم نوا ہوگئے جو نہ صرف ویدک مذہب، زبان اور تہذیب کے واقف کار تھے بلکہ ان میں بلند پایہ مقام رکھتے تھے انھوں نے مہاتما بدھ سے خواہش ظاہر کی کہ اگر ان کی اجازت ہو تو ان کے ارشادات "مہذب اور پاکیزہ زبان" یا سنسکرت میں قلمبند کرلیے جائیں لیکن مہاتما بدھ نے مسترد کردیا۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کہتے ہیں کہ! لیکن بدھ نے اسے نامنظور کردیا اور عام انسانوں کی سبھی بولیوں ہی کو

---

۵۱ ہردیو باہری: ہندی اُدبھو وکاس اور روپ ص۱۶

۵۲ محمود شیرانی: پنجاب میں اردو ص۱۲

اپنے اظہار کا ذریعہ قرار دیا۔ ان کا یہ قول رہا کہ عوام ان کے ارشادات کو اپنی مادری زبان میں ہی قبول کریں (سکائے نروتیا)۔ اس سے ان بولیوں کے ادبی استعمال کو عمومی قبولیت حاصل ہوگئی۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ جذبہ کی آزادی کے لیے انقلابی تحریک تھی جس کی اہمیت اس وقت پوری طرح سے نہ سمجھی جا سکی اور نہ اس سے فائدہ اٹھایا جا سکا۔"[۵۱]

مہاتما بدھ کے اس انقلابی اعلان سے برہمنیت کو گہرا صدمہ پہنچا اور پالی اور پراکرت کی غیر معمولی طور پر ہمت افزائی ہوئی۔ دور متوسط کی آریائی زبان اسی زمانے (۵ ویں صدی ق۔م) سے شروع ہوتی ہے اور ۱۰ ویں، ۱۱ ویں صدی عیسوی تک برقرار رہتی ہے، اس دور کی پراکرتوں کی تین کیفیتوں کا ذکر ڈاکٹر ہردیو باہری نے کیا ہے جو درج ذیل ہیں:[۵۲]

۱۔ ۵۰۰ ق۔م سے پہلی صدی تک۔ پالی

۲۔ دوسری صدی سے چھٹویں صدی تک۔ ادبی پراکرتیں

۳۔ چھٹویں صدی سے گیارہویں صدی تک ـــ اپ بھرنشیں

قدیم آریائی زبان اور جدید لسانی تسلسل کو سمجھنے میں پالی سے خصوصی مدد مل سکتی ہے جو سنسکرت صوتیات عوامی تلفظ، قواعدی اختلافات وغیرہ کا دلچسپ مطالعہ پیش کرتی ہے۔ پاٹلی پتر کی حکومت نے خاص طور پر پالی کی ہمت افزائی کی۔ سمراٹ اشوک نے کتبوں، میناروں اور دیواروں پر پالی میں مذہبی اور حکومتی احکامات کندہ کرائے، جس سے یہ زبان دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں: "اشوک کے زمانے میں زیادہ سے

---

[۵۱] سنیتی کمار چٹرجی: انڈو آرین اینڈ ہندی ص ۶۴:

But Buddha refused and gave his charter to all languages of man : he recommended that man should study his own language (Sakaya-Niruthiya). This gave a great impetus to the literary employment of the spoken languages and it was indeed a movement of revolutionary character for the freedom of spirit, the full implication of which was not wholly grasped nor taken advantage of all the time."

[۵۲] ہردیو باہری: ہندی اُدبھو وکاس اور روپ ص ۲۵

چار اور کم سے کم دو زبانیں رائج تھیں۔ ایک مشرقی، دوسری مغربی۔ مغربی زبان پر جیسا کہ شہباز گڑھی کی لاٹ سے ثابت ہے، سنسکرت کا اثر گہرا تھا۔ وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مشرقی زبانوں کی بہ نسبت قدیم آریائی زبان سے زیادہ قریب تھی۔۔۔ دونوں کی اپنی اپنی لسانی خصوصیات ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔" [۵۱]

دورِ متوسط میں آریائی زبان کے ارتقا کی دوسری منزل پراکرتیں تھیں۔ 'پراکرت' کے دو معنی ہیں: عوامی زبان یا اصل سے پیدا شدہ یعنی سنسکرت کی بیٹی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پراکرتیں ویدک زبان کے قبل یا کم از کم اس کے مساوی طور پر موجود تھیں۔ بھرت مُنی نے 'ناٹیہ شاستر' میں سات پراکرتوں کا ذکر کیا ہے۔ شورسینی، ماگدھی، اردھ ماگدھی، دکھشاتیہ، بالیہ ہی کی، آونتی اور پراچیہ۔ ان میں ہر ایک پراکرت کو ادبی وقار حاصل نہ ہو سکا۔ شورسینی متھرا اور اس کے قرب و جوار کی زبان تھی، یہی پچھمی ہندی بولیوں کی جننی کہی جاتی ہے۔ اس کی ادبی اہمیت کے بیان میں اتنا کہنا کافی ہوگا کہ یہی سنسکرت ناٹکوں میں نثر کی زبان ہے۔ دگمبر جین کا زیادہ تر مذہبی ادب شورسینی میں ہے۔ یہی زبان ایک زمانے میں شمالی ہند کی قومی زبان سمجھی جاتی تھی۔ ماگدھی، مشرقی علاقے اور مگدھ کی، اردھ ماگدھی کاشی کے علاقوں اور اودھ کی اور اس دور کے مہاراشٹر کی پراکرت بتائی جاتی ہے۔ بعض علما کے نزدیک مہاراشٹری الگ پراکرت نہیں ہے بلکہ شورسینی کا ایک روپ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ماگدھی، اردھ ماگدھی اور مہاراشٹری نے پچھمی ہندی کی شکلوں کے تعین میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان پراکرتوں اور سنسکرت کے تقابلی مطالعے میں اپ بھرنشوں کی بنیاد سے متعدد لسانی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ اپ بھرنشوں کو عوام کی زبان کہہ سکتے ہیں جس کے ابتدائی نقوش آٹھویں صدی ق م سے ملتے ہیں۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹر جی نے اپ بھرنشوں کو آریائی زبان کے ارتقار کی ایک منزل قرار دیا ہے۔ [۵۲] ان کا خیال ہے کہ چھٹویں سے گیارہویں صدی تک تمام پراکرتوں کے مخصوص اپ بھرنش روپ بھی رہے ہوں گے۔ مثلاً شورسینی پراکرت کے بعد شورسینی اپ بھرنش، مہاراشٹری پراکرت کے بعد مہاراشٹری اپ بھرنش وغیرہ اسی طرح مشہور و معروف مورخ ڈاکٹر تارا چند

---

[۵۱] مسعود حسین خاں: مقدمہ تاریخ زبان اردو ۳۶

[۵۲] سنتی کمار چٹر جی: انڈو آرین اینڈ ہندی، ۱۰۵

نے بعض اپ بھرنشوں کا ذکر کیا ہے اور انھیں پوربی اور پچھمی اپ بھرنشوں کے نام سے یاد کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر ہردیو باہری نے اس تصور کو گمراہ کن اور غیر حقیقی قرار دیا ہے۔[۵۲] ان کے خیال میں پراکرتوں کی طرح اپ بھرنش بھی مختلف علاقوں کی بولی تھی جس کے تین روپ تھے۔ ناگر اُپ ناگر اور براچڈ۔ ناگر گجرات کی، اُپ ناگر راجستھان کی اور براچڈ سندھ کی بولی تھی۔ جے ابھیر، گوجر، وغیرہ قومیں بولتی تھیں۔ ڈاکٹر باہری نے پچھمی ہندی کے ارتقا میں اپ بھرنش کو شامل کرنے کے تصور کو مبالغہ آمیز قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو آثار اپ بھرنش کے بیان کیے جاتے ہیں، وہی اپ بھرنش کے بجائے شورسینی اور اور مہاراشٹری کے آثار ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اپ بھرنش عوامی بولیاں تھیں جنھیں بعد میں بدھی سادھوؤں اور گیانیوں نے اپنی تخلیقات میں اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اپ بھرنشوں میں سنسکرت کے خالص الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

جدید آریائی زبان کی تقسیم میں ڈاکٹر ہارن لی کے نظریے کو خصوصی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ ان کے خیال میں مدھیہ دیش یا داخلی آریوں کی ایک زبان تھی ان کے قرب و جوار کے آریوں کی زبان مختلف تھی۔ اسی تصور کو ڈاکٹر جارج گریرسن نے داخلی اور خارجی زبانوں کی بنیادوں پر مختلف دلیلوں کی روشنی میں تقویت دی ہے[۵۳]۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے اس تقسیم کو غیر سائنسی ثابت کیا ہے کیوں کہ جو عناصر داخلی زبان میں نظر آتے ہیں، وہی خارجی زبان میں موجود ہیں۔ لہذا ان عناصر کو بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔[۵۴] ڈاکٹر چٹرجی نے انھیں چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن ان میں بعض معمولی تبدیلیوں کے علاوہ کوئی بنیادی خصوصیت نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں ڈاکٹر ہردیو باہری کا پیش کردہ خاکہ زیادہ فطری، سائنسی اور عام فہم ہے جو آئندہ صفحے پر درج کیا جاتا ہے[۵۵]

---

[۵۱] تاراچند: دی پرابلم آف ہندوستانی، ص۲۳

[۵۲] ہردیو باہری: ہندی ادبھو و کاس اور روپ، ص۷۱

[۵۳] جی۔ اے۔ گریرسن۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا، جلد ۱، حصہ ۱، ص۱۳۰

[۵۴] سنیتی کمار چٹرجی: دی انڈو آرین اینڈ ہندی، ص۲۲۵

[۵۵] ہردیو باہری: ہندی ادبھو و کاس اور روپ، ص۴۵
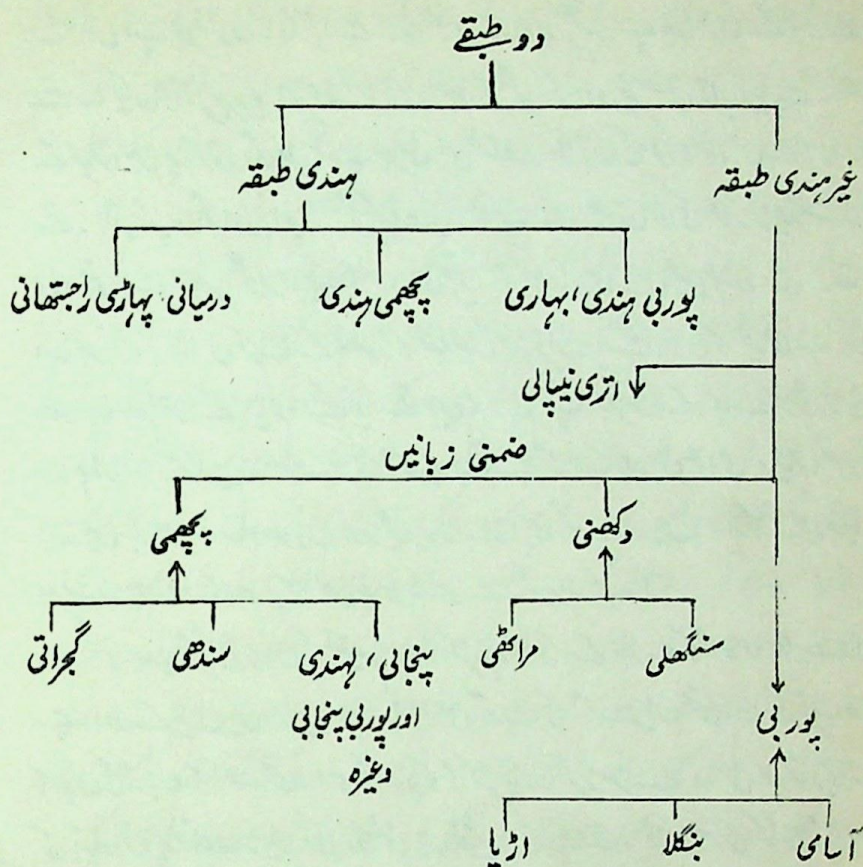
ان بولیوں اور زبانوں میں بعض میں اعلا درجے کا ادبی سرمایہ پیش کیا گیا ہے بعض محض بولیاں ہی رہیں۔ ان کا تفصیلی مطالعہ لسانی تحقیق کا موضوع ہو سکتا ہے لیکن یہاں موقع نہیں۔ سر دست اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ یہاں خصوصیات کی بنیاد پر زبانوں کے نام پڑے ہیں مثلاً سنسکرت، پالی، اپ بھرنش، ریختہ وغیرہ [۱] موجودہ صورت میں کھڑی بولی کا علاقہ میرٹھ بجنور رہے جو ہندی اردو کا بنیادی علاقہ ہے۔ [۲] یہی عوامی زبان کی شکل میں کوروی اور ادبی حیثیت سے اردو یا ہندی کہلاتی ہے۔ [۳] پروفیسر سید احتشام حسین نے

---

[۱] شتی کنٹھ مشر: کھڑی بولی کا آندولن ص ۲

[۲] دھریندر ورما: گرامین ہندی، ص ۱۸

[۳] ستیا گپتا: کھڑی بولی کا لوک ساہتیہ ص ۱۶

جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کا ہندی اور اردو سے رشتہ بیان کرتے ہوئے دلچسپ تجزیہ پیش کیا ہے۔[۱] ان کا خیال ہے کہ پچھمی پنجابی، پچھمی ہندوی یا لہندی کو ادبی وقار حاصل نہیں ہے، اب اس کی جگہ ہندی اور اردو نے حاصل کر لی ہے۔ حالانکہ سندھی کو ۱۵ ویں صدی کے قریب صوفیوں اور فقیروں نے ادبی بلندیاں عطا کی تھیں لیکن اس کے پاس اہم ادبی کارنامہ نہیں ہے۔ مراٹھی میں ۱۳ ویں صدی سے ادبی تخلیقات کا سلسلہ ملتا ہے۔ نام دیو اور گیان دیو نے اپنی مراٹھی شاعری کے ذریعے 'ویشنو آندولن' کو ترقی دی۔ ۱۶ ویں ۱۷ ویں صدی کے شری دھر اور تکا رام کو عصر حاضر میں بھی مراٹھی ادب میں اہم مقام حاصل ہے۔ مراٹھی ادب دور جدید میں ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اُڑیا میں ۱۵ ویں صدی سے ادب ملتا ہے۔ یہ ترقی یافتہ ادبی سرمایہ رکھتی ہے۔ اس پر سنسکرت ادبیات کے خصوصی اثرات ہیں۔ بنگلا کو جدید ہندوستان میں خصوصی اہمیت حاصل ہے اس کے ادب میں 'کرشن بھکتی آندولن' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جو مہا تما چیتنیہ کی سرپرستی میں آگے بڑھا۔ اس پر بنگلا اور پہاڑی بولیوں کے اثرات ہیں۔ بہاری بولیاں قدیم ہیں۔ ان پر ہندی کے گہرے اثرات ہیں۔ کہیں کہیں بنگلا کے اثرات بھی دکھائی پڑتے ہیں۔

پوربی ہندی بولیاں اردھ ماگدھی سے اپنا رشتہ قائم کرتی ہیں جس کو جون پور کے شرقی بادشاہوں کے دور میں خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۵ ویں اور ۱۶ ویں صدی میں پوربی ہندی بولیوں کی اہم ترین بولی اودھی نے خاص طور پر ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اس میں ایسے گراں مایہ ادبی کارنامے پیش کیے گئے جو عصر حاضر میں بھی سرمۂ دیدۂ بینا بنے ہوئے ہیں۔ تلسی، جائسی، کبیر اور قطبن کی تخلیقات غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ اودھی نے ادبی تخلیقات کی نظر سے اپنی جگہ ہندی اور اردو کے لیے خالی کر دی ہے۔ اب وہ محض بولی کی شکل میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہندی اردو زبان کے لیے پوربی ہندی گروہ کی بولیاں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ حالاں کہ برج بھاشا، کھڑی بولی، بانگرو اور قنوجی بھی لسانی اہمیت کی مالک ہیں لیکن عام طور پر بانگرو اور کھڑی بولی محض اردو ہندی کی بنا پر قابل توجہ ہیں۔ قنوجی اور بندیلی میں ترقی یافتہ سرمایہ نہیں ہے۔ برج بھاشا کے ابتدائی دور کے بارے میں یقینی طور پر کہنا دشوار ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ۱۵ ویں ۱۶ ویں صدی میں کرشن بھکتی آندولن کے ذریعہ برج بھاشا کی رسائی ملک کے کونے کونے تک ہوگئی تھی۔ سور، میرا، خان خاناں،

---
[۱] سید احتشام حسین: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۵۳

رسکھان وغیرہ کو برج بھاشائی ادب میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اب برج کی جگہ ہندی اور اردو نے حاصل کرلی ہے۔ پنجابی یا پوربی پنجابی کو، جو شورسینی اپ بھرنش کی ایک تشکل ہے، صوفی فقیروں اور مہاتما گرونانک کی تخلیقات نے ممتاز کیا۔ موجودہ دور میں اسے دوبارہ ابھرنے کا موقع مل رہا ہے۔ راجستھانی مختلف بولیوں کا مجموعہ ہے۔ اسے جدید ہند آریائی زبانوں کے ابتدائی دور سے اہمیت حاصل رہی ہے، جو اپنے رزمیوں کی بنا پر معروف و مقبول رہی ہے۔ عصر حاضر میں راجستھانی دوبارہ ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہے۔ راجستھانی کی قریبی زبان گجراتی ہے۔ اسے نرسنگھ مہتا نے ادبی وقار عطا کیا ہے۔ اس میں مسلم اثرات کی بنا پر ۱۶ویں ۱۷ویں صدی سے عربی فارسی اور کھڑی بولی کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ گجراتی کو جدید ہندوستان میں خصوصی اہمیت دی جاسکتی ہے

متذکرہ بالا تجزیے سے واضح ہوجاتا ہے کہ پریم چند کے دور تک لسانی نقطۂ نظر سے مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، سندھی اور گجراتی کے علاوہ سبھی زبانوں اور بولیوں نے ہندی اور اردو کے لیے جگہ خالی کردی تھی۔ لیکن پریم چند نے برج اور اودھی کی روایتوں کو سائنسی تجزیے کے بجائے مصالحت پسندی کی بنا پر موجودہ ہندی سے جدا کیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے ان کا خیال غلط نہ تھا۔ عصر حاضر میں مختلف و متعدد زبانوں اور بولیوں کی طرح برج اور اودھی نے اردو ہندی کے لیے جگہ خالی کردی ہے۔ اس ضمن میں جان بیمس کے خیالات اہم ہیں کہ "ہندی کو دیگر ہندوستانی زبانوں پر اس بنا پر بھی اولیت حاصل ہے کہ اس میں خالص سنسکرت الفاظ (تتسم) کے بجائے اُن سے ماخوذ الفاظ (تدبھو) یا پھر اس میں انھوں نے انتہائی مروج شکل اختیار کرلی ہے۔ جس میں فارسی اور عربی کے حسین و لطیف الفاظ شامل کرلیے گئے ہیں، جسے کبھی اردو کہا جاتا ہے اور کبھی ہندوستانی"۔ [۱]

اردو ہندی زبانوں کی ابتدا یا نشوونما کے بارے میں غور کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں مسلمان محض حکمراں نہیں تھے۔ وہ ہندوستانی زندگی میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ یہاں کی زندگی، روایات و عقائد، رسم و رواج سب میں شامل تھے۔ اس لیے جب حملوں اور جنگوں کی گرم بازاری ختم ہوئی تو دلوں سے محبت و اخوت

---

[۱] جان بیمس: کمپریٹیو گرامر ص ۳۲

کے سرچشمے ابل پڑے۔ جس کے اثرات فنون لطیفہ کے مختلف شعبوں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں: "مغلوں کے زمانے میں موسیقی، مصوری اور فن تعمیر ہندو مسلمانوں کے اختلاط و اتحاد کا مظہر بن گئے اور ان کی بدولت 'ہندو مسلم' آرٹ کی روائتیں وجود میں آسکیں"۔[۵۱] یہ عرض کرنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو شعر و ادب پر مخلوط تہذیبی و تمدنی اثرات ملک کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں زیادہ وسعت اور ہمہ گیری کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں: "اس زبان نے برعظیم کی ساری جدید آریائی زبانوں کی ان خصوصیات کو اپنا لیا، جن میں ملک گیر سطح پر تصرف میں آنے کی صلاحیت موجود تھی"۔[۵۲] اس کا سبب یہ ہے کہ اردو کے خمیر میں ابتدا سے باہمی خلوص، یک جہتی اور ہم آہنگی کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اردو قدیم داستانوں، قصوں، مثنویوں اور مرثیوں پر نظر ڈالی جائے تو حیرت انگیز طور پر ہندو مسلم تصورات اور زندگی میں یگانگت اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے،[۵۳] جو اردو کے ادبی و لسانی رویے کی خصوصیت ہے یہی رویہ مصوری تعمیرات اور دستکاری میں نادر مثالیں پیش کرتا ہے اور فن موسیقی کے نئے پہلو پیدا کرتا ہے۔ لفظوں اور ترکیبوں میں دل چسپ ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ الفاظ کی ساخت میں اردو کی وسیع النظری نے دل چسپ ترکیبیں وضع کرائیں، جن میں عربی و فارسی یا سنسکرت قواعد کی پابندی غیر ضروری ہوگئی، مثلاً —— چینخنا۔ تنکنا۔ فرمانا۔ قبولنا، شرمانا، خریدنا، گذرنا۔ بے کل بے کہا، بے کھٹک، بے گھر، بے ڈول، بے جوڑ، بے دھڑک، بے ٹھکانہ، بے ڈھب، بے ڈھنگا، بے ٹوک، بے منھ، نوچندی، ناسمجھ، اکلوتا، اکہرا، تراہا، چوراہا، چوپایہ، چوکھمبا، چوگرد، چوگنا، چوگوشہ چوطرفہ، چومنزلہ، چوردروازہ، گل چھڑی، دو دھاری، دوپلی، دومنھا، نرماہٹ، بالشتیہ، بادشاہت چلتا پرزہ، چال باز، بیٹھک باز، پیچھے دار، بھڑک دار، چمک دار، چٹھی رساں، گھڑی ساز، گلاب جامن سبزی منڈی، منھ زور، ہاتھی خانہ، ہوا گاڑی، جام دانی، زٹل زیٹ، زپاٹا، غنڈہ وغیرہ وغیرہ

---

[۵۱] خواجہ احمد فاروقی: ذوق و جستجو ص۱۵

[۵۲] جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو ج ۱ ص ۵۸۷

[۵۳] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تاراچند: تمدن ہند پر اسلامی اثرات، سید اعجاز حسین: اردو شاعری کا سماجی پس منظر، مسیح الزماں: اردو مرثیے کا ارتقا، گیان چند: اردو مثنوی شمالی ہند میں، سید محمد عقیل: اردو مثنوی کا ارتقا، گوپی چند نارنگ: ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، سید مجاور حسین: اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر وغیرہ

بدیسی لفظوں کی صوتیاتی تبدیلی کے بارے میں ڈاکٹر دھریندر ورما نے عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے: "ہندی میں سب سے ادھک ودیشی شبد عربی فارسی کے ہیں۔ پرایہ یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ ان ودیشی بھاشاؤں میں فارسی آریہ بھاشا ہے، جس کا پراچینتم روپ اوستا کی بھاشا کا رگ وید کی بھاشا سے بہت نکٹ کا سمبندھ ہے اور عربی بھنن کُل کی بھاشا ہے، جس کا آریہ بھاشاؤں سے اب تک کسی پرکار کا بھی سمبندھ استھاپت نہیں ہو سکا ہے۔"[۱] لیکن لسانی بنیادوں پر فارسی کے پہلو بہ پہلو عربی زبان و ادب کے اثرات سے انکار کرنا حقیقت سے آنکھ مچولی کرنا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کی بنا پر موجودہ پراکرتوں کی ترقی میں تیز رفتاری پیدا ہوسکی۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان مسلمانوں کے تسلط میں نہ آیا ہوتا، اس صورت میں بھی ہندوستانی آریائی زبانیں لازمی طور پر جنم لیتیں۔ لیکن ان کی سمت موجودہ سمت سے مختلف ہوسکتی تھی اور اس میں زیادہ وقت بھی صرف ہوسکتا تھا۔[۲]

ہندی بنام اردو مسئلے کو ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو متعدد نتیجہ خیز حقائق سامنے آتے ہیں اور ملکی تہذیب کی کثرت میں وحدت کی کیفیتوں کے مختلف پہلو واضح ہوجاتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو نہ صرف پریم چند کے دور میں بلکہ اس کے بھی قبل سے علاحدگی پسندی کے عناصر کا وجود ملتا ہے۔ مختلف مورخوں نے سنسکرت سے ہندؤوں اور عربی فارسی سے مسلمانوں کے عمیق مذہبی و تہذیبی تعلق پر زور دیا ہے۔ ادبی معیاروں پر اسی دلیل نے ہندی اور اردو میں ان زبانوں کے الفاظ، ترکیبوں اور روایتوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال پر زور دیا جس سے اردو کو مسلمانوں کی زبان اور ہندی کو ہندؤوں کی زبان کہا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض انتہا پسندیوں سے قطع نظر ہندوستانی لسانی تاریخ کے مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ ابتدا میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں لسانی بنیادوں پر اختلاف نہیں تھا۔ حالانکہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کے رابطے کی زبان فارسی تھی، جس کے ذریعہ انھوں نے ملکی و بیرون جاتی تعلقات قائم کیے تھے لیکن ہندوستان کا باشندہ بن جانے کے بعد یہاں کی زندہ زبانوں سے ان کا تعلق رسمی یا کاروباری نہ رہ سکا۔ ہندی ادب کی تاریخ میں مسلم ادیبوں اور شاعروں کی اہمیت ہندوؤں سے کم نہیں ہے۔ وہ لوگ فارسی اور عربی کی اعلا تعلیم کے ساتھ

۱؎ دھیریندر ورما: ہندی بھاشا کا اتہاس ص۱۸۵

۲؎ سینتی کمار چیٹرجی: انڈو آرین اینڈ ہندی ص۹۵

ساتھ سنسکرت اور دیگر قدیم ہندوستانی زبانوں پر عالمانہ دسترس رکھتے تھے۔ ہندوستانی لسانی تاریخ کا یہی رحجان جب کھڑی بولی کے معیاروں پر ارتقار پذیر ہوا، تو اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہم آہنگ ہوکر سرگرمی دکھائی۔ اس زبان کے پاس ماقبل ہندوستانی ادب کا ذخیرہ تھا اور بیرون جاتی زبانوں میں فارسی، ترکی، عربی وغیرہ کے الفاظ وادب کی روایتیں تھیں۔ یہی زبان کبھی ہندی، کبھی ہندوئی، کبھی ریختہ اور کبھی ہندوستانی کہلاتی رہی۔ بہت عرصے کے بعد اسی زبان کا نام اردو مروج ہوا[51] جو بقول ڈاکٹر جمیل جالبی: "عربی، ایرانی، ہندی تینوں تہذیبوں کا سنگم اور ان کی منفرد علامت ہے۔"[52]

پریم چند نے لسانی مسئلے کی سنگینی کو کم کرنے کے خیال سے کھڑی بولی ہندی کو اودھی یا برج بھاشا کی روایتوں سے الگ کردیا، جس کے مشترک سرمائے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا برابر کا حصہ تھا۔ اور ہندی ادب کی تاریخ کو کھڑی بولی کی تاریخ سے متعلق کردیا۔ اس سے کون انکار کرے گا کہ ہندوستانی زبانوں کی ترقی میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے خونِ جگر صرف کیا تھا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ یہ زبان نشوونما کی منزل میں تھی کہ ہندوستانی تاریخ میں شدید سیاسی کشمکش و جدوجہد کا دور شروع ہوگیا جس میں "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا" جاری ہوگیا۔ انگریزی حکومت کی شاطرانہ چالیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی رشتے کو کمزور کرنے لگیں اور حکمران طبقہ کسی حد تک مطمئن ہوگیا تھا کہ اب یہ دونوں عظیم قومیں کبھی باہمی طور پر متحد نہ ہوسکیں گی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سیاسی پس منظر پر طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

سیاسی پس منظر:

قدیم ہندوستان کا سیاسی نظام ذات پات کی بنیادوں پر برہمنوں اور چھتریوں کے قبضۂ قدرت میں تھا۔ ملک کی دیگر قوموں کو انھیں کے زیرنگیں رہنا پڑتا تھا سیاسی وسماجی مسائل سے متعلق شعور اور ذمہ داری سماج کے اعلا طبقہ تک محدود تھا۔ مسلم، بادشاہوں کے دورِ حکومت میں محض امیروں اور رئیسوں کو سیاسی وانتظامی مسائل میں دخل اندازی کا اختیار تھا، جو بادشاہ کے حکم سے نظم ونسق اور حکومتی ذمہ داریاں قبول کرتے تھے۔ وہ یہاں

---

۵۱ محمود شیرانی: پنجاب میں اردو ص۲۸-۲۹

۵۲ جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو ج ۱ ص۲

کے حکومتی نظام میں مقامی معیار و میزان کے پابند تھے نتیجہ میں ہندوستانی عوام کسی طرح کی سیاسی کش مکش کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ عام ہندوستانیوں کے لیے یہ نئے بادشاہ پرانے راجاؤں کی جگہ پر حکمراں بن گئے۔ ملک کے معاشی بحران کو درباروں اور درباریوں کی دریا دلی اور وسیع القلبی نے روکے رکھا۔ وقتی طور پر ہندوستانی دیہی زندگی نے سیاسی یا حکومتی تبدیلی کا احساس نہ کیا کیوں کہ نئے حکمرانوں نے زمین کی ملکیت شاہی خزانہ، شاہی فوج، حکومتی نظام اور عوام کی سماجی زندگی سے متعلق مسائل کو اصلاحات کا موضوع نہیں قرار دیا تھا۔ موجودہ حکومتی نظام انگریزی طرزِ حکومت کا عطیہ ہے۔ انگریزوں نے سرزمین ہند پر قبضہ کرنے کے بعد سراسر مختلف معیار و مقصد کے ساتھ کام شروع کیا۔ انھوں نے سرزمین ہند پر پاؤں جمانے کے بعد یہاں کی عوامی زندگی سے خود کو الگ تھلگ رکھ کر مغربی تہذیب و معاشیاتی فضیلت کا اعلان کیا اور سیاسی نظام کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے بعد مروجہ سامنتی نظام کو گہرا صدمہ پہنچایا اس کے برعکس انگلستان کی شہنشاہیت کی پروردہ سرمایہ داریت کو نشو و نما عطا کی۔ اس ضمن میں اس حقیقت کا انکشاف دلچسپ ہوگا کہ برطانیہ سرکار کی طرف سے ہر بار نیا چارٹر دینے کے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کو بعض قاعدوں کی پابندی کی طرف متوجہ کیا جاتا تھا، جس میں اس امر پر خصوصی زور دیا جاتا کہ اس کے نمائندے اپنی سرحدوں کو بڑھانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ مگر یہ کارروائی صرف کاغذ کے صفحوں تک محدود رہتی تھی[1] انگریزوں نے سیاسی اور معاشی مورچوں پر ہندوستانی زندگی کے خلاف جنگ شروع کر رکھی تھی انھوں نے ریاستوں کے صلح ناموں میں وعدہ خلافیوں کے علاوہ مشین کے ذریعے پیداوار بڑھانے کی جد و جہد کو بنیاد بنایا۔ جس میں انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ کارل مارکس کا قول ہے کہ اس سماجی انقلاب کو بروئے کار لانے کی غرض سے انگریزوں نے انتہائی ذلیل طریقے اختیار کرنے سے بھی گریز نہ کیا تھا[2] انجام کار عوام میں شدید ردِ عمل ہوا۔ ہندوستانی عوام محسوس کرنے لگے کہ انگریزی حکومت ان کی سماجی، معاشی و تہذیبی نشو و نما روک دے گی۔ اس سے انگریزوں کے خلاف بے اطمینانی کی فضا

---

[1] پٹا بھی سیتا رمیہ: دی ہسٹری آف دی کانگریس ص ۳

[2] کارل مارکس: سلکٹڈ ورکس، ج ۱ ص ۳۵۴

پیدا ہوئی۔ لیکن اسے عملی صورت حاصل کرنے میں وقت درکار تھا جو کسی سیاسی بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوتا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے پس منظر میں ہندوستانی عوام کی بے اطمینانی اور پامالی کی داستان مضمر ہے جس کے مختلف سیاسی و معاشی اسباب تھے۔ انگریزوں نے یکے بعد دیگرے مختلف صلح ناموں کی خلاف ورزی کر کے ہندوستانیوں کو حقوق و اختیارات سے محروم کرنے کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا جس کا انجام نوابوں اور امیروں کے بعد کسانوں کی زمین کی ضبطی اور نیلام کی شکل میں رونما ہوا۔ انھوں نے اپنے سیاسی احکامات کی پابندی کرانے میں وحشت و بربریت کا سہارا لیا بعض موقع پر اسی کی بنیاد پر ہندوستانی عوام کے مقدموں کا فیصلہ بھی ہوتا تھا۔ رام بلاس کا خیال ہے "انیک منصف استریوں کے شیل بھنگ کرنے کی شرط پر ان کے پکش میں فیصلہ کرتے تھے۔ اس انگریزی راج کو سماپت کرنے کے لیے کسانوں اور ان کے ساتھ بہت سے سامنتوں نے یدھ کیا اور جنتا پر انیاچار کرنے والی 'نیائے ویوستھا' کو سماپت کر دیا"[۵۱] ہندوستانی عوام کی مذہبیت کو بھی انگریزوں نے طنز و تعریض کا موضوع بنایا اور عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں میں تعاون کیا کیوں کہ ان کے ذریعے انگریزی حکومت کے قیام کو سیاسی معیاروں پر مضبوط کرنے میں مدد مل رہی تھی، رام بلاس کا بیان ہے" پنجاب سرکار کی پرکاشت غدر کے کاغذات میں ایک ایسی خبر بھی ملتی ہے جس میں بشپ کے نیتر تو میں ایشور سے ایک وشیش دعا کی گئی تھی۔ اس دیش میں پہلے سے ادھک مضبوط بنیادوں پر ہمارے راجیہ کو استھاپت کر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ہر جگہ اپنے بیٹے کا راجیہ پھیلانے کا مادھیم بنا دے۔"[۵۲] اور اسی طرح کے مختلف اسباب کی بنا پر ہندوستانی عوام انگریزوں کے خلاف ہو گئے، جس کا پہلا اظہار پہلے ہندوستانی سپاہیوں کی اپنے ہی حاکموں کی حکم عدولی کی شکل میں ہوا۔ اس کو نارمن ڈی پام کے طرح کے مؤرخوں نے جسارت کر کے لکھا کہ یہ صرف چند سپاہیوں کی محدود بغاوت تھی۔[۵۳] انگریزوں اور ان کے پروردہ مقلد ہندوستانی مورخوں کا گروہ متحد و منظم ہو کر ہندوستانی

---

۵۱ رام بلاس: سن ستاون کی راجیہ کرانتی ص ۴۹۷

۵۲ ایضاً ص ۴۹۷

۵۳ جی۔ ایم۔ کاہن (مرتب): میجر گورنمنٹ آف ایشیا ص ۲۴۹

تحریک آزادی کے اثرات کم کرکے دکھانے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ لیکن عصر حاضر میں آزادی کے زندۂ جاوید مجاہدوں کی بعض ایسی تخلیقات یا تحریریں حاصل ہوگئی ہیں جن سے انگریز مورخ بھی حیرت زدہ ہوگئے ہیں۔ تحریک آزادی کی پہلی جنگ کے متعلق ڈاکٹر پانیکر کے خیالات انتہائی فکر انگیز ہیں جو متعدد مسائل کو واضح کردیتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس بغاوت کے تمام رہنما ایسے طبقوں سے آئے تھے جن کی جائداد یا حکومت انگریزوں نے ضبط کرلی تھی لہٰذا انھوں نے غیر ملکی حکومت کو ہندوستان سے نکال پھینکنے کے مقصد میں اتحاد کرلیا تھا۔[۱] ان کا طریقۂ کار حیرت انگیز حد تک پراسرار تھا۔ ان میں کسی کو دوسروں کے مشاغل کا علم نہ ہوتا تھا۔[۲] سر جارج گرانڈ جیکب 'ویسٹرن انڈیا' میں لکھتا ہے کہ جس حیرت انگیز و پراسرار طور پر یہ سازش کی گئی تھی، جس احتیاط کے ساتھ اس نظام کے مختلف پہلو ایک دوسرے کے ساتھ سرگرم عمل تھے کہ باہمی طور پر مستعد و متحد ہونے کے باوجود ایک کو دوسرے کی سرگرمیوں کا علم نہ ہوتا تھا ان لوگوں کو صرف اتنی اطلاع دی جاتی تھی جتنی ان کے کام کے لیے ضرورت ہوتی۔ ان سب باتوں کا بیان کرنا مشکل ہے اور یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ حیرت انگیز وفاداری کا سلوک کرتے تھے۔" حالاں کہ اس عظیم الشان بغاوت میں کامیابی انگریزوں کو ملی لیکن اس کے بعد انگریزی مزاج حادثات میں گرفتار ذہن کی طرح توازن کھو بیٹھا۔ اس نے طاقت کے استعمال اور مظالم کے ذریعے پامال کرنے کا رویہ اختیار کیا۔ ہندوستانی عوام کی شیرازہ بندی کو منتشر کرنے اور ان کی طاقت کو کم کرنے کی غرض سے ہندوؤں مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ابتدا میں سرکاری عہدوں اور ملازمتوں کے متعلق شاطرانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ ایک فرقے پر دوسرے فرقے کو ترجیح دے کر باہمی کش مکش پیدا کرنے کی کوشش کی گئی[۳] جس میں انھیں وقتی طور پر کامیابی بھی ملی۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں کہ: "۱۸۵۷ء سے لارڈ میو کے عہد تک ہندوؤں پر انگریزوں کی نظر عنایت رہی مسلمان دشمنِ خاص سمجھے جاتے تھے لیکن بعد میں حالات بدل گئے۔۔۔۔ انگریزوں نے ہمیشہ فرقہ وارانہ اختلاف پر مسرت محسوس کی اور ہندوؤں مسلمانوں کو مشترک مقاصد میں متحد ہونے سے روکا[۴]" اس درمیان انگریزوں

---

۱ کے۔ ایم۔ پانیکر: اے سروے آف انڈین ہسٹری ص۲۰۶

۲ سندرلال: بھارت میں انگریزی راجیہ ص۱۹۶

۳ بپن چند وغیرہ: کمونلزم اینڈ رائٹنگ آف انڈین ہسٹری ص۴۸

۴ تاراچند: ہسٹری آف فریڈم مومنٹ اِن انڈیا، حصہ دو ص۵۱۶

نے ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور ریاستوں سے صلح نامے کیے جس میں انھیں انگریزی عملداری میں متفرق انتظامی اختیارات بھی عطا کیے گئے۔ اس سے انگریزوں کے حلقۂ اختیار میں ایک طرح کے طاقتور تائید کرنے والوں کا حلقہ پیدا ہوگیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کی مسلسل کوششوں کے باوجود عام ہندوستانی ان کے خلاف ہوتا گیا، جس سے انگریزوں کے خلاف نفرت اور عدم اطمینان کی فضا تیار ہونے لگی۔ انگریزوں نے اپنی تہذیب و تمدن اور علم و ادب کی برتری سے ہندوستانیوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے ہندوستانیوں کو ان کی خامیوں کا بھی احساس ہوگیا۔ اس دور میں ہندوستان مختلف اصلاحی تحریکات کا گہوارہ بنتا نظر آیا جن سے سیاسی شعور اور قومیت کے تصورات کو تقویت ملی۔ سب سے پہلے ہندو سماج نے نئی تبدیلی کا احساس کیا۔ آتمی سوسائٹی (۱۸۱۵ء) برہم سبھا (۱۸۲۸ء، جو بعد میں برہم سماج بن گئی) کی بنیاد پڑی۔ راجہ رام موہن رائے نے برہم سماج کو خاص طور سے تقویت پہونچائی۔ اسی انداز کا ایک دوسرا ادارہ پرارتھنا سماج (۱۸۶۷ء) تھا، جو مہاراشٹر میں بہت عرصے تک پراسرار طور پر کام کرتا رہا۔ اس سلسلے کا سب سے اہم ادارہ آریہ سماج (۱۸۷۵ء) ہے جس نے ہندوستانی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ مسلمانوں میں اصلاحی تحریکیں دیر سے شروع ہوئیں حالانکہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ابتدا، فوجیوں نے کی تھی لیکن مسلم علماء کے تعاون کی بنا، پر اسے مذہبی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی اس لیے انگریزوں نے بغاوت کا زیادہ تر الزام مسلمانوں کے سر ڈال دیا۔ مسلمانوں میں سب سے پہلے بنگال کے انگریزی دانوں نے ۱۸۵۶ء میں محمڈن ایسوسی ایشن قائم کیا پھر عبداللطیف نے ۱۸۶۳ء میں کلکتہ میں محمڈن لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ سرسید کی اصلاحی سرگرمیاں ابتدا میں مذہبی نوعیت کی حامل تھیں لیکن جب انھوں نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تو ان کا لائحۂ عمل تبدیل ہوگیا۔ اور ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج کے قیام سے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم یا طرزِ زندگی کے لیے جاذبیت پیدا ہوگئی۔ شری نہرو نے قومی شعور کا سبب مغربی زندگی کے تجربات اور ماضی پر تفاخر کا احساس قرار دیا ہے۔ [۵]

اس دور کی ہندوستانی تاریخ کے مطالعے سے ایک ایسی صورت حال کا اندازہ واضح طور پر

---

[۵] جواہر لعل نہرو: دی ڈسکوری آف انڈیا ص ۳۹۲

ہوتا ہے کہ انگریزوں کو خطرے کی علامتیں نظر آنے لگی تھیں۔ انھیں دنوں مسٹر ہیوم کو سات حصوں میں خفیہ پولیس کی ایک ایسی رپورٹ ملی جس میں مختلف ضلعوں میں بغاوت کرنے کا ذکر تھا۔[۵۱] انھوں نے مختلف اینگلو انڈین افسروں اور اس زمانے کی گورنر جنرل لارڈ ڈفرن سے گفتگو کی اور ہندوستان کے دانشور سیاسی وسماجی عوام اور انگریزوں کے درمیان اخوت ومحبت پیدا کرنے کی غرض سے ایک ادارے کے قیام پر زور دیا۔ ان کا خیال تھا کہ صوبائی گورنر ان جلسوں کی صدارت کیا کریں جن سے سرکاری افسروں اور ان کے ماتحتوں کے درمیان تعاون کی فضا پیدا ہوسکے لیکن ڈفرن نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے حزب مخالف کو تقویت ملے گی۔[۵۲] بعد میں گورنر جنرل نے مسٹر ہیوم کی تجویز قبول کر لی اور ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی، جو بعد میں اپنے انقلابی کارناموں کی بنا پر ہندوستانی تاریخ کی زینت بنی۔ لیکن اس کے قیام کے مقاصد مختلف تھے۔ کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم نے تسلیم کیا ہے کہ مغربی تصورات تعلیم ایجادات اور ان کے تجربوں نے ایسی تبدیلیاں کر دی تھیں، جو مسلسل بڑھتی جا رہی تھیں، انھیں پرامن انداز میں ختم کرنے کی شدید ضرورت تھی۔[۵۳]

کانگریس کے مورخ ڈاکٹر سیتا رمیا نے کانگریس کی تاریخ کو جدوجہد اور تحریک آزادی کی کہکشاں سے تعبیر کیا ہے۔[۵۴] جو بعد میں رونما ہونے والے تاریخی حالات کے پیش نظر درست بھی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابتدا میں کانگریس کو اُس کے بانی مسٹر آلن آکٹیوین ہیوم نے وائسرائے کی دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ اصلاحی بنیادوں پر قائم کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی مسائل پر کام کرنے کے لیے کلکتہ کی انڈین ایسوسی ایشن، بمبئی کی پریسیڈینسی ایسوسی ایشن اور مدراس کی مہاجن سبھا کا وجود کافی تھا۔[۵۵] لہٰذا ۲۸ نومبر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے وجود میں آجانے کے بعد تقریباً بیس برسوں تک کانگریس نے ہندوستانی عوام کی رہنمائی اور سیاسی مسائل کے لیے جدوجہد

---

۵۱ بی۔ پٹا بھی سیتا رمیا: دی ہسٹری آف دی کانگریس ص۶

۵۲ نریندر دیو: راشٹر تیا اور سماج واد ص۸۲

۵۳ اے۔ آر۔ ڈیسائی: دی سوشل بیک گراؤنڈ آف دی نیشنل کانگریس ص۲۸۲

۵۴ بی۔ پٹا بھی سیتا رمیا: دی ہسٹری آف دی کانگریس ص۱

۵۵ ایضاً ص۱۵

کی۔ اس وقت کانگریس کی سرگرمیاں انڈین سیکرٹ کونسل کے خاتمہ، سرکاری ملازمت میں سہولتیں، ہندوستانی فوج میں کمی اور انتظامی اصلاحات وغیرہ سے متعلق تھیں، جنھیں انگریزوں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔ ان دنوں کانگریس کے جلسوں میں انگریزی حکومت کی مدح و ثنا کشادہ دلی سے کی جاتی تھی۔ اس کے رہنماؤں کی تمام کوششیں سیاسی خداوندوں کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے تک محدود تھیں۔ عوام کے علاوہ خواص میں بھی انگریزوں کی انصاف پروری کی مبالغہ آمیز تعریفیں ہوتی تھیں۔ یہ رجحان اس وقت تبدیل ہوا جب کانگریس میں حسرت، لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک وغیرہ شامل ہوئے۔ ۱۹۲۰ء تک کا زمانہ ہوم رول کی تحریک کے لیے اہم ہے۔ اس دور میں کانگریس کے دونوں بازوؤں میں رسہ کشی ہوتی رہی۔ انگریزی حکومت موقع کا فائدہ اٹھا کر "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر علاحدگی پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکجہتی ختم کرنا تھا۔ لیکن یہ صورتِ حال دیرپا نہ رہ سکی اس نے فرقہ وارانہ جذبات مشتعل کر دئے۔ انجام کار ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہو گئی۔ مسلم لیگ اپنے مقاصد کے اعتبار سے دایئں بازو کی جماعت تھی۔ اس کے مقاصد میں مسلمانوں کے علاحدہ حقوق کی حفاظت، غیر ملکی حکمراں طبقے کے ساتھ تعاون[۱] ملک کے مختلف طبقوں میں ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کرنا شامل تھے۔ لیکن عملی طور پر مسلم لیگ کانگریس کی مخالفت تک محدود تھی۔ وہ اپنی رجعت پسندانہ سرگرمیوں کے باعث نفرت اور نفاق پیدا کرنے کا ذریعہ بنی رہی۔ انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کے ردِ عمل میں ایک انقلابی جماعت بھی پیدا ہوئی جس کا عقیدہ تھا کہ تشدد کو ختم کرنے کے لیے تشدد کا استعمال لازمی ہے۔ اس کا طریقۂ کار کانگریس سے مختلف تھا۔ اس نے اخبار و رسائل کے ذریعہ غلامی کے خلاف نفرت کے جذبات ابھارے، نوجوانوں کو بھرتی کرکے باغی فوج کے لیے پلٹن تیار کی، بم اور ہتھیاروں سے فوجی تربیت اور غیر ملکیوں کے خلاف سازشیں کیں اور انھیں ختم کرنے کے پروگرام بنائے۔

ان دنوں کانگریس کئی طرح کے سیاسی ہچکولے کھاتی رہی۔ اس نے ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کی تائید کی، پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں سے تعاون کیا، ترکی کی خلافت کے خاتمے سے ناراض مسلمانوں کی اشک شوئی کی اور رولٹ ایکٹ کی مخالفت کی لیکن رفتہ رفتہ کانگریس

---

[۱] ایچ۔ای۔سی ذکریہ: رناسنٹ انڈیا ص۱۴۱

نے اپنی طاقت بڑھالی جس سے انگریزوں میں خود اعتمادی گھٹنے لگی اور انھوں نے جلیان والا باغ کے نہتے عوام پر گولیوں کی بوچھار کردی۔ ۱۹۱۸ء میں کانگریس کے دائیں بازو والے کانگریس سے الگ ہوگئے۔ انھوں نے الگ سے اپنی لبرل پارٹی قائم کرلی۔ یہاں سے کانگریس کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء تک کانگریس نے سوراجیہ کے مطالبے کی رہنمائی کی۔ اس کی ابتدا مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون سے ہوئی جس کے تین پہلو تھے ـــــ کونسلوں کا بائیکاٹ، عدالتوں کا بائیکاٹ۔ مزید برآں سرکاری عہدوں، درباروں، بدیسی سامان کے بائیکاٹ بھی شامل کیے گئے۔ مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانی عوام حق اور عدم تشدد کی بنیاد پر ستیا گرہ کرتے رہے تو ایک سال کے اندر انگریزوں کو ہندوستان چھوڑ دینا پڑے گا لیکن ایسا ممکن نہ ہوسکا بلکہ مہاتما جی نے ہی چورا چوری کے حادثے سے متاثر ہوکر اپنی تحریک ختم کردی، جس کا ردِ عمل کانگریسیوں پر بھی شدید ہوا، پنڈت موتی لعل نہرو، لالہ لاجپت رائے وغیرہ نے جیل کے اندر سے مخالفت کی۔ اس سے انگریزوں کو یہ گمان کرنے کا موقع ملا کہ اب مہاتما گاندھی کی ہر دلعزیزی ختم ہوگئی ہے اِس لیے انھوں نے انھیں چھ سال کی سزا دے کر جیل میں بند کردیا۔ اس درمیان کچھ کانگریسی رہنماؤں نے کونسل میں داخلے کی تجویز رکھی جن کے پیش رو پنڈت موتی لعل نہرو اور دیش بندھو چترنجن داس تھے۔ بعض کانگریسیوں نے اس تجویز کی مخالفت کی لیکن جب انھوں نے 'سوراجیہ دل' کے نام سے ایک الگ جماعت قائم کرلی تو وہ کانگریسی جو مہاتما گاندھی کی پالسیوں سے مطمئن نہ تھے، اس میں شامل ہوگئے۔ یہ جماعت زیادہ عرصے تک متحد شکل میں سرگرم عمل نہ رہ سکی۔ ۱۹۲۵ء میں دیش بندھو کی موت کے بعد اس کے اثرات کم ہوگئے۔ ذکریہ کا خیال ہے کہ "سوراجیہ دل' والے ایک ساتھ دو طرح کے کام کرنا چاہتے تھے ـــــ اپنی مقبولیت قائم کرنے کے لیے بائیں بازو کے کانگریسیوں کی حمایت کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کونسل کی حکومت پر بھی عقیدہ رکھتے تھے جس سے وہ لوگ ان الفاظ کے دام میں گرفتار ہوگئے، جن میں انھوں نے تعاون کو عدم تعاون باور کرانا شروع کردیا۔" [1] اسی درمیان ایک انگریز وفد حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے

---

[1] ایچ۔ ای۔ سی ذکریہ: رنائسنٹ انڈیا صفحہ ۲۴۰

ہندوستان آیا۔ جس نے پہلے سے طے کر رکھا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے۔اس لیے اس نے مشروط تجویز رکھی کہ وہ صرف ان مسائل پر غور کر سکے گا جو دونوں فریقوں کے لیے قابل قبول ہوں۔ ہندوستانی سیاسی رہنماؤں نے اس صورت حال کا مقابلہ کیا اور ایک متحدہ تجویز پیش کی لیکن اسے انگریز وفد نے مسترد کر دیا۔

کانگریس کا جلسۂ لاہور (۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء) کئی اعتبار سے ہندوستانی تاریخ میں انتہائی اہم ہے۔اس میں کانگریس نے ملک کی تحریک آزادی کو مکمل آزادی کے نصب العین سے شروع کرنے کا اعلان کیا۔ اس نے ایک تجویز کے ذریعہ نہرو رپورٹ کی تجویزیں مسترد کر دیں۔ اس سے فرقہ وارانہ مسائل کی سنگینی میں مزید اضافہ ہوا۔ اس ضمن میں کانگریس کی تجویز یہ تھی کہ: "آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسائل کا حل قومی نظریے سے ہوگا۔ چونکہ سکھوں نے اور خصوصاً مسلمانوں نے اور دوسری اقلیتوں نے عموماً نہرو رپورٹ کی تجویز پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے۔ لہٰذا کانگریس ان فرقوں کو یقین دلاتی ہے کہ وہ آئندہ کسی آئین میں کوئی فرقہ وارانہ فیصلہ قبول نہیں کرے گی، جس سے تمام فریقین مطمئن نہ ہوں۔[۵۱]" اسی درمیان مہاتما گاندھی نے تحریک عدم تعاون کی ابتدا کی اور نمک قانون توڑنے پر زور دیا۔ انگریزوں نے اس تحریک کو کچلنے کے لیے تشدد اور طاقت کے تمام حربے استعمال کیے۔ متعدد موقعوں پر لاٹھی چارج، گولیوں اور کرفیو کا استعمال کیا گیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو 'لاہور سازش' کے الزام میں سزائے موت دی گئی۔ حالانکہ مہاتما گاندھی بھگت سنگھ وغیرہ کے نظریات سے مطمئن نہ تھے لیکن انھوں نے اس کی مخالفت کی اور سزائے موت کو قید دوامی میں تبدیل کرنے کی تجویز رکھی جسے لارڈ اِروِن نے قبول نہ کیا۔[۵۲] اسی درمیان مہاتما گاندھی نے وائسرائے کے ساتھ ایک صلح نامہ پر دستخط کیے، جو ہندوستانی تاریخ میں 'گاندھی اِروِن پیکٹ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مطابق تمام قیدیوں کو جیل سے رہا کر دیا گیا اور مہاتما گاندھی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے ولایت گئے۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی انگریزوں کی جانب سے عملی تعاون نہ ملا بلکہ اس کے برعکس لندن کی واپسی پر انھیں گرفتار کر کے دوبارہ جیل میں بند کر دیا گیا۔ اسی سال

۵۱۔ بی۔ پٹا بھی سیتا رمیا: دی ہسٹری آف دی کانگریس ص ۳۶۵
۵۲۔ ایضاً ص ۴۵۱

انگریزی حکومت نے اچھوتوں کی علاحدہ قومیت کا اعلان کیا، تاکہ ملکی سالمیت کو مزید نقصان پہنچے۔ مہاتما گاندھی نے جیل سے اس کی مخالفت میں ۲۱ دنوں کا برت رکھنے کا اعلان کیا۔ دو سال بعد (۱۹۳۵ء) میں بعض اصلاحات کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا۔ انگریزی سرکار نے مالیات، فوج اور غیر ملکی محکمے محفوظ رکھنے کے بعد پروی کونسل کی ممبری کی تجویز رکھی ۵۱ جسے عام طور پر ناپسند کیا گیا۔ اسے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے مسترد کیا۔ آخر میں مجبور ہو کر انگریزی سرکار نے اس میں مختلف ترمیمیں کیں جس سے اس کی اہمیت پہلے سے بھی گھٹ گئی۔ ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں لکھتے ہیں: "یہ قانون اس شکل میں تیار کیا گیا ہے کہ آزادانہ طور پر کام کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی حقیقی یکجہتی منفی رہے گی۔ اس میں حب وطن اور قومی یکجہتی کی گنجائش نہیں ہے۔" ۵۲ لیکن کچھ عرصہ کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اسے قبول کر لیا اور انتخابات کی سرگرمیوں میں فرقہ واریت کی تبلیغ ہونے لگی۔

ہندی اردو ہندستانی:

لسانی مسئلے پر غور و خوض کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اردو ہندی لسانی مسئلے کو سیاسی وجوہ سے تقویت حاصل ہوئی تھی جسے مختلف شکلوں میں غیر ملکی سرکار شہ دیتی رہی تھی۔ تحریک آزادی کے دور میں محدود قومیت کے تصور نے لسانی فرقہ واریت کو فروغ دیا۔ نتیجہ میں دونوں فریق اپنی اپنی زبانوں سے جذباتی انداز میں شیفتگی کا اظہار کرنے لگے۔ جس کا دوسرا رخ فریق ثانی کی زبان اور ادبی سرمایہ سے تنفر کی شکل میں رونما ہوا۔ اس عمل و رد عمل کا انجام سیاسی مسائل کی سطح پر خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا، لہٰذا قومی رہنماؤں نے ہندی اور اردو زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی اور ان کی یکجہتی و ہم آہنگی سے ایک تیسری زبان 'ہندستانی' یا 'ہندستھانی' پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ اس نئی زبان کو لسانی سماجی، یا تاریخی ضرورتوں نے جنم نہیں دیا تھا۔ اس کے پاس کسی طرح کی واضح اور سلجھی ہوئی تہذیبی یا فنی روایت بھی نہیں تھی بلکہ یہ سراسر سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے غیر سائنسی طریقہ کار سے مفاہمت کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس لیے 'ہندستانی' جس طرح پیدا ہوئی تھی، اسی طرح تھوڑے سے عرصے کے بعد ختم ہو گئی لیکن پریم چند کے دور کے اکثر قومی رہنما حقیقت سے آنکھ مچولی کر کے لسانی

---

۵۱ جواہر لعل نہرو: دی ڈسکوری آف انڈیا ص ۴۳۷

۵۲ سر شفاعت احمد خاں: دی انڈین فیڈریشن ص ۳۵۷

مسئلے کا حل 'ہندستانی' کی شکل میں تلاش کرتے تھے اور اسی کو قومی زبان یا ادبی تخلیق کے لیے مسلط کردینا چاہتے تھے۔ مناسب ہوگا کہ ہندی، اردو، 'ہندوستانی' کے مختلف پہلوؤں پر غور کرلیا جائے۔

ہندی کے جانب دار ہندوستان کی قومی زبان کا نام ہندی رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں صرف ہندی ہندوستان کی اصل زبان کہلانے کی مستحق تھی[51]۔ اس زبان کو باہر سے آنے والے مسلمانوں نے بھی قبول کیا تھا اور اس کو 'ہندی' یا 'ہندوی' کہا تھا اس نام کے علاوہ کسی دوسرے نام کی قومی زبان قبول کرنے میں انھیں تکلف ہی نہیں، شدید انقباض تھا، اس نظریے کی تبلیغ اور ہندی کو ملک گیر ہندوستانی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرانے کی جدوجہد میں کیشب چندر سین اور دیانند سرسوتی نمایاں تھے۔ آریہ سماج ہندی کو ہندوؤں کی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرانے پر بضد تھا[52]۔ قومی رہنماؤں میں سب سے پہلے لوک مانیہ پنڈت بال گنگا دھر نے ۱۹۰۵ء میں ناگری پرچارنی سبھا کی مسند سے اردو کے بجائے ہندی اور ناگری رسم خط قبول کرنے پر زور دیا[53]۔ یہاں اس حقیقت کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لوک مانیہ تلک ہندی زبان اور رسم خط سے یکسر نابلد تھے۔ مہاتما گاندھی لکھتے ہیں: "لالہ لاجپت رائے میرے دوست تھے اور میں انھیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتا تھا کہ وہ کب خالص ہندی میں لکھنا پڑھنا سیکھیں گے۔ لالہ جی کہتے تھے کہ وہ ایسا نہیں کرسکتے (حالانکہ وہ بہت پرجوش آریہ سماجی تھے) اس لیے کہ ان کی مادری زبان اردو ہے"[54] اس اردو مادری زبان والے کے اردو دشمن تصور کو مزید تقویت عطا کرنے کی غرض سے ۱۹۱۰ء میں الٰہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن کی بنیاد

---

[51] سنیتی کمار چیٹرجی: انڈو آرین اینڈ ہندی ص ۱۳۸

"Hindi is the oldest and simplest name for the current speech of Northern India (from the east of the Punjab to Bengal) after the Turkey conquest in 12th-13th centuries and I use its old connotation which is still present among the masses. Hindustani is much later, and a more cumbrous formation : as a pure Persian word, it has largely come to mean something synonymous with the Mohammedan form of Hindi speech namely Urdu, with its superabundance of Persian and Persio-Arabic words to the restriction and exclusion of the native Hindi and Sanskrit elements."

[52] شیو پرشاد سنگھ: آدھونک پرولیشن اور نو لیکھن ص ۶۵

[53] رام گوپال: لوک مانیہ تلک، اے بیوگرافی ص ۲۴۰-۲۴۲

[54] مہاتما گاندھی: نوجیون ۱۸ اردسمبر ۱۹۴۷ء بحوالہ مشترکہ زبان ص ۲۵

ڈالی گئی، جس کے پہلے صدر پنڈت مدن موہن مالوی بنائے گئے۔ سمیلن کو متعدد قومی رہنماؤں کی تائید حاصل تھی جن میں راجرشی پرشوتم داس ٹنڈن اہم ہیں، مالوی جی اور ٹنڈن جی دونوں ہی ہندو احیا پرستی، کے نظریے کے پرجوش مبلغ تھے۔[۵۱] مہاتما گاندھی صحیح صورت حال سے بے خبر نہ تھے لیکن ملکی لسانی مسئلے کو حل کرنے میں سمیلن کی سرگرمیوں سے بے نیاز رہنا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف سمیلن کے ارباب حل وعقد بھی اپنے لسانی منصوبے کو عملی شکل دینے اور وسیع تر مقبولیت حاصل کرنے کے لیے مہاتما گاندھی کی دعائیں چاہتے تھے۔ انجام کار انھوں نے ۱۹۱۷ء میں مہاتما گاندھی سے سمیلن کی صدارت قبول کرالی۔ لیکن نتیجہ برعکس ہوا۔ مہاتما گاندھی اور سمیلن کے لسانی نظریات کے اختلافات بہت جلد بے نقاب ہوگئے۔ مہاتما گاندھی باہمی تعاون کی راہ پر گامزن رہنا چاہتے تھے جبکہ سمیلن کسی قیمت پر قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ مجبوراً گاندھی جی مستعفی ہوگئے۔[۵۲] اگر سمیلن نے گاندھی جی کا لسانی نظریہ قبول کرلیا ہوتا تو آج ہندوستانی زبان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔[۵۳] مہاتما گاندھی کے لسانی نظریات نے کئی بار ہچکولے کھائے لیکن ان کے اور سمیلن کے درمیان اختلافات ختم نہ ہوسکے بلکہ ۱۹۳۵ء تک نقطۂ عروج کو پہنچ گئے اور سمیلن نے 'ہندستانی' کو مکمل طور پر خیرباد کہہ کر خالص سنسکرت آمیز ہندی کی تبلیغ شروع کردی۔[۵۴]

ڈاکٹر دیویندر شرما نے لسانی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا سائنسی نظر سے جائزہ لیا ہے اور خاص طور پر ہندی کے لسانی مسائل کو اصطلاحات، قواعد، رسم خط اور روایات کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس کا وسیع تر معیاروں پر تعداد، تعلیم، رسل و رسائل، تجارت، سائنس، تہذیب، سیاست اور عسکری حالات کے علاوہ صنعتی ترقی کے منظر و پس منظر میں مطالعہ کیا۔

---

۵۱ جیوتیندر داس گپت : لینگویج کنفلکٹ اینڈ نیشنل موومنٹ ص ۱۳۱

"Both Malaviya and Tondon were closely identified with Hindu revivalism. They were also close to the traditional Hindi Literary elite."

۵۲ لکشمی چند: ہندی بھاشا اندولن بھومکا ص ۵

۵۳ لکشمی چند: ہندی بھاشا اندولن ص ۳۲،

۵۴ ایم۔ پی دیسائی : ہندی پرچار مومنٹ ص ۱۹

ہے۔ ان کا قول ہے: "بھاشا کا دھرم، سنسکرتی یا راشٹرتیا سے نیتہ سمبندھ نہیں ہے... بھاشا کیول سودھاگی وستو ہے، وہ ہمارے دے نک کاریہ کلاپ کے نرواہ کا ایک مادھیم ہے"[۵۱]
لیکن اس وقت کی فضا مختلف تھی۔ ہندی کے جانب داروں کا خیال تھا کہ قومی زبان کی تشکیل کے لیے سنسکرت اور فارسی روایات کی تحلیل درست نہیں ہے۔ ہندی اور اردو کو ملانے کی باتیں صرف مسلمانوں کو خوش کرنے کے خیال سے کی جاتی ہیں۔ فارسی کا سنسکرت الفاظ کے ساتھ استعمال ہندی کی لسانی نجابت ختم کر دے گا۔ اگر دونوں زبانوں کی تحلیل و اختلاط کا عمل ان کے آریہ نژاد ہونے کی بنا پر ہے تو ہندوستان میں آریوں کے علاوہ دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔ ان کے ساتھ کیوں ناانصافی کی جائے۔ مختصراً یہ کہ اس مسئلے کو سراسر جذباتیت کے ساتھ دیکھا گیا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔ پنڈت چندربلی پانڈے لکھتے ہیں: "بھاشا کا پرشن ہم ہندی بھاشا بھاشیوں کے لیے جیون مرن کا پرشن ہے۔ ہم یہ پیرا یہ دیکھتے ہیں کہ راشٹر بھاشا کا پرشن، ہماری دیش بھاشا کو چرتا جا رہا ہے۔ ہم تو انیہ بھاشا بھاشیوں کی بھانتی اپنی پرمپرا کو پنپانا اور سبھی دیش واسیوں کے ساتھ آگے بڑھنا تھا راشٹر کے آدھار میں لین ہونا چاہتے ہیں، پرنیچ میں نہ جانے کہاں سے یہ وانی سنائی پڑ جاتی ہے کہ نہیں، تمھیں تو ہندستانی کو اپنانا ہوگا۔"[۵۲]
اسی طرح کے خیالات کا اعادہ پنڈت پدم سنگھ شرما نے بھی کیا ہے لیکن انھوں نے اصل مسئلے کو سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے ادبی اور سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ان کا فیصلہ ہے: "پرارمبھ میں اردو ہندی دونوں ایک ہی تھیں۔ بعد میں جب دیاکرن، نیگل، لپی اور شیلی بھید کے کارن دو وبھنن دشاؤں میں پڑ کر یہ ایک دوسرے کے بالکل پرتھک ہونے لگیں تو سرو تھا بھیتے اور تکشا کے وچار سے ان کا وِرودھ مٹا کر انھیں ایک کرنے کے لیے ان دونوں شاکھاؤں کا سنکیت نام 'ہندستانی' رکھا گیا۔"[۵۳]
اس مسئلے میں اختلافات کی بنیاد معلوم کرنے کے خیال سے رسم خط کے مسئلے پر بھی غور کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر دیویندر شرما کا قول ہے: "راشٹر کی ایکتا کے لیے بھاشا

---

۵۱ دیویندر شرما: راشٹر بھاشا ہندی، سمسائیں اور سمادھان ص۱۴۱
۵۲ چندربلی پانڈے: راشٹر بھاشا پر وچار ص۲۵
۵۳ پدم سنگھ شرما: ہندی اور ہندستانی ص۱۷۲

کی ایکتا آدشیک سمجھی جاتی ہے۔ لپی کی ایکتا بھی راشٹریہ درشٹی سے اتنی ہی ہتوکی ہے۔[۱]
ہندی کے حامی فطری طور پر ناگری کے حق میں تھے اور اس کی نشوونما، مقبولیت اور وسعت
کی بنیادوں پر زور دیتے تھے۔ ہندی کے حامی اردو کے مختلف ہونے کے ثبوت میں قواعد،
عروض، رسم خط، اسلوب کے تنوع کو مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کرتے، راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند
اور بھارتیندو ہریش چندر کی زبان کے فرق کی مثال دیتے اور اپنے طور پر قومی زبان کے معیار
ومیزان کا خاکہ پیش کرتے وہ ہندی کے پہلو بہ پہلو سنسکرت کو مقبول کرنے کے ہم نوا تھے
کیونکہ سنسکرت کے ذریعہ ہندی کو فطری انداز میں الفاظ کا ذخیرہ حاصل ہو سکتا تھا اور عربی
و فارسی کے مقابلے میں سنسکرت الفاظ ہندوستان میں زیادہ مستعمل تھے سنسکرت آمیز ہندی
ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی قابل فہم تھی۔ اُن کے خیال میں اس طرح ہندی کا دائرہ عمل
وسیع سے وسیع تر کیا جا سکتا تھا اور اردو کے مقابلہ میں ہندی کے ذریعہ تعلیم و تربیت حاصل
کرنے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو سکتا تھا۔

ناگری رسم خط کے بارے میں ہندی کے حامی عجیب و غریب دلیلیں پیش کرتے تھے۔
دیوناگری ہندوستان کا قدیم رسم خط ہے، دیوناگری جاننے والوں کی تعداد ملک بھر میں سب سے
زیادہ ہے، دیوناگری میں تھوڑی سی ترمیم کرکے نہ صرف ملک کی دیگر علاقائی زبانوں میں مراٹھی،
گجراتی، آسامی اور اڑیا کو اپنایا جا سکتا ہے بلکہ تامل، تلگو، کنڑ بھی ہندی کے زیر اثر
آ سکتی ہیں، دیوناگری کا پڑھنا اور سیکھنا آسان ہے اور نشر و اشاعت میں آسانی ہوگی۔ اس
کے برعکس اردو رسم خط میں شوشوں اور نقطوں کے استعمال کی وجہ سے پڑھنے میں آنکھوں پر
زور پڑتا ہے![۲]

اردو کے حامی اپنے تصورات پر ہندی کے طرفداروں کی طرح جذباتی انداز میں زور
دیتے تھے۔ ان کے نزدیک اردو نہ صرف ملک گیر لسانی مقبولیت کی حامل تھی جو کلکتہ سے
پشاور تک لسانی کثرت میں وحدت قائم کرتی تھی بلکہ دور دراز کے ممالک سے ربط و تعلق قائم
کرنے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں: "ازمنۂ وسطیٰ میں فارسی سرکاری

---

[۱] دیویندر شرما: راشٹر بھاشا ہندی سمسیائیں اور سمادھان ص ۱۲۰۔
[۲] ردی شنکر شکل: راشٹر بھاشا کی سمسیا اور ہندوستانی آندولن ص ۵۱

و تہذیبی زبان تھی۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک رفتہ رفتہ یہ مقام اور منصب اردو کو حاصل ہوگیا۔۔۔ ۱۸۰۰ء کے افق پہ کھڑے ہوکر زبان کا مورخ یہ کہہ سکتا ہے کہ پنجاب تا بنگال اور کشمیر تا دکن، ادبی اور تہذیبی زبان کی حیثیت سے اردو زبان ہی لسانی کثرت میں وحدت کا سرچشمہ تھی۔"[۱] اس طرح سے دعوا کیا جاتا ہے کہ اردو نہ صرف ہندوستانی عوام کے رابطے کی زبان تھی بلکہ ۱۸۳۵ء کے بعد سے اس کو اپنے رسم خط، الفاظ اور اسالیب کی بنا پر عدالتی زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور دلی کالج کے نئے تعلیمی منصوبوں نے لسانی و ادبی معیاروں پر ترقی کی منزلوں سے ہم کنار کر دیا تھا۔ زبان ادب کے معیاروں پر اردو کے مراکز ملک کے اہم شہروں کے علاوہ چھوٹے بڑے قصبوں میں بھی قائم ہوگئے تھے، ان کا خیال تھا کہ ہندی تحریک 'بنگالی بابوؤں' کی بدنفسی کا نتیجہ تھی۔ سرسید نے اپنی تخلیقات میں بنگالی بابو کو ہندو رجعت پسندی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جو مسلمانوں کے دور حکومت کی یادگاروں خصوصاً لسانی و تہذیبی اثرات کو 'بندے ماترم' کے نعروں سے ختم کر دینے کی کوشش میں تھے۔ وہی لوگ الٰہ آباد اور بنارس کے ہندو مراکز سے ہندی تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ جیوتیندر داس گپت نے اقرار کیا ہے کہ ۱۸۷۰ء میں بنگال کا انگریزی اخبار 'ریفلکٹر' اردو اور ہندی کے درمیان لسانی خلیج کو وسیع کرنے میں خصوصی طور پر نمایاں تھا۔[۲]

اردو کے حامی ہندی تحریک کو سنسکرت کی بازیافت قرار دیتے تھے۔ اسے سر ولیم جونس کی حکمت عملی کا نتیجہ کہتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں سرسید بنارس میں تھے تو ان کی مڈبھیڑ پہلی بار اس لسانی تحریک سے ہوئی جو بنگال اور بہار کے بعد بنارس کے ہندی حلقوں میں سرگرم عمل تھی۔ اس تحریک کا مقصد تھا کہ تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم خط کی جگہ ہندی زبان اور ناگری رسم خط منظور کرایا جائے۔ سرسید کے متعلق تنگ نظر مورخین نے طرح طرح کی بہتان تراشیاں کی ہیں۔ ان کی ہندی تحریک کی مخالفت کو فرقہ وارانہ رنگ و آہنگ عطا کرنے کی مسلسل سعی نامشکور کی گئی ہے۔ سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملا کر قوم کا تصور رکھتے تھے۔ مدرستہ العلوم کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "کالج کے تمام حقوق جو اس

---

[۱] مسعود حسین خاں: اردو کا المیہ ص

[۲] جیوتیندر داس گپت: بنگال کلچر [illegible]

شخص سے متعلق ہیں، جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے، بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے .... میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔" [۵۱] ایک دوسری تقریر میں دوبارہ زیادہ وضاحت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں: "ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو کسی کو مسلمان کہیں، مگر غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں غیر ملکوں میں جب ہم لوگ جاتے ہیں تو ہندو اور مسلمان کے نام سے نہیں پکارے جاتے۔ نیک دل لوگوں سے نیٹو یعنی ہندوستانی کا اور تنگ دل لوگوں سے نیگرو یعنی کالے منہ یا وحشی ہندوستانی کا لقب ملتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔" [۵۲] اسی طرح سرسید کی کانگریس کی مخالفت کسی فرقہ وارانہ جذبے یا انگریز دوستی کے سبب سے نہ تھی۔ ان کا بیان ملاحظہ ہو: "کانگریس سے جو میری مخالفت ہے، وہ میرے سچے خیالات پر مبنی ہے، نہ کہ کسی کی خوشامد پر۔ میں کانگریس کے نظریہ سے اس لیے اختلاف رکھتا ہوں کہ انگریزوں کے بعد اکثریت کی حکومت مسلمانوں کے لیے سم قاتل ثابت ہوگی۔ یہ مخالفت ہندوؤں کی مخالفت نہیں ہے، بلکہ ہر اس شخص کی مخالفت ہے جو اکثریت اور اقلیت کے اصول پر ہندوستان جیسے ملک میں ملکی انتظام کا حامی ہے۔" [۵۳]

ان بیانات کے بعد مزید وضاحت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سرسید کی ہندی تحریک کی مخالفت تہذیبی، ثقافتی اور سماجی مباحث و مسائل کی تعبیر و تشریح میں انداز نظر کے اختلاف کی بنا پر تھی، جسے اس وقت نہ سمجھا جا سکا جس کا سرسید نے شدید ردعمل قبول کیا اور یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اس صورت حال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا قدم ملا کر چلنا ناممکن ہے۔ [۵۴] بقول ڈاکٹر اصغر عباس: "سرسید محض مصلح یا معمار قوم نہیں تھے بلکہ عاشق تھے۔" [۵۵] عاشق کے والہانہ جذبات تحریک اردو کی توانائی و رعنائی کا سبب بن گئے۔

---

۵۱ سرسید: مجموعہ لکچرہائے سرسید مرتبہ منشی سراج الدین ص۱۳۰

۵۲ ایضاً ص۱۴۶

۵۳ سرسید: بحوالہ مقالات شبلی مرتبہ خان عبیداللہ خاں ص۷۷

۵۴ الطاف حسین حالی: حیات جاوید ص۱۲۴

۵۵ اصغر عباس: سرسید کی صحافت ص۴۵

نیتجہ میں اس وقت ہندی کو مسلط کرنے کی کوششیں سر سبز نہ ہو سکیں اور سرسید کی سعی سے اس زمانے کے سر رشتہ تعلیم مسٹر کیمپسن کی تائید کے باوجود سر جان اسٹریچی کی گورنمنٹ ہندی کو سرکاری حیثیت عطا کرنے کو تیار نہ ہوئی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ فارسی رسم خط اور اردو میں نشر و اشاعت کی رفتار دیوناگری اور بھاشا کے مقابلے میں زیادہ تیز تھی اس درمیان اردو کا مسئلہ سرسید کے دل و دماغ پر حاوی رہا اور ہندی کی سنسکرت آمیز تحریک کا ردعمل بڑھتا گیا۔ اس صورت حال کا صحیح اندازہ ان کے سفرنامہ یورپ (۱۸۶۹ء) سے ہوتا ہے، جس میں انھوں نے بمبئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "اب یہ غور کرنا چاہیے کہ یہ زبان اردو کے کس قدر قریب ہے اور کتنے فارسی و عربی کے لفظ اس میں شامل ہیں۔ ہر مقام پر حیرت ہوتی ہے۔ الہ آباد کی ایسوسی ایشن کس کس ملک سے اور کس کس زبان سے فارسی لفظ نکال کر قدیم بھاشا جاری کرے گی حقیقت میں اردو ئے موجودہ اب بھی ہمارے ملک کی ورناکیولر ہے۔"[۵۱] اسی طرح انھوں نے ۲۹ راپریل ۱۸۷۰ء میں لندن سے محسن الملک کو خط میں لکھا تھا: "ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دلوں میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو اور خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے، مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو ہندی ہو۔ ترجمہ کتب بھی ہندی ہو۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار ہوا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علاحدہ اور مسلمان علاحدہ ہو جاویں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندوؤں سے علاحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں گے تو مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے اور اس میں صرف دو امر کا خیال ہے۔ ایک خاص اپنی طبیعت کے سبب سے کہ میں کل اہل ہند (کیا ہندو کیا مسلمان) کی بھلائی چاہتا ہوں اور دوسرا بڑا خوف اس بات کا ہے کہ مسلمانوں پر نہایت بداقبالی اور ادبار چھایا ہے۔ وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں اور وہ مطلق اپنے نقصان کو نہیں سمجھتے۔"[۵۲]

---

[۵۱] سرسید: تہذیب الاخلاق صفحہ ۱۸۱ (۱۸۸۱ء)

[۵۲] سرسید: خطوط سرسید مرتبہ سر راس مسعود صفحہ ۹۵

اسی طرح کا دوسرا واقعہ ۱۸۸۲ء میں رونما ہوا، جب مغربی اضلاع اور پنجاب کے چند ہندی حامیوں نے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے ہندی کی تائید اور اردو کی مخالفت کی، تو سرسید کی کوششوں سے کمیشن نے اس مسئلے پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر سرسید کی زندگی کے آخری ایام میں جب شمالی اضلاع، مشرق اور اودھ کے لفٹننٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل کے سامنے سرکاری عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی کے رائج کرنے کا سوال پیدا کیا گیا اور سرسید نے محسوس کیا کہ سر میکڈانل کا رجحان ہندی کی طرف ہے تو انھوں نے ایک مضمون کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ اس تحریک کی مخالفت کی بلکہ سر انٹونی میکڈانل پر بھی حملے کیے۔ اس ضمن میں اس حقیقت پر نظر رکھنا چاہیے کہ سرسید اور ان کے رفقا کا زیادہ تر تخاطب مسلمانوں سے ہوتا تھا جس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ محمڈن کالج کے ذریعہ انھیں عموماً مسلمانوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے تک لسانی تفریق پسندی نے مذہبی نوعیت حاصل کر لی تھی اور عام طور پر ہندو ہندی کے ساتھ اور مسلمان اردو کے ساتھ نظر آتے تھے۔ سرسید کے بارے میں ڈاکٹر اصغر عباس کا خیال درست ہے: "مذکورہ بالا حالات و کوائف نے انھیں شدید ذہنی صدموں سے دوچار کیا اور ان کی دیوپیکر شخصیت جس نے اپنے سفر میں دقتوں اور دشواریوں کو کبھی بھی حائل نہ ہونے دیا، بالآخر ان صدموں سے نڈھال ہو گئی۔ کیونکہ یہ تمام واقعات محض ذاتی نہیں بلکہ ان کے مقاصد کے لیے دیوار بن گئے تھے۔ کیا عجب کہ انھیں واقعات کے خلفشار نے ان کی داستانِ حیات پر ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انکی خوابوں کی سرزمین علی گڑھ میں موت کی ناگزیر حقیقت کے ذریعہ مہرِ اختتام ثبت کر دی ہو۔"[1]

ہندی کو بنگال اور بہار کی عدالتوں اور اسکولوں میں سرکاری حیثیت دلانے والوں میں مشہور و معروف بنگالی ادیب بھودیو مکھوپادھیا کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ان کی کوششوں سے بنگال کے گورنر نے ۱۸۸۱ء میں خصوصی حکم جاری کیا، جو شمالی ہند کی لسانی گتھی کو ہمیشہ کے لیے الجھا گیا۔ ۲۰ویں صدی کی ابتدا سے قبل ہندی کو سرکاری زبان کی حیثیت عطا کرنے کے تمام مطالبات پورے ہو چکے تھے۔ انگریزی سرکار کے اس لسانی رویے کو اردو کے حامیوں نے اپنے مفاد کے خلاف قرار دیا اور اس کی مخالفت میں تحریک شروع کی لیکن اب

---

[1] اصغر عباس: سرسید کی صحافت ص [illegible]

سرسید کی طرح کی ہمہ گیر شخصیت سرپرستی کے لیے موجود نہ تھی۔ نتیجہ میں اردو کی تحریک کس مپرسی کے عالم میں گرفتار ہو کر رفتہ رفتہ بکھر گئی۔

لسانی مسئلے کے فرقہ وارانہ رجحان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو ایک طرف ہندی ہندو ہندوستان سے متعلق تھا تو دوسری طرف مسلمانوں کی علاحدہ قومیت کا نشانہ بنا۔ اردو بنام ہندی کے مسئلے کو مسلم لیگ نے اپنی سرگرمیوں کی بنیاد بنایا۔ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی اقدار کی امین قرار دیا۔ نام نہاد مذہب اور تنگ نظری کی عینک سے زبان و ادب کو دیکھا گیا۔ انجمن ترقی اردو لسانی و تہذیبی مقاصد کو نظر انداز کر کے اردو کے مسائل و مباحث کو سیاسی نظر سے پیش کرنے لگی۔ حالانکہ انجمن کے اولین مہتمم مولانا شبلی نعمانی قومی تصورات کے حامل تھے اور دیوبند اسکول سے متعلق ہونے کی بنیاد پہ برطانوی سرکار کے شدید ترین مخالفوں میں تھے ؎ لیکن ۲۰ ویں صدی کی دوسری دہائی تک انجمن اور مسلم لیگ کے لسانی نظریات میں زیادہ فرق نہیں رہ گیا تھا۔ انجمن کے اس وقت کے مہتمم مولانا عبدالحق نے واضح طور پر مسلم لیگ سے تعلق استوار کر لیے۔ مسلم لیگ کی طرح ان کا بھی خیال تھا کہ اردو اور ہندی کو ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا چاہیے۔ ؎ اس درمیان قومی نظریے کے لوگ، خاص طور سے کانگریس میں شامل مسلمان، شدید کش مکش اور تذبذب میں گرفتار ہو کر قوت فیصلہ کی صلاحیت کھو بیٹھے۔

ہندستانی کے حامی ہندی اور اردو دونوں زبان والوں کے سیاسی اختلافات ختم کر کے دونوں زبانوں کے اختلاط میں قومی زبان کا تصور کرتے تھے۔ وہ ایک ایسا فارمولا پیش کر دینا چاہتے تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے باہمی طور پر قابل قبول ہو۔ ہندستانی کے حامیوں کی رہنمائی مہاتما گاندھی کر رہے تھے۔ انھوں نے مختلف پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر قومی زبان کے لیے مندرجہ ذیل اصول وضع کیے:

۱۔ جو سرکاری ملازمین کے لیے سیکھنے میں آسان ہو۔

۲۔ جو پورے ملک میں مذہبی معاشی اور سیاسی مبادلے کا ذریعہ بن سکے۔

؎ ضیاء الحسن فاروقی: دی دیوبند اسکول ص ۹۱-۹۷

؎ زیڈ۔ اے۔ احمد: نیشنل لینگویج فار انڈیا ص ۵۸

۳۔ جسے ہندوستانیوں کی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہو۔
۴۔ جسے ملک بھر کے لوگ آسانی سے سیکھ سکیں۔
۵۔ ایسی زبان کے انتخاب میں وقتی مفاد پر زور نہیں دینا چاہیے۔

مہاتما گاندھی نے اپنے وضع کردہ اصولوں کی بنیاد پر واضح انداز میں اعلان کیا کہ ان کے نزدیک پورے ملک کی بہبودی کے لیے 'ہندستانی' کو قومی زبان کی حیثیت سے قبول کرنا چاہیے جو متذکرہ بالا اصولوں کے معیار پر پوری اترتی ہے۔ اسے اردو اور ہندی دونوں رسم خط میں لکھنے کی اجازت ہوگی۔[1]

مہاتما گاندھی کے اعلان نے لسانی مسئلے کو حل کرنے میں غیر معمولی رول ادا کیا۔ ہندی کے حمایتی مطمئن نہ ہو سکے۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کی 'ہندستانی' کو گمراہ کن قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ 'ہندستانی' اردو کا دوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر سمپورنانند لکھتے ہیں: "جو لوگ ہندستانی کے سروپ کو سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ وہ اردو کا نامانتر ماتر ہے۔ اس بات کو کھل کر سامنے نہیں آنے دیتے تھے"۔[2] ڈاکٹر دھیریندر ورما بھی اسی خیال کی تائید کرتے ہیں: "ہندستانی نام یورپی لوگوں کا دیا ہوا ہے۔ اردو کا بول چال والا روپ ہندستانی کہلاتا ہے"۔[3] اس کے برعکس چند انتہا پسندوں کے علاوہ اردو کے حامیوں کا وسیع تر حلقہ مہاتما گاندھی کا ہم نوا ہوگیا۔ اس کی ایک کڑی ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا قیام ہے جو اردو ہندی زبانوں کے اختلاط سے 'ہندستانی' کو رائج کرنا چاہتی تھی[4] اسی طرح رائے راجیشور بلی کی کوششوں سے ۱۹۲۷ء میں الہ آباد میں ہندستانی اکیڈمی کی بنیاد پڑی جس کا مقصد 'ہندستانی' کو ہندی اور اردو کا مشترک ورثہ قرار دے کر تحفظ و ترقی عطا کرنا تھا۔ ہندستانی اکیڈمی کو سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر تاراچند، اور ڈاکٹر بھگوان داس کی تائید حاصل تھی اس نے ہندستانی تعلیم یافتہ طبقے کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔[5]

---

[1] مہاتما گاندھی: تھاٹس آف نیشنل لینگویج ص ۲-۳
[2] سمپورنانند: ہند بھاشا اندولن ص ۵
[3] دھیریندر ورما: ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۹۳
[4] ول فریڈ کینٹ ول اسمتھ: ماڈرن اسلام ان انڈیا ص ۱۴۷
[5] جیوتیندر داس گپت: لینگویج کنفلکٹ اینڈ نیشنل ڈولپمنٹ ص ۱۲۰

مہاتما گاندھی 'ہندستانی' کو مروج و مقبول کرنے میں مسلسل سرگرم عمل تھے ان کی خواہش کا احترام کر کے ۱۹۲۵ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 'ہندستانی' کو قومی زبان کی حیثیت سے منظوری عطا کی اور یہ تجویز پاس کردی کہ کانگریس کی تمام کارروائیاں حتی الامکان 'ہندستانی' میں کی جائیں گی۔ انگریزی یا دیگر زبانوں کا استعمال اسی صورت میں ہو سکے گا جب مقرر 'ہندستانی' سے یکسر نابلد ہو۔ [۵۱] مہاتما گاندھی کے خیالات کی تائید پنڈت جواہر لعل نہرو [۵۲] ڈاکٹر راجیندر پرشاد وغیرہ کے علاوہ ان لوگوں نے بھی کی جو بعض سیاسی مسائل میں ان کے ہم نوا نہ تھے، ان میں نیتا جی سبھاش چندر بوس کا ذکر خصوصیت سے کیا جا سکتا ہے۔ ۲۰ ویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں تک تمام قومی رہنماؤں نے یک زبان ہو کر تنہا 'ہندستانی' کو ملک کی قومی زبان کی حیثیت سے قبول کرنے پر زور دیا لیکن جیسا کہ اس کے قبل عرض کیا جا چکا ہے، بعد میں بعض قومی رہنماؤں کے خیالات تبدیل ہو گئے۔ [۵۴] پھر بھی متذکرہ بالا رہنما 'ہندستانی' کے تصور پر قائم رہے [۵۵] اس سلسلہ میں متعدد موقعوں پر سیاسی رزم آرائیاں ہوئیں لیکن 'ہندستانی' کی تحریک سست رفتاری سے سہی رفتہ رفتہ آگے بڑھتی رہی یہاں بھارتی ساہتیہ پریشد ناگ پور کے اجلاس (۱۹۳۵ء) کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ اس اجلاس میں ہندی اور اردو کے متعدد اہم ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی اور مہاتما گاندھی نے اپنے طور پر مسئلے کو سلجھانے کی کوشش کی لیکن چند کانگریسی رہنماؤں کے ورغلانے پر ان کی زبان سے کچھ نامناسب فقرے نکل گئے، جن میں انھوں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان کہا اور اس کے رسم خط کو قرآن کا رسم خط بتایا۔ آج یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد مہاتما گاندھی نے اپنی غلطی تسلیم کر لی تھی لیکن اس وقت کے ماحول میں ان کے اس بیان نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ اردو والے اس پر انتہائی برافروختہ ہوئے۔ پریم چند نے ۴ جون ۱۹۳۶ء کو مولانا عبدالحق کو لکھا: "مہاتما گاندھی ہندی کے خدا نہیں اور نہ ان کی تاویل ماننے کے لیے ہم مجبور ہیں۔ ہمارا دعوا ہے کہ پریشد کی زبان ہندستانی ہونا چاہیے۔

[۵۱] ایم۔ پی۔ ڈیسائی: دی ہندی پرچار مومنٹ ص ۱۴، پی ڈبی۔ گوشک: کانگریس آئیڈیالوجی ۱۶۷

[۵۲] جواہر لعل نہرو: دی یونیٹی آف انڈیا ص ۲۵۶

[۵۳] راجیندر پرساد: انڈیا ڈوائڈڈ ص ۵۴

[۵۴] سی۔ ایچ ہیمستھ: انڈین نیشنل ازم ص ۳۱۹

[۵۵] مہاتما گاندھی: تھاٹس آف نیشنل لینگویج ص ۱

ہم ہیں جنھیں زبان کے مسئلے سے کچھ شغف ہے۔ انھیں اپنے اثر اور علم اور مشورے سے اس منزل کی طرف اسے لانا چاہئے۔ اگر اردو داں طبقہ ساتھ دیتا ہے تو وہ 'ہندستانی' بنے گی، سچے معنوں میں۔ وہ الگ ہو جاتا ہے تو پھر وہ 'ہندی ہندستانی' ہو کر رہ جائے گی۔[۵۱]"
لیکن مولانا عبدالحق مطمئن نہ ہو سکے اور اس کے خلاف اردو تحریک کی تنظیم شروع کر دی۔ مگر پریم چند کے بارے میں ان کے خیالات مخلصانہ رہے۔ بھارتی ساہتیہ پریشد کی کارروائی پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا: "منشی پریم چند صاحب شروع سے آخر تک ہمارے ساتھ رہے اور اس تمام گفتگو اور بحث سے بد دل ہی نہیں تھے بلکہ برہم بھی ہوئے۔ ان کی دلی تمنّا بھی یہی تھی کہ ہندی اردو کے جھگڑے کو مٹا کر ایسی صورت پیدا کی جائے جو دونوں فریقوں میں مقبول ہو سکے۔[۵۲]"

مولانا عبدالحق کو اصلاً شکایتیں کانگرسی رہنماؤں سے تھیں، جنھوں نے زبان کے مسئلے کو سیاسی اغراض کے لیے غلط مباحث میں ڈال دیا تھا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کی 'ہندی اتھوا ہندستانی' کی تحریک کو "تھپک کر سلا دینے کے لیے اچھی خاصی لوری" اور ان کے رویے کو "ریا کی چادر اتار پھینکنا" قرار دیا۔ جس کے خلاف انھوں نے پریشد کی رکنیت برقرار رکھتے ہوئے اعلان جنگ کر دیا۔ اس دور میں مولانا عبدالحق اور دوسرے اکابر کی خط و کتابت کا مطالعہ کیا جائے تو زبان کی علاحدگی پسندی کے رجحانات کے متعدد پہلو سامنے آجاتے ہیں، جن سے پریم چند کو شدید اختلاف تھا۔ پریم چند نے مہاتما گاندھی سے اپنی بے پناہ عقیدت و محبت کے باوجود ملک کے لسانی مسائل میں کھلے طور پر ان کی مخالفت کی اردو ہندی کی یکجہتی کے تصور کے ساتھ ملک کی زبان کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مولانا عبدالحق کے رویے پر بھی سخت تنقید کی۔ موصوف لکھتے ہیں:
"ہمیں مولانا عبدالحق جیسے ویوودھ، وچارشیل اور نیتی چتر بزرگ کے قلم سے یہ شبد دیکھ کہ

---

۵۱ پریم چند، بحوالہ فروغ اردو: اردو مہم نمبر جنوری فروری ۱۹۶۸ء
۵۲ عبدالحق: مضمون، بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت: اردو، اپریل ۱۹۳۶ء
۵۳ تقسیم ملک کے بعد مولانا عبدالحق پاکستان ہجرت کر گئے۔ وہاں ان کے لسانی رویے میں مزید تبدیلی ہوئی۔ انھوں نے اردو کے بارے میں جینہ وہی مہلک، گمراہ کن اور غلط نظریے پیش کیے، جو ہندوستان میں اردو دشمن، فرقہ پرستوں کی زبان سے سن کر محبان اردو جز بز ہوتے ہیں:
"پاکستان کو نہ جناح نے بنایا، نہ اقبال نے بلکہ اردو نے پاکستان کو بنایا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی اصل وجہ اردو زبان تھی۔ سارا دو قومی نظریہ اور سارے ایسے اختلافات اردو کی وجہ سے تھے۔ اس لیے پاکستان پر اردو کا بڑا احسان ہے۔"
قومی زبان کراچی، ۱۶ر جولائی ۱۹۶۱ء

دکھ ہوا۔ جس سبھا میں وے بیٹھے ہوئے تھے، اس میں ہندی والوں کی کثرت تھی۔ اردو کے پرت ندھی تین سے زیادہ نہ تھے۔ پھر بھی جب 'ہندی ہندستانی' اور اکیلے 'ہندستانی' پر ووٹ لیے گئے تو 'ہندستانی' کے پکچھ میں آدھی سے کچھ ہی کم رائیں آئیں۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کر رہی ہے، تو شاید پندرہ اور پچیس کا بٹوارا تھا۔ ایک ہندی پردھان جلسے میں جہاں اردو کے پرت ندھی کل تین ہوں، پندرہ رایوں کا 'ہندستانی' کے پکچھ میں مل جانا ہار ہونے پر بھی جیت ہی ہے۔" ۵۱

اس کے بعد ہندی اور اردو کو قریب لانے کے لیے پریم چند نے اپنی جدوجہد اور بھی تیز کردی۔ انھوں نے دونوں زبانوں کے دانش وروں اور ادیبوں سے براہ راست مشورے کیے۔ انھیں اس جہاد میں شامل ہونے پر آمادہ کیا اور وسیع تر خلیجوں کو اپنی ذات سے پل کی طرح جوڑتے رہے۔ آخرکار ان کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ جامعہ ملیہ دہلی میں 'ہندستانی سبھا' کا پہلا اجلاس ۸ مارچ ۱۹۳۶ء میں ہوا، جس کا افتتاح پریم چند نے کیا۔ ہنس میں اس کی رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ہندوستان میں شاید پہلا موقع تھا کہ آٹھ مارچ کو دہلی کی جامعہ ملیہ میں دہلی کے اردو اور ہندی کے ادیبوں اور ساہتیہ کاروں نے مل کر ایک ہندستانی سبھا کی بنیاد ڈالی، جس کا اُدّیشہ یہ ہوگا کہ وہ دونوں ساہتیوں کو ایک دوسرے کے سمیپ لائے، ان کے ادیبوں میں محبت، ہمدردی اور ایکتا پیدا کرے، انھیں ایک دوسرے کے وچاروں اور بھاؤں کو جاننے اور سمجھنے کا موقع دے اور ہندستانی بھاشا کے وکاس کا آیوجن کرے۔" ۵۲ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، مہاتما گاندھی کے لسانی تصورات میں ان کی زندگی کے آخری دنوں میں زیادہ وضاحت پیدا ہوئی۔ رفتہ رفتہ موصوف ہندی اور اردو کو مخلوط کرکے ایک نئی زبان ہندستانی تخلیق کرنے کے بجائے اسے عام استعمال کی زبان ماننے لگے تھے۔ ڈاکٹر سید مجاور حسین کا خیال صحیح ہے کہ مہاتما گاندھی نے زبان کے مسئلے کو قومی یکجہتی اور تاریخی و تہذیبی اختلاط کے بنیادوں پر دیکھا تھا ۵۳ لیکن لسانی تنگ نظری نے اسے دوسرے انداز میں پیش کیا۔ پریم چند کی

---

۵۱ پریم چند: ساہتیہ کا اُدّیشیہ ص ۲۳۰

۵۲ پریم چند وودھ پرسنگ، ج ۳ ص ۱۹-۳۱۸

۵۳ سید مجاور حسین: اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر ص ۲۱۹ و ۲۱۸

زندگی تک 'ہندستانی' کی تحریک بڑی حد تک ہندی تحریک کی توسیع قرار دی جاتی تھی۔ 'ہندستانی' کی ہیئت و کیفیت معدوم تھی اور اس کی ادبی و تہذیبی روایتیں قدیم سرمایے سے محروم تھیں۔ اس وقت تک 'ہندستانی' کا تصور امید موہوم پر تھا۔ اس کے برعکس ہندی اور اُردو کا وجود ناگزیر تھا۔ اس کا احساس ان قومی رہنماؤں کو بھی تھا جو 'ہندستانی' کی تبلیغ میں سرگرداں تھے۔ مہاتما گاندھی نے ۲۰ر اپریل ۱۹۳۴ء کو اندور میں ہندی اور اُردو کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا: "ہندی اُس بھاشا کا نام ہے جسے ہندو اور مسلمان قدرتی طور پر بغیر کوشش کے بولتے ہیں۔ 'ہندستانی' اور اُردو میں کوئی فرق نہیں۔ دیوناگری لکھاوٹ میں لکھی جاتی پر وہ ہندی اور عربی میں لکھی جانے پر اردو کہی جاتی ہے" ۵۱

ایک دوسرے موقع پر انھوں نے کہا: "ہندستانی کا مطلب اردو نہیں بلکہ ہندی، اور اردو کی وہ خوبصورت ملاوٹ ہے، جسے اتری ہندوستان کے لوگ سمجھ سکیں اور جو ناگری اور اردو میں لکھی جاتی ہو۔ یہ پوری راشٹر بھاشا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ ادھورا ہے۔ پوری راشٹر بھاشا سیکھنے والوں کو دونوں ہی لکھاوٹیں سیکھنی چاہیئے۔ راشٹر بھاشا کا ٹھیک یہی تقاضہ ہے، جو اُسے جانے گا، وہ پائے گا، جو نہ جانے گا وہ کھوئے گا" ۵۲

لیکن مہاتما گاندھی کے برعکس متعدد قومی رہنماؤں کا خیال تھا کہ قومی زبان کا رسم خط ہندی اور اردو دونوں سیکھنے میں دشواریوں کا سامنا ہوگا۔ دونوں رسم خط کے سیکھنے میں زیادہ مہارت اور محنت درکار ہوگی جس کے لیے کوئی جواز نہیں ہے۔ لہذا ان کی تجویز تھی کہ اب ناگری اور اردو رسم خط کے بجائے کوئی تیسرا رسم خط تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ اس خیال کے حامی ہندی اور اردو رسم خط کی خامیوں اور دشواریوں کو مبالغہ آمیزی سے پیش کرتے تھے۔ انھوں نے رسم خط کے مسئلے کا حل رومن رسم خط اختیار کرنا قرار دیا۔ انھوں نے رومن رسم خط کی وکالت میں متعدد دلیلیں پیش کیں اور اسے سائنسی رسم خط قرار دے کر ہندستانی قومی زبان کا قومی رسم خط قرار دینے کی ناکام کوشش کی۔ ڈاکٹر گیان چند کا بیان ہے: "یونی ورسٹی تعلیم کی تاراچند کمیٹی نے بھی رومن رسم الخط کی وکالت کی تھی" ۵۳

---

۵۱ مہاتما گاندھی: مشترکہ زبان ص۱۷
۵۲ ایضاً: دیباچہ
۵۳ گیان چند: لسانی مطالعے ص۱۵۵

لیکن اُن کی یہ میانہ روی ہندی اور اردو دونوں زبان والوں کے لیے ناقابل قبول ثابت ہوئی۔اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ نتیجہ میں ہندستانی کے لیے اردو ہندی دونوں رسم خط استعمال کرنے کی آزادی باقی رہی۔

اردو۔ زبان یا اسلوب:

گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ پریم چند برج اور اودھی کو ہندی نہیں قرار دیتے تھے۔ یہ ان کا ذاتی خیال نہ تھا بلکہ اس وقت کے متعدد ہندی ادیب و دانش ور اسی طرح کے خیالات کے حامل تھے۔ ۱۹ ویں صدی کی آخری دہائی میں ہندی کے زبردست حامی اور مبلغ بابو ایودھیا پرساد کھتری بھی برج کو ہندی نہیں قرار دیتے تھے۔ وہ بڑے شدومد سے علانیہ کہتے تھے کہ اب تک جو کویتا ہوئی وہ تو برج بھاشا کی تھی، ہندی کی نہیں ہے۔[۵۱] ہندی زبان و ادب کو اس کے قدیم ادب سے جدا کرکے سراسر نئی بنیادوں پر استوار کرنے کا جذبہ منفی رجحان کا نتیجہ تھا کیونکہ اس طرح اردو زبان وادب کے ہم پلہ بنانے کے لیے کھڑی بولی کی روایتوں سے براہ راست وابستگی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، جو اس وقت تک ہندی میں برائے نام آسکی تھی۔ اس کا ایک دوسرا انتہا پسندانہ ردعمل اردو سے متنفر کرنے والے ہندی کے ان نامور علمار کے خیالات میں نظر آتا ہے، جو اردو زبان کے آغاز و ارتقا کو صرف نظر کرکے ہندی کو قدیم ترین زبان قرار دیتے ہیں اور اردو کو ہندی کا اسلوب ہونے تک محدود کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اردو کے وجود کو مستقل زبان کی حیثیت سے قبول کرنے کے منکر ہیں۔ وہ اردو کے تمام ادبی سرمایہ کو ہندی کی پونجی کہہ دیتے ہیں اس کی انتہا پسند مثال مشہور و معروف ہندی ادیب و ماہر لسانیات ڈاکٹر بابو رام سکسینہ ہیں جنھوں نے اردو کے تمام دکنی ادب کو 'دکھنی ہندی' مشتہر کردیا ہے۔ اردو کے بارے میں ان کے خیالات دلچسپ ہیں: "ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی ہوئی اردو بھاشا کہنے کا اتنا ہی مطلب ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مادھیم سے بدیشی شبد

---

۵۱ رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۴۳۵

آگئے ہیں تو اردو کو ایسا کہہ سکتے ہیں۔"[۵۱] مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کر لیا جائے۔

اردو بنام ہندی کا شاخسانہ اس وقت سے کھل کر سامنے آتا ہے جب ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ پہلی بار کھڑی بولی کی دو شکلیں مقرر کی گئیں، جس کی ایک شکل میں فارسی و عربی کا غلبہ اور دوسری میں سنسکرت اور دیگر مقامی بولیوں کے الفاظ کی کثرت کو بنیاد بنا کر دو مختلف زبان و ادب کی تشکیل کی گئی۔ اس سے نہ صرف کھڑی بولی کی لسانی سالمیت مجروح ہوئی بلکہ عام ہندوستانیوں کے درمیان منتقما نہ لسانی تعصبات کو راہ ملی۔[۵۲] فورٹ ولیم کالج میں مروجہ عوامی زبان میں مستعمل فارسی و عربی الفاظ کی جگہ پر خالص سنسکرت اور دیگر مقامی بولیوں کے الفاظ کا استعمال منضبط انداز میں کیا گیا، جسے آچاریہ رام چندر شکل نے للّو لال جی کے ضمن میں تسلیم کیا ہے: "اگر یہ اردو نہ جانتے ہوتے تو عربی فارسی کے شبد بچانے میں اتنے کرتی کار یہ کبھی نہ ہوتے، جتنے ہوئے۔ بہتیرے عربی فارسی شبد بول چال کی بھاشا میں اتنے مل گئے تھے کہ انھیں کیول سنسکرت ہندی جاننے والے کے لیے پہچاننا بھی کٹھن تھا۔"[۵۳]

اردو کے موقف کی حمایت کرتے ہوئے گریرسن نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندی زبان کا جنم اس وقت ہوتا ہے، جب فورٹ ولیم کالج کے ہندو مصنفوں، خاص طور پر للّو لال اور سدل مسر نے اردو سے فارسی و عربی الفاظ یا ئی کاٹ کر کے اس میں خالص سنسکرت یا علاقائی بولیوں کے الفاظ و روایات شامل کیے جس کا مقصد ہندی کو ہندوؤں کے رابطے کی زبان قرار دینا تھا۔[۵۴] گریرسن کے متذکرہ بالا خیال کا اعادہ اردو کے متعدد علما کرتے رہتے ہیں۔[۵۵] لیکن اسے اکثر ماہرین لسانیات قبول نہیں کرتے۔ ڈاکٹر دھیریندر ورما کا قول ہے:

---

[۵۱] بابو رام سکسینہ : دکھنی ہندی ص۴۲

[۵۲] سی۔ ایم۔ ہیم سنتھ : انڈین نیشنل ازم ص۱۰۵

[۵۳] رام چندر شکل : ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص۳۹۸

[۵۴] جی۔ اے گریرسن : دی لنگ وسٹک سروے آف انڈیا جلد ا حصہ ا ص۳۲۰

[۵۵] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو محی الدین قادری زور: ہندوستانی لسانیات ص۱۲۴، شوکت سبزواری: داستان زبان اردو ص۷، اردو ڈائجسٹ اپریل ۱۹۵۸ء محمد حسن: ہندی ادب کی تاریخ ص۱۶۶، حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو ص۱۳۱، نصیر حسین خیال: مغل اور اردو ص۱۵۱

" ویاکرن کے روپوں کی درشٹی سے ان دونوں ساہتیک بھاشاؤں میں وشیش انتر نہیں ہے۔ واستو میں دونوں کا مول آدھار ایک ہی ہے، کنتو ساہتیک واتاورن، شبد سموہ تتھا لپی میں دونوں میں آکاش پاتال کا بھید ہے۔" [۵۱] تقریباً یہی خیالات پروفیسر احتشام حسین کے ہیں۔ موصوف لکھتے ہیں: " اگرچہ اردو اور ہندی لسانی مفہوم میں دو زبانیں نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے اس وقت تک انھیں دو الگ الگ زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔" [۵۲] ڈاکٹر گیان چند بھی اس نظریے سے اصولی طور پر متفق ہیں، ان کا قول ہے: " اختلافات نکاتِ اشتراک سے زیادہ زوردار اور جاندار ہیں۔ چنانچہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ اردو والے ہندی تحریر و تقریر کو نہیں سمجھ پاتے اور ہندی والوں کے لیے اردو کی بعض عبارتیں ناقابل فہم ہو جاتی ہیں۔" [۵۳]

آخر الذکر اقتباس سے لسانی تفہیم کے مسئلے پر روشنی پڑتی ہے۔ اردو کو ہندی کا اسلوب کہنے والے دونوں زبانوں کا بنیادی فرق ملحوظ نہیں رکھتے۔ لسانی اعتبار سے سرعتِ تفہیم کے معیار پر زبانوں اور بولیوں کے رشتے کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ زبان کے مقابلہ میں بولیاں تفہیم کی زیادہ صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ دو مختلف بولیوں میں تفہیم زیادہ ہوتی ہے۔ دو مختلف زبانوں میں تفہیم کی صلاحیت اوسطاً کم ہوتی جاتی ہے مثلاً اودھی اور بھوجپوری دو مختلف بولیاں ہیں لیکن گجراتی اور ہندی دو مختلف زبانیں ہیں۔ اردو کا زیادہ تر ادبی سرمایہ ہندی زبان کے جاننے والے کے لیے ناقابلِ فہم ہوتا ہے جس سے واضح ہے کہ اردو اور ہندی میں مختلف سطحوں پر اتنا فرق آ گیا ہے اور آتا جا رہا ہے کہ دونوں سراسر مختلف بنیادوں اور روایتوں کے ساتھ ترقی پذیر ہیں۔ اُن میں مشترک قدریں کم ہوتی جا رہی ہیں، جس کے تاریخی، سماجی اور سیاسی اسباب ہیں۔

اسی طرح صرف رسم خط کے فرق کی بنیاد پر کسی تخلیق کو ہندی یا اردو تخلیق نہیں کہا جا سکتا مثلاً بھکتی کال کے مُسلم صوفی شعرا کی مختلف تخلیقات جیسے مرگاوتی، پدماوت، چترا ولی وغیرہ اور ابراہیم عادل شاہ کی نورس اردو رسم خط ہیں لیکن انھیں اردو کی تخلیق نہیں قرار دیا جاتا۔ سید انشا کی رانی کیتکی کی کہانی اور فورٹ ولیم کالج

---

[۵۱] دھیریندر ورما: ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۶۱
[۵۲] سید احتشام حسین: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۹۶
[۵۳] گیان چند: لسانی مطالعے ص ۲۰۳

ہیں مترجمہ سنگھاسن بتیسی، اور بے تال پچیسی پر اردو اور ہندی دونوں اپنا اپنا حق جتاتی ہیں۔

یہ مدنظر رہے کہ اردو رسم خط فارسی یا عربی رسم خط کا دوسرا نام نہیں ہے۔ عربی میں ۲۸ (اٹھائیس) حروف ہوتے ہیں۔ فارسی میں ۳۲ (بتیس) اردو میں بعض مخصوص ہندوستانی صوتیات کے پیش نظر ۴۵ (پینتالیس) حروف وضع کرلیے گیے ہیں متذکرہ بالا تعداد ڈاکٹر گیان چند نے دی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: "جہاں تک واقعی آوازوں کا تعلق ہے، ہندی اور اردو میں ایک ایک مصمتے کا فرق ہے۔ اردو کا مصمتہ 'ژ' ہندی میں قطعاً استعمال نہیں ہوتا۔ خ، ز، ف، ق' سے ہندی کو عار نہیں۔ اس کے برعکس اردو نے ہندی کا مصمتہ 'ण' قبول نہیں کیا"۔ ۵۱

ہندی اور اردو کی لسانی یک جہتی پر عموماً زور دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ موجودہ شکل میں دونوں زبانوں میں فرق پیدا ہوگیا ہے۔ اردو کو ہندی کا اسلوب کہنا، اردو کے حامیوں کو معاندانہ نظر آتا ہے جس پر ان کا ردعمل شدید ہوا اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں: "ہندی کے حامیوں کی یہ رٹ کہ اردو کوئی علاحدہ زبان نہیں، یہ ہندی کی ایک شیلی ہے۔ مرغے کی ایک ٹانگ پر اصرار کی طرح نامعقول ہی نہیں، بلکہ شرارت آمیز ہے"۔ ۵۲ یہ بلحوظ خاطر رہے کہ موجودہ صورت حال میں جن لسانی سیاسی حالات و مسائل کا سامنا اردو کو کرنا پڑ رہا ہے کبھی انھیں حالات سے ہندی بھی گذر چکی ہے جن سے ملول ہو کر پنڈت مہابیر پرساد دویدی کو کویتا لکھنا پڑی تھی۔ ناگری تیری یہ دشا! ۵۳

اردو کو ہندی کا اسلوب قرار دینے والے ہندی زبان و ادب کے بارے میں واضح تصور نہیں رکھتے وہ مختلف سطحوں پر مختلف طرح کی ہندی کا تصور کرتے ہیں۔ اونچی ہندی (ادبی ہندی) اردو اور ہندستانی۔ ادبی ہندی کے کئی روپ بیان کیے جاتے ہیں جو لسانی سطحوں پر ایک دوسرے سے سراسر مختلف ہوتے ہیں۔ ان میں بعض نے

---

۵۱ گیان چند: تحریریں ص۱۷۵

۵۲ ؍؍ : لسانی مطالعے ص۱۹۶ ۵۳ رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس، ص۴۶۵

اردو اور ہندستانی کو الگ الگ شکلوں میں قبول کیا ہے لیکن متعدد علمار ہندستانی، اور اردو کو ایک ہی زبان قرار دیتے رہے ہیں۔ اس مسئلے پر مناسب مقام پر روشنی ڈالی جا چکی ہے، اس لیے اس کی تکرار نامناسب ہے۔ یہاں اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ صرف قواعد کی یکسانیت اور لفظوں کے استعمال کی بنیاد پر ہندی اور اردو کو ایک زبان یا ایک دوسرے کا اسلوب قرار دینا درست نہیں ہے۔ اردو نہ صرف ہندی سے مختلف بولی ہے بلکہ ایک منفرد زبان ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں:

۱۔ ملک کی بعض دوسری بولیوں کے برعکس اُردو کا جغرافیائی علاقہ محدود نہیں ہے اس کے بولنے اور سمجھنے والے نہ صرف ہندوستان بلکہ دور و نزدیک کے دیگر ممالک میں بکھرے ہوئے ہیں جو اردو کو رابطے کی زبان کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ اردو میں ہندی سے مختلف ادبی، سماجی اور مذہبی قدریں اور روایتیں ہیں جو تقریباً چار صدیوں میں ترقی کی مختلف منزلیں حاصل کرتی رہی ہیں۔ ان پر ملک اور بیرون جات کی مختلف و متعدد زبانوں اور تہذیبوں کے اثرات ہیں۔ اردو کا مخصوص اسلوب، مواد، علائم اور اصناف ہیں جن کا ہندی میں وجود ہی نہیں ہے۔

۳۔ اردو رسم خط کا ہندی رسم خط سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ اردو رسم خط زبان و ادب کی ابتدا سے ترقی کی مختلف منزلوں میں مروج و مقبول رہا ہے۔ ہندوستان کے ہمسایہ پاکستان میں اردو اسی رسم خط میں سرکاری حیثیت رکھتی ہے۔ متعدد دیگر ممالک میں اردو سے مماثل رسم خط رائج ہے، جو اس رسم خط کے بین الاقوامی ہونے کی دلیل ہے۔ ناگری یا اس سے مماثل رسم خط محض ہندوستان کی بعض زبانوں تک محدود ہے۔

۴۔ اردو کو دستور ہند کی رو سے سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ حکومت ہند اور ریاستی سرکاروں کی ذمہ داری ہے کہ اردو کے تحفظ و ارتقا کے لیے سہولتیں بہم کرے۔

۵۔ اردو اور ہندی ادبیات ایک دوسرے کے لیے عام طور پر ناقابل فہم رہتے ہیں۔

اردو کے حامیوں کے بڑے حلقے میں ہندی علمار کے ذریعہ اردو کو ہندی کا اسلوب کہنے کے رجحان کو مشکوک نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اسے ان کی توسیعی ذہنیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ محبان اردو کا عقیدہ ہے کہ اردو کو ہندی کا اسلوب قرار دینے کے پس پشت تنگ نظری، جانب داری اور لسانی عصبیت کے جذبات ہیں۔ جس کے ذریعہ اردو ادب کے تمام سرمایے کو ہندی قرار دے کر اردو کے منفرد وجود کو ختم

کرنے کی کوشش ہے۔ اردو کے دشمن یک جہتی ذیک رنگی کے نام پر نہ صرف اردو زبان و ادب بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر حملہ آور ہوتے ہیں بلکہ جس طرح مہاتما بدھ کو وشنو کا اوتار اور "اہنسا پرمو دھرما" کو قدیم ہندستانی فلسفہ کا ایک پہلو قرار دے کر ہندوستان سے بدھ مذہب کو رخصت کر دیا گیا، اُسی طرح اردو کو ہندی کا اسلوب بنا کر نہ صرف اردو کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ اس کی پیدا کردہ مخصوص سماجی، تہذیبی اور ثقافتی روائتیں بھی نیست و نابود کرنے کی سعی لاحاصل کی جاتی ہے۔ اس پر جب اردو سے اس کا رسم خط ترک کر دینے کا مطالبہ ہوتا ہے تو اردو کے حامیوں کا اندیشہ قوی تر ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ اردو کو مکمل طور پر فنا کر دینے کی سازش تو نہیں ہے۔ موجودہ صورت میں اردو اور ہندی کو مختلف لسانی حیثیت سے قبول کرنے کے بعد ہی اس زندہ لسانی حقیقت کا سامنا کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات چاہے جتنی تلخ ہو، لیکن سراسر حقیقت پر مبنی ہے۔ مناسب ہوگا کہ یہاں پریم چند کے لسانی نظریے کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کر لیا جائے۔

پریم چند کے لسانی نظریات:

پریم چند کی نظروں سے لسانی تفرقے کی بنیادیں اوجھل نہیں تھیں۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ سیاست کی بازی گری میں کھڑی بولی کی تقسیم مفاد و مفاہمت کی بنیادوں پر ہو رہی تھی۔ وہ کئی اعتبار سے سیاسی رہنماؤں سے مختلف انداز نظر رکھتے تھے، لیکن مجموعی اعتبار سے اردو اور ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیتے تھے، لکھتے ہیں:
"میرے خیال میں ہندی اور اردو دونوں ایک زبان ہیں۔ کریا اور کرتا، فعل اور فاعل جب ایک ہیں تو ان کے ایک ہونے میں سندیہہ نہیں ہو سکتا۔" [۱] ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: "یہ ساری کرامات فورٹ ولیم کی ہے، جس نے ایک ہی زبان کے دو روپ مان لیے ... اس میں اس وقت کوئی راج نیتی کام کر رہی تھی یا اس وقت بھی دونوں زبانوں میں کافی فرق آگیا تھا، یہ ہم نہیں کہہ سکتے لیکن جن ہاتھوں نے یہاں کی زبان کے

---

[۱] پریم چند: ساہتیہ کا ادیشیہ ص۱۷۶

اس وقت دو ٹکڑے کر دیے، اس نے ہماری قومی زندگی کے دو ٹکڑے کر دیے۔"[۵۱]
اسی طرح کے خیالات دوسرے موقعوں پر بھی ظاہر کیے ہیں۔ وہ ہندی اور اردو کو کھڑی بولی کی دو شکلیں قرار دیتے تھے لیکن ہندی کو بعد کی پیداوار مانتے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:
" ہماری ہندی بھاشا ہی سو ورش کی نہیں ہوئی۔ راشٹر بھاشا تو ابھی شیشو اوستھا میں ہے اور فی الحال یدی ہم سرل ساہتیہ بھی لکھ سکیں تو ہمیں سن تشٹ ہونا چاہیے۔"[۵۲]
اور اس کے نام کے بارے میں دوسری جگہ لکھتے ہیں: " ہندی مسلمانوں کا دیا ہوا نام ہے اور ابھی پچاس سال پہلے تک جسے آج اردو کہا جاتا رہا ہے، اسے مسلمان بھی ہندی کہتے تھے۔"[۵۳]
اور اس سلسلے میں 'شدھ ہندی' کے رجحان کو غلط و گمراہ کن قرار دیتے تھے: "شدھ ہندی تو نرارتھک شبد ہے۔ جب بھارت شدھ ہندو ہوتا، تو اس کی بھاشا شدھ ہندی ہوتی۔ جب تک یہاں مسلمان، عیسائی، پارسی، افغانی سبھی جاتیاں موجود ہیں، ہماری زبان بھی دیا پک رہے گی۔ اگر ہندی بھاشا پرانتی رہنا چاہتی ہے اور کیول ہندوؤں کی بھاشا رہنا چاہتی ہے، تب تو وہ شدھ بنائی جا سکتی ہے، اس کا انگ بھنگ کر کے اس کا کایا پلٹ کرنا ہوگا۔ پروڑھ سے وہ پھر شِشو بنے گی۔ یہ اسمبھو ہے ہاسیا سپد ہے۔"[۵۴]
ان خیالات کے پسِ پشت قومی یکجہتی، مساوات اور ہم آہنگی کے محرکات کی کارفرمائی ہے۔ کیونکہ پریم چند ملکی و لسانی وحدت کا تصور اس کی مبادیات کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ یہ رجحان تحریک آزادی کے دور میں بنیادی حیثیت کا مالک تھا اور پوری قوم کی وحدت کے لیے ایک مشترک زبان کی اہمیت ناگزیر سمجھی جاتی تھی۔ لیکن یہ زبان اردو ہو، ہندی ہو یا اور ملک کی کوئی دوسری زبان، اس کے لیے متضاد و مختلف خیالات تھے۔
پریم چند قومی زبان کے مسئلے کو مہاتما گاندھی کی نظر سے دیکھتے تھے اور قومی وحدت کے تصور کے ساتھ مسئلے کا حل نکالنے کے متمنی تھے لیکن مہاتما گاندھی کے برعکس انھوں نے

---

۵۱ پریم چند: ساہتیہ کا ادیشیہ ص ۱۹۵
۵۲ ایضاً ص ۱۵۹
۵۳ ایضاً ص ۱۵۷
۵۴ ایضاً ص ۱۵۴

'ہندی تحریک' میں کبھی شرکت نہیں کی، خصوصاً ایسی تحریک، جس کی رہنمائی ساہتیہ سمیلن کرے۔ اسی طرح انھوں نے انجمن ترقی اردو کی طرح کے اداروں سے بھی اپنا دامن کشیدہ ہی رکھا کیوں کہ ان کے داعی اردو اور ہندی کے درمیان نفاق کی بنیادوں کو وسیع کرتے تھے۔ پریم چند اردو یا ہندی میں کسی ایک کو قومی زبان کا درجہ دینے پر تیار نہ تھے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا ہے:

" بھارت ورش کی راشٹری بھاشا نہ تو اردو ہی ہے اور نہ ہندی، بلکہ وہ ہندستانی ہے جو سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کے بہت بڑے بھاگ میں بولی جاتی ہے، لیکن پھر بھی لکھی نہیں جاتی اور یدی کوئی لکھنے کا پریتن کرتا ہے تو اسے اردو اور ہندی کے ساہتیک ٹاٹ باہر کر دیتے ہیں۔" ۵۱ اسی طرح کے خیالات کا اظہار دوسری جگہ پر بھی کیا ہے: " ہمارے ملکی پھیلاؤ کے ساتھ ہمیں ایک ایسی بھاشا کی ضرورت پڑ گئی ہے، جو سارے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جائے، جسے ہم ہندی یا گجراتی یا مراٹھی یا اردو نہ کہہ کر ہندستانی بھاشا کہہ سکیں، جسے ہندوستان کا پڑھا، بے پڑھا آدمی اسی طرح سمجھے اور بولے، جیسے ہر ایک انگریز یا جرمن یا فرانسیسی فرینچ یا جرمن یا انگریزی بولتا اور سمجھتا ہے۔" ۵۲ یہی کھڑی بولی کی ایک شکل تھی، جو مختلف علاقوں میں آسانی سے سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ اسی کو مہاتما گاندھی نے 'ہندستانی' کا نام دیا تھا، جو اس کی ہمہ گیری کے اعتبار سے بڑی حد تک صداقت پر مبنی تھا۔ اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد ملک کی دوسری زبانوں کے لوگوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ جن کو اردو والے، اردو بولنے سمجھنے والوں کی تعداد اور ہندی والے ہندی بولنے سمجھنے والوں کی تعداد اپنے طور پر بیان کرتے تھے۔ پریم چند نے ۹ اپریل ۱۹۳۴ء کے 'ہنس' میں اسی صورت حال کے متعلق لکھا تھا۔ ملاحظہ ہو: " اگر اردو کو بھی ہندی میں ملا لیا جائے، کیوں کہ جہاں تک بولی کا سمبندھ ہے، ان دونوں بھاشاؤں میں کوئی انتر نہیں، تو ہندی بولنے والوں کی سنکھیا پندرہ کروڑ سے کم نہیں ہے اور سمجھنے والوں کی سنکھیا تو اس سے کہیں زیادہ ہے۔ آشچریہ ہے کہ ابھی تک وہ کیوں قومی زبان نہیں بن گئی۔" ۵۳

---

۵۱ پریم چند: ساہتیہ ادیشیہ ص ۲۰۹

۵۲ ایضاً ص ۱۷۱

۵۳ پریم چند: وودھ پرسنگ ج ۳ ص ۲۸۹

قومی زبان کی نوعیت کے بارے میں اختلافات کی کئی سطحیں تھیں۔ جغرافیائی اور تاریخی ضرورتوں کے علاوہ مذہبی اور ثقافتی محرکات نے متعدد پہلوؤں سے یلغار کر رکھا تھا۔ اس میں جذباتی اور رومانی تصورات کی لہریں دیگر مباحث کی طرح لسانی مسئلے میں بھی شدت پیدا کرتی تھیں۔ اردو، ہندی اور ہندستانی، تینوں کے حامی و رہنما اپنی اپنی زبان کو قومی زبان کا درجہ دیتے اور بقیہ زبانوں کو ضمنی یا ماتحت سمجھتے، جس سے انتشار و بے یقینی پھیلتی۔ اس کا ردعمل اس زمانے کے تقریباً تمام ادیبوں اور مفکروں نے قبول کیا ہے لیکن پریم چند نے اپنا رویہ واضح رکھا۔ دسمبر ۱۹۳۵ء کے 'ہنس' میں لکھتے ہیں: "اردو کیول پرانتی بھاشا نہیں ہے، مگر اسی طرح ہندی کیول پرانتی بھاشا نہیں ہے اور اس میں سے کسی ایک کو بھی مٹایا نہیں جاسکتا ان کی انتی پرتھک رہ کر بھی سہیوگ میں ہے۔ دونوں کو اپنے اپنے وکاس اور پھیلاؤ کا سمان اوسر ملنا چاہیئے۔"[۵۱] اسی طرح قومی زبان اور علاقائی زبان کے متعلق پریم چند کے نظریات واضح ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے جس 'ہندستانی' کی تائید کی اور جس کے سمجھنے اور بولنے والوں کی بڑی تعداد بیان کی، اسے رابطے کی زبان تک محدود رکھنا چاہتے تھے، جس میں مختلف علاقوں کے لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔ یہی سرکاری زبان کی حیثیت سے ابلاغ و ترسیل کا ذریعہ بنتی لیکن اردو اور ہندی کی انفرادی خصوصیات بھی برقرار رہتیں اور اسے علاقائی زبان کی حیثیت سے ملک کے چند علاقوں میں ترقی اور پھیلنے کی سہولتیں حاصل ہو جاتیں۔ علاقائی زبان کے دائرے میں تمل، تیلگو، ملیالم، کنڑ، بنگلا، گجراتی وغیرہ کو بھی مراعات حاصل ہوتیں۔ یہ تصور بعد کے ادوار میں کئی بار آزمائشوں میں گرفتار ہوا۔ آزاد ہندوستان میں زبان اردو کو نہ صرف اس کے منصب سے محروم کر دیا گیا، جو اسے ایک بڑے عرصے سے حاصل تھا بلکہ اسے قومی و علاقائی زبانوں میں مساوی درجہ بھی نہ مل سکا، جس کے سیاسی اسباب تھے۔

پریم چند نے 'ہندستانی' کو سرکاری اور رابطہ کی زبان قرار دئے جانے کی تائید کی اور اس کی ماہیئت، حدود، معیار اور ذرایع کے مختلف پہلوؤں پر اپنے خیالات بیان کیے۔ 'ہندستانی' کے عام فہم ہونے کے متعلق لکھتے ہیں: "وہی شبد سرل ہے، جو بیوہار میں آرہا ہے،

---

۵۱ پریم چند: ددوھ پرسنگ ج ۳ ص ۲۸۹

۵۲ پریم چند: ساہتیہ کا ادیشیہ ص ۱۵۶

اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ ترکی ہے یا عربی یا پرتگالی۔ اردو اور ہندی میں کیوں اتنا سوتیاڈاہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر ایک سموداے کے لوگوں کو اردو نام پر یہ ہے تو انھیں اس کا استعمال کرنے دیجیے، جنھیں ہندی نام سے پریم ہے، وہ ہندی ہی کہیں۔ اُس میں لڑائی کی کوئی بات نہیں۔"[۵۱] اسی طرح اصطلاحی الفاظ کے وضع کرنے کے متعلق مخصوص خیالات رکھتے تھے، ملاحظہ ہو: "ضرورت تو ہے کہ ایک ہی شبد لیا جائے، چاہے وہ سنسکرت سے لیا جائے، یا فارسی سے، یا دونوں کو ملا کر کوئی نیا شبد گڑھ لیا جائے۔"[۵۲]

اس زبان کا رسم خط کیا ہو؟ اس کا جواب دشوار تر تھا کیوں کہ اردو اور ہندی دونوں رسم خط کے حامی اپنے دلائل لسانی و علمی سے زیادہ مذہبی و جذباتی تعلق کے ساتھ بیان کرتے۔ ان دونوں رسم خط میں باہمی ہم آہنگی تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کیوں کہ ان کی نوعیتیں مختلف و متضاد تھیں۔ اس میں مفاہمت کی صورت بعضوں نے یوں پیدا کی کہ ہندستانی کے لیے رومن رسم خط کی تجویز رکھی حالاں کہ اس میں ہندوستان کی تمدنی و ثقافتی، علمی و ادبی، جغرافیائی اور تاریخی روایتوں کی گنجائش نہیں تھی، اس سے اختلاف اور بڑھ جاتا۔ مفاہمت کا یہ طریقہ سراسر سہل انگاری کا نتیجہ تھا کیوں کہ اس حقیقت کو نظر انداز کردیا گیا تھا کہ زبان سے قوم کا تعلق، اس کے رسم خط کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ کسی زبان کا رسم خط اس کی لطافتوں، رموز اور مقاصد سے اتنا قریب ہوتا ہے کہ اسے ترک کردینے کی صورت میں زبان سے ان گنت خوبیاں چھوٹ جاتی ہیں۔ پریم چند کو رسم خط کے تعین کی دشواریوں کا احساس تھا، ایک جگہ لکھتے ہیں: "ہمیں اپنی راشٹر بھاشا اور راشٹر لپی کا پرچار مستر بھاؤ سے کرنا ہے۔ اس کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم ناگری لپی کا سنگٹھن کریں۔ بنگلا، گجراتی، تمل آدی یدی ناگری لپی سویکار کرلیں تو راشٹر لپی کا پرشن بہت کچھ حل ہوجائے گا۔ اور کچھ نہیں تو کیول سنکھیا ہی ناگری کو پردھانتا دلادے گی۔"[۵۳] اسی طرح ۲۳ راپریل ۱۹۳۴ء کے "جاگرن" میں ناگری رسم خط کی حمایت کرتے ہیں: "جو لپی بھارت کے ادھک تر پرانتوں میں

---

[۵۱] پریم چند: ساہتیہ کا ادیشیہ ص۱۵۶

[۵۲] ایضاً ص۱۹۶

[۵۳] ایضاً ص۱۶۶

آسانی سے سیکھی جا سکے گی، وہی راشٹری لپی بن جائے گی کچھ سمے کے لیے دونوں لپیاں ساتھ ساتھ بھی رہ سکتی ہیں۔"[۵۱] ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: "لپی کا فیصلہ سمے کرے گا جو زیادہ جاندار ہے، وہ آگے آئے گی۔ دوسری پیچھے رہ جائے گی۔ لپی کے بھید کا وشئے چھیڑنا، گھوڑے کے آگے گاڑی کو رکھنا ہے ہمیں اس شرط کو مان کر چلنا ہے کہ ہندی اور اردو دونوں ہی راشٹری لپیاں ہیں اور ہمیں اختیار ہے چاہے جس لپی میں اس کا ویوہار کریں۔ ہماری سودھا، ہماری منو ورتی اور ہمارے سنسکار اس کا فیصلہ کریں گے۔"[۵۲]

ان بیانات کی روشنی میں واضح ہے کہ پریم چند کے نزدیک قومی زبان کا رسم خط ناگری ہونا چاہیے کیوں کہ وہ اسی کو ملک کے قومی رسم خط کی حیثیت دیتے تھے۔ اسی میں دوسری زبانوں کے نشر و اشاعت پر زور دیتے تھے۔ اردو رسم خط کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وقت کے تقاضوں کے اعتبار سے اس کی مقبولیت میں رفتہ رفتہ کمی ہو جائے گی اور ناگری اس کی جگہ لے گی، لیکن اس میں کسی طرح کی عجلت ناپسند کرتے تھے، یہی اس دور کا گاندھیائی طریقۂ کار بھی تھا۔ انھیں بنیادوں پر بعد میں قومی زبان کی نوعیت و ماہیت کا تعین کیا گیا جس میں سیاسی انتہا پسندی کے رجحان نے شدت پیدا کی۔ اس سے پریم چند بھی متاثر ہوئے۔ اپریل ۱۹۳۴ء کے 'ہنس'، میں اردو رسم خط کو شمالی ہندوستان کے ایک صوبے تک محدود قرار دینے کے بعد وقتی طور پر اردو تعلیم کا بندوبست کرنے کی تجویز رکھتے ہیں: "فارسی لپی کا ویوہار اتر بھارت اور پنجاب کے مسلمان ہی کرتے ہیں اگر ہمارے مدرسوں میں ہر ایک چھاتر کے لیے اردو اور ہندی دونوں بھاشاؤں کا لکھنا، پڑھنا دسویں درجے تک لازمی کر دیا جائے تو ہمارے خیال میں کچھ دنوں کے بعد شکشت سماج دونوں لپیوں میں ابھیست ہو جائے گا اور اسے جو لپی ادھک پرش کرت، سگم اور سبودھ سہل جان پڑے گی اس کا ویوہار کرے گا۔"[۵۳] اپنے انھیں خیالات کا اعادہ انھوں نے دوبارہ دسمبر ۱۹۳۵ء میں 'ہنس'، سلیم جعفر کے مضمون کی تائید میں کیا: "ہمارا یقین ہے کہ ہندوؤں کو ہائی اسکول تک اردو کو لازمی بنائے

---

[۵۱] پریم چند: ساہتیہ کا ادیشیہ ص ۱۶۶

[۵۲] پریم چند: دودھ پرسنگ ج ۳ ص ۲۹۱

[۵۳] پریم چند: ساہتیہ کا ادیشیہ ص ۱۸۵

جانے میں اعتراض نہ ہوگا۔ اگر دونوں زبانیں ہائی اسکول تک لازمی ہو جائیں تو دونوں زبانوں کا وکاس اس ڈھنگ سے ہوگا کہ وے دن دن ایک دوسرے کے سمیپ آتی جائیں گی اور ایک دن دونوں بھاشائیں ایک ہو جائیں گی۔"۵۱

پریم چند اردو اور ہندی کو ملانے اور ہندستانی تحریک کی رہنمائی میں ملک کے سیاسی رہبروں کے شریک کار تھے۔ اس عمل میں ان کے نزدیک لسانی مباحث سے زیادہ ملکی سیاست کی نیرنگیاں تھیں، جن میں زبان کے مسئلے کو جلد از جلد طے کر دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس حقیقت کو سراسر نظر انداز کر دیا جاتا تھا کہ اردو اور ہندی میں الگ الگ لسانی خصوصیات جنم لے چکی ہیں اور ان کا کارواں تیزی سے منزل کی طرف بڑھ رہا ہے، جس میں چند سیاسی رہنماؤں، دانشوروں اور ادیبوں کے مصلحت پسند فیصلے لایعنی ہو جائیں گے۔ پریم چند بھی اپنے دور کے رہنماؤں کے ہم آواز ہو کر، بنیادی تعلیم، میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے شامل کیے جانے کے مطالبے میں شامل ہو جاتے تھے اور چوتھے درجے تک ایک ہی زبان کو دو رسم خط میں تعلیم دینے کے تائید کرتے تھے: "سنیکت پرانت کے اپر پرائمری اسکول میں چوتھے درجے تک اسی مشرت بھاشا ارتھات ہندستانی کی ریڈریں بڑھائی جاتی ہیں تو کیول ان کی لپی الگ ہوتی ہے۔ ان کی بھاشا میں کوئی انتر نہیں ہوتا۔"۵۲ حالاں کہ پریم چند نے ہی ایک دوسری جگہ لکھا ہے: "کیول لپی ایک ہو جانے سے بھاشاؤں کا انتر کم نہیں ہوگا اور ہندی لپی میں مراٹھی سمجھنا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا مراٹھی لپی میں۔"۵۳ یہ اور اسی طرح کے متعدد تضادوں کی بنا پر قومی زبان کا مسئلہ پیچیدہ تر ہو گیا تھا۔ اس پیچیدگی نے مباحث کے دروازے کھول دیے ایک نیا مسئلہ سامنے آیا، جس کے متعلق مختلف رائیں پیش کی جاتیں۔ قومی زبان کی نوعیت، حدود اور معیار، ملک کی دوسری زبانوں سے اس کا رشتہ و تناسب، سرکاری اور غیر سرکاری روابط کی بنیاد وغیرہ کے متعلق فیصلے نہیں کیے جا سکے تھے۔ حالانکہ انگریزی زبان کے ذریعے ملکی و بین الاقوامی روابط قائم تھے، لیکن وہ حاکم طبقے تک

---

۵۱ پریم چند: وودھ پرسنگ ج ۳ ص ۲۱۴

۵۲ پریم چند: ساہتیہ کا ادیشیہ ص ۲۱۱

۵۳ ایضاً ص ۱۸۴

محدود تھی، ہندوستانی عوام تک انگریزی کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔ انگریزی استحصال کرنے والوں کا آلہ کار تھی، اس لیے تحریک آزادی کے دور میں انگریزی کی بھی مخالفت ہوتی تھی۔ پریم چند لکھتے ہیں: "انگریزی زبان ہماری پرادھینتا کی وہی بیڑی ہے، جس نے ہمارے من اور بدھ کو جکڑ رکھا ہے کہ اس میں ایکتا بھی نہیں رہی۔ ہمارا شکچھت سماج اس بیڑی کو گلے کا ہار سمجھنے پر مجبور ہے۔[۵۱]" اس لیے انھوں نے ہندوستانی عوام کو رائے دی: "جس دن آپ انگریزی زبان کا پربھتو توڑ دیں گے اور اپنی ایک قومی بھاشا بنالیں گے، اسی دن آپ کو سوراج کے درشن ہو جائیں گے ... راشٹر کی بنیاد راشٹر کی بھاشا ہے، ندی، پہاڑ، سمندر راشٹر نہیں بناتے۔ بھاشا ہی وہ بندھن ہے جو چرکال تک راشٹر کو ایک سوتر میں باندھے رہتی ہے اور اس کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیتی۔"[۵۲] لیکن انگریزی کی اس مخالفت میں اس کی ادبی و تہذیبی قدروں کی نفی کرنا مقصود نہ تھا۔ پریم چند نے ایک دوسری جگہ صاف لفظوں میں لکھا ہے: "دنیا کی تہذیبی یا سانسکرتک برادری میں ملنے کے لیے انگریزی ہی ہمارے لیے ایک دروازہ ہے اور اس کی طرف سے ہم آنکھ نہیں بند کر سکتے لیکن ہم دولت اور اختیار کی دوڑ میں اور بے تحاشہ دوڑ میں قومی بھاشا کی ضرورت بالکل بھول گئے اور اس ضرورت کی یاد کون دلاتا۔"[۵۳]

پریم چند نے لسانی مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جنھیں مد نظر رکھ کر پریم چند کے لسانی سرمایہ پر غور و فکر کیا جا سکتا ہے۔

●

پریم چند کے سلسلے میں 'اردو بنام ہندی' مسئلے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس حقیقت پر نظر رکھنا چاہیے کہ پریم چند نہ تو ماہر لسانیات تھے اور نہ انھوں نے اس مسئلے پر معروضی

---

۵۱ پریم چند: ساہتیہ کا ادیشیہ ص ۱۵۱

۵۲ ایضاً ص ۱۵۳

۵۳ ایضاً ص ۱۷۲

نقطۂ نظر کے ساتھ غور وفکر کیا تھا انھوں نے اردو ہندی کے درمیان اختلافات پیدا ہونے کی تمام تر ذمہ داری فورٹ ولیم کالج کے سر ڈال دی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر ملکیوں نے اسے کمپنی بہادر کے افسروں کی تعلیم و تربیت کی غرض سے قائم کیا لیکن اس سلسلہ میں ان کا رویہ منفی یا تخریبی نہیں تھا۔ غیر ملکی حاکموں کی دور رس نظروں نے اندازہ کرلیا تھا کہ پورے ملک میں کلکتہ سے پیشاور تک جو شہری زبان مروج و مقبول تھی وہ بلا شبہ اردو تھی لیکن دور افتادہ گاؤں اور قصبوں میں قدیم علاقائی بولیوں کا بول بالا تھا۔ ان کے ادبی سرمائے میں بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ لیکن اس کی رفتار کمزور اور سست تھی۔ ہندوستانی عوام کا ایک بڑا طبقہ اسے ناگری رسم خط میں ہی لکھتا تھا۔ ہمارے نزدیک جان گلکرسٹ نے سیاسی اغراض و مقاصد سے زیادہ لسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے للو لال جی وغیرہ کو ہندی لکھنے کا حکم دیا تھا۔ اس لیے بغیر کسی ثبوت کے فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو مسترد کردینا، انصاف پر مبنی نہیں ہے۔

پریم چند نے لسانی مسئلے کو سیاسی نظر سے دیکھتے اور اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ مجوزہ حل مہاتما گاندھی یا دیگر قومی رہنماؤں کے لسانی حل سے مختلف نہیں تھا۔ انھوں نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے درمیان ایک تیسری زبان 'ہندستانی' کی حمایت کی تھی۔ اب وقت نے واضح کردیا ہے کہ 'ہندستانی' کو قومی زبان کا منصب نہ مل سکتا تھا، نہ ملا۔ وہ پہلے بھی بول چال کی سطح پر مروج و مقبول تھی اور آج بھی ہے لیکن ادب میں اس کا وجود منفی تھا۔ ہندی اور اردو جس طرح پہلے موجود تھیں، اُسی طرح عصر حاضر میں بھی ترقی کی اعلا جہتوں کی طرف گامزن ہیں۔

▲▲▲

باب ۲
اردو ھندی ادیب

اردو ھندی ادیب

ھ پریم چند کو ہندوستانی ادبیات کی تاریخ میں سبرامنیم بھارتی کی طرح طرۂ امتیاز حاصل ہے کہ ان کو ملک کی دو مختلف و متنوع ، زندہ و متحرک اور ترقی پذیر ادبیات میں یکساں رتبہ ملا لیکن اس اعتبار سے انھیں فوقیت دی جا سکتی ہے کہ سبرامنیم بھارتی کے برعکس انھوں نے دو متضاد و مختلف روایتوں کے ادبیات میں تہذیبی و ثقافتی معیاروں پر یکساں مقبولیت اور سربلندی حاصل کی۔ اردو ہندی ادبیات میں پریم چند کو افسانوی تخلیقات کا رہنما قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے قبل اردو ہندی ادبیات میں افسانوی تخلیقات کسی حد تک دوسری زبانوں سے ترجمہ ہونے تک محدود تھیں یا پھر قدیم حکایتیں اور داستانیں تھیں۔ پریم چند نے افسانوی ادب کو جدید منظر و پس منظر عطا کیا۔ وہ اردو اور ہندی ادبیات کی ترقی کے لیے برابر سرگرم عمل رہے۔ ان دونوں زبانوں کے بولنے اور سمجھنے والوں کی مجموعی تعداد ، مردم شماری کے اعتبار سے، ملک کی تمام زبانوں کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد سے زیادہ ہے، جن کو قومی تحریک کے رشتے میں منسلک رکھنے کے لیے اردو اور ہندی کی یکجہتی و یگانگت کی ضرورت سمجھی گئی۔ پریم چند نے ادب ، تاریخ اور تہذیب کے مختلف مسائل کو ملکی سالمیت کے دائرے میں رکھا تھا۔ ان کی تخلیقات نہ تو خلا کی پیداوار ہیں اور نہ انکشاف ذات یا مالی حصول کا ذریعہ بننے تک محدود تھیں۔ پریم چند کی ادبیات کا دائرہ عمل

وسیع تر تھا۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ان کی تخلیقات کے مختلف ادوار اور متنوع پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ پریم چند کے تخلیقی عمل میں مختلف مراحل و منازل، فنی مباحث، داخلی اثرات اور خارجی عوامل باہمی طور پر مربوط رہتے ہیں، جن کے تجزیے و تفہیم سے ادبی و تخلیقی محرکات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

پریم چند نے اپنے تخلیقی عمل کے متعلق کوئی منضبط و مبسوط دستور و ضوابط نہیں بنائے تھے اور نہ اپنی روزانہ کی ڈائری ہی لکھی، جو ان کے ذہنی عمل اور اس کے محرکات کے بارے میں اندازہ کرنے میں معاون ہوتی۔ لیکن اس سے یہ قیاس کرنا غلط ہوگا کہ پریم چند ادبی تخلیقات کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں مقررہ تصورات نہیں رکھتے تھے۔ موصوف لکھتے ہیں: "جب تک کرنٹ افیرس سے لگاؤ نہ رہے، کسی مضمون پر لکھنے کی تحریک نہیں ہوتی اور مضمون مشکل سے سوجھتا ہے۔" [۵۱] علاوہ بریں پریم چند تخلیقی و فنی بصیرت کے لیے سماجی و معاشی زندگی سے مواد فراہم کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کا بیان واضح ہے: "اگر لیکھک اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو اسے ہوا سے بھی کہانیاں مل سکتی ہیں۔ ریل گاڑی میں، نوکا پر، سماچار پتروں میں، وکیتیوں کی بات چیت میں، اور ہزاروں جگہوں سے خوبصورت کہانیاں بنائی جا سکتی ہیں۔" [۵۲] اس کے بعد تخلیق کار مزاج و کیفیت کے اعتبار سے پلاٹ کا انتخاب کرتا ہے۔ [۵۳] پریم چند نے اپنی کہانیوں کے محرکات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے: "کتھانک میں اس درشٹ سے چنتا ہوں کہ مانو چرتر میں جو کچھ سندر ہے، مردانہ ہے، وہ ابھر کر سامنے آجائے۔ یہ ایک الجھی ہوئی پرکریا ہے۔ کبھی کبھی اس کی پریرنا ایک وکیتی سے ملتی ہے یا کبھی کسی گھٹنا سے، یا کسی سوپن سے، لیکن میرے لیے ضروری ہے کہ میری کہانی کا کوئی منووگیانک آدھار ہو۔" [۵۴] اور پھر، موضوع اور کرداروں کا انتخاب کرنے کے بعد لکھنے میں سہولت ہو جاتی ہے: "پلاٹ

---

[۵۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ صنہ ۵
[۵۲] " : کچھ وچار ص۵
[۵۳] " : دودھ پرسنگ ج ۳ ص ۱۹
[۵۴] " : چٹھی پتری ج ۲ ص ۲۳۵

سوچ لینے کے بعد لکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن پلاٹ سوچ لینے کے بعد ہی چرتروں کی کلپنا بھی کرنی پڑتی ہے جس کے دوارا یہ پلاٹ پر درشت کیا جائے" [۵۱]

یہاں فن کار پریم چند کی تکنیکی یا تخلیقی قوت اظہار کا تجزیہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اُن کے تخلیقی عمل سے متعلق ان حقائق کا تجزیہ کرنا ہے، جو پریم چند کی ہندی اردو تخلیقات کی فنی بنیادوں کی وضاحت کر سکیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی تخلیقات اردو اور ہندی میں بکھری ہوئی ہیں، جن کو اردو والے اردو کی اور ہندی والے ہندی کی قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک دونوں طرح کی تخلیقات کو ایک رشتے میں منسلک کر کے تاریخی ترتیب کے اعتبار سے دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ابتدائی تخلیقات :

پریم چند کے تخلیقی نقطۂ آغاز کے متعلق مختلف و متعدد غلط فہمیاں ہیں، جن کی بنیاد پریم چند کے اپنے متضاد و متنوع بیانات ہیں، جن پر اعتماد کر کے ان کے اکثر و بیشتر ناقدوں اور سوانح نگاروں نے مفروضات کی عمارت تیار کی ہے یا پھر ان کا اپنا مخصوص ذہنی رویہ ہے، جو ان کی معذوری کو ان کی کوتاہی کی شکل عطا کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پریم چند کے بارے میں لکھنے والوں کی غالب اکثریت ہندی یا اردو میں کسی ایک زبان و ادب سے متعارف ہے اور دوسری زبان میں ان کی حیثیت نیازمندانہ سی رہتی ہے۔ اس معذوری کے سبب وہ مختلف طرح کے ماخذ کی آگہی نہیں رکھتے، جس سے تجزیے اور تنقید کا عمل تشنہ رہ جاتا ہے۔ اس کا انجام بسا اوقات متضاد و گمراہ کن بیانات کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

۱۔ "۱۹۱۵ء میں پریم چند کی پہلی ہندی کا موک کہانی 'پنچ پرمیشور' پرکاشت ہوئی" [۵۲]

---

[۵۱] پریم چند: وودھ پرسنگ ج ۳ ص ۲۲

[۵۲] سریش سنہا: ہندی کہانی ادبھو اور وکاس ص ۳۲۷

۲۔" پنچ پرمیشور' (سرسوتی ۱۹۱۶ء) ان کی پہلی کہانی ہے جو ہندی میں پرکاشت ہوئی"۔ ؎۱

۳۔" ان کی پہلی رچنا 'پنچ پرمیشور' ہی نئے یگ کی سوچ دینے میں سمرتھ ہوئی"۔ ؎۲

۴۔"ہندی میں ان کی کہانی 'سوت' (پہلی کہانی) مانی جاتی ہے"۔ ؎۳

۵۔" پریم چند کی پہلی ہندی رچنا 'ممتا' ہی ہے"۔ ؎۴

ان بیانات کی روشنی میں ان کی دو کہانیاں 'پنچ پرمیشور' اور 'سوت'، بہ یک وقت پریم چند کی پہلی تخلیق قرار پاتی ہیں جو کسی صورت میں درست نہیں ۔ ان دونوں کہانیوں میں اول الذکر کے بارے میں یقین ہے کہ یہ ہندی تخلیق نہیں ہے اور نہ پہلی بار ۱۹۱۵ء میں ہندی میں شائع ہوئی۔ یہ کہانی پہلی بار اردو ماہنامہ 'زمانہ' میں مئی جون ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ہندی ترجمہ پریم چند نے 'سرسوتی' کو بھیجا تھا جسے پنڈت مہابیر پرساد دویدی نے ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ 'ممتا' کے زمانہ اشاعت کے متعلق دلچسپ صورت حال ہے اس کی بنیاد سدرشن کا ایک بیان ہے۔ پہلے وہ بیان ملاحظہ ہو، سدرشن لکھتے ہیں:
"۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہے میں نے کان پور کے پرسدھ ماسک 'زمانہ' میں پریم چند کی پہلی کہانی 'ممتا' پڑھی۔ (اردو میں کہانی کا نام 'ممتا' نہیں 'ماممتا' ہے!) اور پڑھ کر اچھل پڑا"۔ ؎۵ اس سے یہ مفروضہ وجود میں آگیا کہ 'ممتا' ہی پریم چند کی پہلی کہانی ہے۔ حالاں کہ سدرشن کے اسی مضمون میں نواب رائے کے نام سے 'سوز وطن' کی اشاعت کا ذکر موجود ہے غالباً انھوں نے 'ممتا' کا ذکر پریم چند کی تخلیقات سے خود اپنے پہلی بار واقف ہونے کی ضمن میں کیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے بعد زعمائے ادب اور محققین کرام نے

؎۱ رام رتن بھٹناگر: کلاکار پریم چند ص۳۱

؎۲ جتیندر ناتھ پاٹھک: کتھاکار پریم چند ص۳۶

؎۳ شیلا گپت: پریم چند اور ان کا ساہت ص۱۳۴

؎۴ راجیشور گرو: پریم چند ایک ادھین

؎۵ سدرشن: سمرتیاں، ہنس سمرتی انک ۱۹۳۷ء

کسی تلاش وجستجو کے بغیر اپنے اپنے تحقیقی مقالوں میں 'ممتا' کو پریم چند کی پہلی کہانی تحریر کرنا شروع کر دیا۔ غالباً ہندی والوں میں امرت رائے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے پریم چند کے بارے میں مختلف شواہد و حقائق کو دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

پریم چند نے اپنے تخلیقی نقطہ آغاز کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے ایک رشتے کے ماموں (جن کا نام امرت رائے نے روپ نرائن بتایا ہے) [۱] کی داستان عشق ڈرامے کی شکل میں لکھی تھی۔ اس وقت پریم چند کی عمر صرف ۱۳ (تیرہ) سال کی تھی۔ یہ تخلیق کہیں شائع نہیں ہوئی اور اُسے خود پریم چند نے نذر آتش کر دیا تھا [۲] اس لیے اُسے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ پریم چند ۲۹ر جنوری ۱۹۲۱ء کو امتیاز علی تاج کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "ہاں، ہم خرما وہم ثواب' 'کشنا' وغیرہ میری ابتدائی تصانیف ہیں۔ پہلی کتاب تو لکھنؤ کے نول کشور پریس نے شائع کی تھی۔ دوسری کتاب بنارس کے میڈیکل ہال پریس نے یہ غالباً ۱۹۰۰ء کی تصانیف ہیں۔" [۳] ایک دوسرے مکتوب میں ۱۷ جولائی ۱۹۲۶ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "۱۹۰۱ء میں لٹریری زندگی شروع کی۔ رسالہ زمانہ میں لکھتا رہا۔ کئی سال تک متفرق مضامین لکھے۔ ۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول 'پریما' لکھ کر انڈین پریس سے شایع کرایا۔ ۱۹۱۲ء میں 'جلوہ ایثار' اور ۱۹۱۸ء میں 'بازار حسن' لکھا۔" [۴] لیکن اپنے 'جیون سار' میں لکھتے ہیں: "ڈاکٹر رو ندر ناتھ کی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں، ان میں کچھ کا انواد کیا، پہلا اپنیاس تو میں نے ۱۹۰۱ء میں لکھنا پرارمبھ کیا تھا۔ میرا ایک اپنیاس ۱۹۰۲ء میں پرکاشت ہوا اور دوسرا ۱۹۰۴ء میں۔" [۵]

آخر الذکر دو بیانات میں ۱۹۰۱ء سے ادبی زندگی کے آغاز کا ذکر ہے لیکن

---

[۱] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۳۴
[۲] پریم چند: میری پہلی رچنا، کفن، ص ۴۹
[۳] پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۲۹
[۴] ،، : ج ۱ ص ۱۶۱
[۵] ،، : جیون سار، ہنس فروری ۱۹۳۲ء

اولین ناول کے زمانۂ تصنیف کے تعین میں اختلاف ہے۔ ایک میں ۱۹۰۴ء میں 'پریما' لکھنے اور شایع کرنے کا تذکرہ ہے دوسرے میں اس کے قبل ۱۹۰۲ء میں لکھنے کا۔ اگر ۱۹۰۴ء میں 'پریما' کی اشاعت فرض کرلی جائے تو یہ پریم چند کی دوسری تصنیف ہوگی لیکن ۱۹۰۲ء کی پہلی تصنیف کا معمّہ باقی رہ جائے گا۔ اگر پہلے مکتوب کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو 'ہم خرما و ہم ثواب' اور 'کشنا' ۱۹۰۰ء کی اشاعتیں قرار پاتی ہیں اور پھر بھی پریم چند کی بالترتیب پہلی اور دوسری تخلیقات بھی ہوں گی، جو صحیح نہیں ہے۔ پریم چند کی تخلیقات کے زمانے کی تعیین میں ڈاکٹر اندر ناتھ مدان کے نام ۷ ستمبر ۱۹۳۴ء کے مکتوب پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے: "میرا پہلا لیکھ ۱۹۰۱ء میں اور میری پہلی کتاب ۱۹۰۳ء میں چھپی۔ اس ساہتیہ رچنا سے مجھے اپنے اہنکار کی تشٹی کے علاوہ اور کچھ نہ ملتا تھا۔ پہلے میں سم سامیک گھٹناؤں پر لکھتا تھا۔ پھر ورتمان اور ایتہاسک ویروں کے چرتروں کے اسکیچ"[۵]

متذکرہ بالا مکتوب کی بنیاد پر ڈاکٹر کمل کشور گوئینکا نے ۱۹۰۳ء میں پریم چند کے اولین ناول کے کتابی شکل میں شائع ہونے کا سوال اٹھایا ہے جو غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ یہاں جن تخلیقات کا ذکر ہے، وہ پریم چند کے ناول یا کہانی نہیں ہیں بلکہ مختصر مضامین ہیں، جو بعد میں 'باکمالوں کے درشن' کے نام سے الہ آباد کے رام نرائن لال نے شائع کیا۔ پریم چند کی فراہم کردہ دیگر اطلاعیں بھی صداقت سے بعید ہیں۔ پریم چند کی پہلی تخلیق کا تعین کرتے ہوئے، اس مسئلے پر روشنی ڈالی جاچکی ہے اس لیے یہاں تکرار بے سود ہے۔

پریم چند کی ابتدائی تخلیقات کے بارے میں پریم چند ادبیات کے ماہرین و محققین نے مختلف و متضاد خیالات ظاہر کیے ہیں، جن میں بعض بیانات حسب ذیل ہیں:

ڈاکٹر اندر ناتھ مدان پریم چند کے ابتدائی ناولوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اسرار محبت' (۱۸۹۸ء) کے ایک سنچھپت اپنیاس جو بنارس کے ساپتاہک 'آوازِ خلق' میں کرم شہ پر کاشت ہوا... پرتاپ چند (۱۹۰۱ء) جو اپنے اصلی روپ میں کبھی

---

[۵] پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۲۳۴

پرکاشت نہیں ہوا" ۵۱ اور ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر کے قول کے مطابق: "اسرار محبت' (۱۸۹۸ء)" ان کا پہلا اپنیاس تھا جو' ۱۹ ویں شتابدی کے اپنے انیک اپنیاسوں کی طرح بنارس کے ایک ساپتاہک پتر میں کرم شہ پر کاشت ہوا.... کداچت، پرتاپ چند (۱۹۰۱ء) اپنیاس بھی اردو ہی کی رچنا تھی۔ پرنتو اس روپ میں کبھی پرکاشت نہیں ہوا"۵۲

پریم چند کے جگری دوست منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں: "جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا پریم چند جی کا سب سے پہلا ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' کے نام سے بابو مہادیو پرشاد ورما لکھنوی کے اہتمام سے.... ہلکے کاغذ پر معمولی لکھائی چھپائی میں شائع ہوا تھا۔ مصنف کی پہلی تصنیف ہونے کی حیثیت سے اس میں نومشقی کی اکثر خامیاں موجود تھیں۔" ۵۳

منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب کے خیال میں" ہندی میں ان کا پہلا ناول 'پریما' اور اردو میں 'پرتاپ چندر'، جو دھنپت رائے کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔" ۵۴ یہ بحث بعد میں آئے گی کہ 'پرتاپ چندر' کی اصل حقیقت کیا ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 'پریما' کے مصنف کا نام دھنپت رائے نہیں، نواب رائے شائع ہوا تھا۔ محمد عمر خاں نے بھی اپنے مضمون میں 'پرتاپ چندر' کو پریم چند کا اولین ناول قرار دیا ہے۔ ۵۵ اسی خیال کی تکرار ڈاکٹر عبیداللہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں کی ہے۔ ۵۶ پریم چند کی شریک حیات شیورانی دیوی کے بیان کے مطابق ان کا اولین ناول 'کشنا' ہے۔ ۵۷

پریم چند کے ایک دوسرے رفیق کار منشی پیارے لال شاکر نے آخرالذکر بیان کی تائید کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: "میرے کانپور آنے سے ڈیڑھ برس قبل ان کا پہلا ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' شائع ہوا.... انھیں خود بھی یہ ناول پسند تھا۔ اس کے بعد

---

۵۱ اندر ناتھ مدان: پریم چند' ایک ودیچن ص ۱۸۰

۵۲ رام رتن بھٹناگر: کلاکار پریم چند ص ۳۰

۵۳ دیا نرائن نگم: پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات، زمانہ' پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۵۴ جگیشور ناتھ ورما بیتاب: منشی پریم چند مرحوم، زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۵۵ محمد عمر خاں: آج کل دہلی اپریل ۱۹۵۳ء

۵۶ عبیداللہ: تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ، ڈی، ڈگری، پنجاب یونیورسٹی لاہور ص ۲۴۹

۵۷ شیورانی دیوی: پریم چند گھر میں ص ۵۰

انھوں نے اس کا ہندی ترجمہ کیا اور اس کا نام پریما رکھا" [۱] ان بیانات کی روشنی میں پریم چند کے اولین ناول کے بارے میں ان کے مندرجۂ ذیل ناولوں کے نام لیے جا سکتے ہیں:

۱۔ 'ہم خرما و ہم ثواب'، جو پریم چند اور اُن کے دو رفقائے کار کے مطابق ان کی تخلیق کا نقش اول ہے۔

۲۔ 'کشنا'، جو نایاب ہے۔ پریم چند کی رفیقۂ حیات شیورانی دیوی کے قول کے مطابق ان کا اولین ناول ہے۔

۳۔ 'اسرار محبت'، جسے پریم چند کے ادبیات کے دو مستند محققوں نے پہلا ناول قرار دیا ہے۔

۴۔ 'پرتاپ چند'، جو سراسر ناپید ہے لیکن اس کا ذکر بعض ناقد و محقق کرتے رہتے ہیں۔ منشی جگیشور ناتھ ورما نے اس کا شایع ہونا بھی بیان کر دیا ہے لیکن جس طرح ان کے بیان کا ایک جزو صحیح نہیں ہے، منطقی اعتبار سے دوسرا جزو بھی غلط قرار پاتا ہے۔ 'پرتاپ چند'، کے اردو میں شائع ہونے کا ثبوت کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ملتا۔ ڈاکٹر اندر ناتھ مدان اور ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر نے اردو اشاعت کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ان کا بیان ہے کہ یہ متنازعہ ناول شایع نہیں ہوا۔ اس کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔ ان محققوں نے اپنی تحقیق، تلاش یا اطلاع کے ماخذ کا ذکر بھی نہیں کیا۔ لہذا پریم چند کے کسی 'پرتاپ چند'، نامی تخلیق کو تسلیم کرنے میں شبہات لازمی اور ناگزیر ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ انھیں 'جلوۂ ایثار کے کردار' پرتاپ چند'، کے نام کی یکسانیت سے مغالطہ ہوا ہے۔ بغیر کسی ثبوت کے یہ کہنا کہ پریم چند نے اس عنوان سے ایک ناول لکھا یا لکھنے کا ارادہ کیا تھا، مناسب نہیں ہے۔ اس پر مزید ستم ہوا کہ یہ مغالطہ دیگر کئی محققین کی سہل انکاری کی بنا پر قبولیت حاصل کر گیا۔ جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

پریم چند کے بیانات سے قطع نظر دوسرے ذرایع سے ان کی تصانیف کے زمانوں کا تعین کیا جائے تو متعدد دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ رسالہ 'زمانہ' میں 'کشنا'، کا پہلا اشتہار اگست ۱۹۰۷ء میں اور تبصرہ اکتوبر نومبر ۱۹۰۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'پریما'، پر سال اشاعت ۱۹۰۷ء درج ہے۔ یہ ان کے اردو ناول

---

[۱] پیارے لال شاکر: منشی پریم چند کی یاد۔ زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

'ہم خرما و ہم ثواب' کا ہندی ترجمہ ہے اور دوسرا ایڈیشن نول کشور پریس میں شائع ہوا۔ لیکن اُن میں کسی پر سن اشاعت درج نہیں ہے البتہ اس کا ایک اشتہار ستمبر ۱۹۰۶ء کے 'زمانہ' میں ملتا ہے۔ ان سب کے علاوہ اُن کا وہ ناول بھی ہے۔ جو بہت دنوں تک 'اسرار محبت'، کے نام سے پریم چند کا اولین ناول فرض کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سُنی سُنائی باتوں پر بغیر کسی تحقیق و جستجو کے بھروسہ کر لینے کی مضحکہ خیزی کی نادر مثال ہے۔ اب یہ ناول امرت رائے کی مساعی سے ہندی میں شائع ہوگیا ہے۔ اس ناول کا صحیح نام 'اسرار معابد'، ہے جو ۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء سے یکم فروری ۱۹۰۴ء تک بنارس کے اردو ہفتہ وار 'آوازہ خلق'، میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔

مذکرہ بالا حقائق کی روشنی میں 'اسرار معابد'، کو پریم چند کا اولین ناول قرار دینا درست ہوگا کیوں کہ اس کے قبل کسی دوسری افسانوی تخلیق کی اشاعت کا ثبوت نہیں ملتا۔ ستمبر ۱۹۰۶ء میں 'ہم خرما و ہم ثواب'، کے اشتہار سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ یہ ان کی دوسری تصنیف ہوگی، پریم چند نے اپنے جس ناول 'پریما'، کے ۱۹۰۴ء کی اشاعت کو اپنی دوسری تخلیق قرار دیا ہے۔ وہ ان کے اردو ناول 'ہم خرما و ہم ثواب'، کا ہندی ترجمہ ہے۔ 'پریما' کی اشاعت ۱۹۰۴ء میں نہیں ہوئی۔ امرت رائے کا اندازہ ہے کہ غالباً 'پریما'، کا سال تصنیف ۱۹۰۴ء ہے[۱] لیکن انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل نہیں دی اس لیے اُن کے بیان کو تسلیم کرنے میں تامّل ہے۔ دراصل پریم چند نے 'پریما' کے بجائے 'ہم خرما و ہم ثواب'، کا سال اشاعت ۱۹۰۴ء بیان کیا تھا چوں کہ 'پریما' 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ترجمہ ہے، اس لیے ان کا بیان بے محل نہیں تھا۔ 'ہم خرما و ہم ثواب'، کے ایڈیشن پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے، اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۰۴ء 'ہم خرما ہم ثواب' کا سال تصنیف و اشاعت ہے۔ 'پریما' کی اشاعت ہندی میں انڈین پریس الٰہ آباد سے ۱۹۰۷ء میں ہوئی لیکن اس وقت تک پریم چند ہندی لکھنے کی اتنی مہارت پیدا نہیں کرسکے تھے کہ ہندی میں کوئی تخلیق کرسکتے یا اس کا ترجمہ کرتے۔ اس لیے 'پریما'، کے پریم چند کی ہندی تخلیق ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ اس مسئلے پر آئندہ صفحات

---

[۱] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۶۵۳

میں تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

مناسب ہوگا کہ 'ہم خرما و ہم ثواب' کو پریم چند کا دوسرا ناول قرار دیا جائے لیکن یہ مدنظر رہے کہ پریم چند اپنی تصانیف کے اشتہار و تبصرہ کے لیے شدت سے کوشاں رہتے تھے اور منشی دیا نرائن نگم اور اُن کے درمیان انتہائی پرخلوص تعلقات کے پیش نظر حیرت انگیز بات ہے کہ دو سال تک اس ناول کا اشتہار یا اس پر تبصرہ 'زمانہ' میں کیوں شائع نہیں ہوا؟

'کشنا' کو زمانہ میں نومبر ۱۹۰۷ء کے تبصرے کی بنیاد پر تیسرا ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔ روٹھی رانی کی قسط وار اشاعت بھی 'زمانہ' میں اپریل ۱۹۰۷ء سے اگست ۱۹۰۷ء تک ہوئی۔ کتابی صورت میں اس کی اشاعت بعد میں ہوسکی۔ ہمارے نزدیک اب تک کی فراہم شدہ معلومات کی بنیاد پر اسے پریم چند کا چوتھا ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔

پریم چند کی ابتدائی کہانیوں کے زمانہ تصنیف و اشاعت کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے بیانات کو صرف نظر نہیں کرنا چاہیے، جن میں انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء قرار دیا ہے۔ جس کا ذکر ہوچکا ہے یہاں کہانیوں کے بارے میں پریم چند کا بیان ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں: "پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں میں نے کہانیاں لکھنا پرارمبھ کیا، ڈاکٹر رویندر ناتھ کی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں ان میں کچھ کا انوواد کیا۔۔۔۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا — دنیا کا سب سے انمول رتن، وہ ۱۹۰۷ء میں زمانہ میں پرکاشت ہوئی۔ اس کے بعد میں نے زمانہ میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں۔ ۱۹۰۹ء میں پانچ کہانیوں کا سنکلن 'سوز وطن' کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے پرکاشت ہوا"[۵۱] اسی طرح کے خیالات کا اظہار پریم چند ڈاکٹر اندر ناتھ مدان کے نام ۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کے مکتوب میں کرتے ہیں۔ "۱۹۰۷ء میں، میں نے اردو میں کہانیاں لکھنا پرارمبھ کیا۔ اور نرنتر سپھلتا ملتے رہنے سے میں نے لکھنا جاری رکھا۔"[۵۲] ان واضح بیانات میں

---

۵۱ پریم چند: جیون سار، ہنس فروری ۱۹۳۲ء
۵۲ پریم چند: مکتوب بحوالہ اندر ناتھ مدان: پریم چند: ایک وویچن ص ۱۷۷

غلط بیانی کا احساس کیسے ہو سکتا ہے! اردو ہندی محققین ادب نے پریم چند کے بیانات پر اعتماد کرکے اُسی کو من وعن دہرا دیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر لکھتے ہیں: "سنسار کا سب سے پہلا انمول رتن'، ۱۹۰۰ء میں زمانہ میں پرکاشت ہوئی"، ایک دوسری جگہ مکرر لکھتے ہیں:" پریم چند کی پہلی کہانی سنسار کا سب سے انمول رتن ہے" ۵۲ ڈاکٹر شیلا گپت کا بیان ہے:" اردو میں ۱۹۰۷ء سے لیکھن کا کاریہ آرمبھ کر دیا تھا" ۵۳ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ پریم چند کی کہانی 'دنیا کا سب سے انمول رتن'، زمانہ میں شائع نہیں ہوئی۔ اُن کی کہانیوں کے اولین مجموعہ 'سوز وطن'، کی اشاعت ۱۹۰۹ء میں نہیں ہوئی۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں 'زمانہ' میں اس کے اشتہار کی بنیاد پر 'سوز وطن' کی اشاعت جون ۱۹۰۸ء قرار دی جا سکتی ہے۔ اس مجموعہ میں پانچ کہانیاں شامل تھیں: (۱) دنیا کا سب سے انمول رتن، (۲) شیخ مخمور (۳) یہی میرا وطن ہے۔ (۴) صلۂ ماتم اور (۵) عشق دنیا اور حب وطن۔

ان کہانیوں میں تنہا آخری کہانی 'عشق دنیا اور حب وطن'، 'زمانہ' کے شمارہ اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی۔ باقی چار کہانیاں رسالہ 'زمانہ' میں شائع نہیں ہوئیں۔ غالباً پہلی بار 'سوز وطن' کے نام سے کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آئیں — یہ کتاب انگریزی سرکار کو "سڈیشن" (اشتعال) نظر آئی اور بحق سرکار ضبط کرلی گئی۔ لیکن اس سے پریم چند کی ادبی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئیں۔ ۱۳ مئی ۱۹۱۰ء میں منشی دیا نرائن نگم کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں: "نواب رائے تو غالباً کچھ دنوں کے لیے جہان سے گئے۔ دوبارہ یاد دہانی ہوئی ہے کہ تم نے معاہدہ میں گو اخباری مضامین نہیں لکھے مگر اس کا منشا ہر قسم کی تحریر سے تھا۔ گویا میں کوئی مضمون ، خواہ کسی مضمون پر ــــ ہاتھی دانت ہی پر کیوں نہ ہو ــــ لکھوں،

---

۵۱ رام رتن بھٹناگر: پریم چند صـ ۲۵۴

۵۲ " " : کلاکار پریم چند صـ ۳۶۷

۵۳ شیلا گپت: پریم چند اور ان کا ساہتیہ صـ ۱۳۴

مجھے پہلے وہ جناب فیض مآب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا پڑے گا"[۵۱]
ظاہر ہے کہ اس طرح سے کام نہیں چل سکتا تھا نہ منشی دھنپت رائے لکھنے سے باز آنے والے تھے اور نہ منشی دیا نرائن نگم ان کو بخش دینے کو تیار تھے۔ نتیجہ میں درمیانی راہ نکالی گئی کہ کسی دوسرے نام سے تصنیف کا کام جاری رکھا جائے۔ نئے نام کے انتخاب کی ذمہ داری منشی دیا نرائن نگم پر آئی۔ انھوں نے 'پریم چند' نام تجویز کیا، جو دھنپت رائے کو پسند آیا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "پریم چند اچھا نام ہے، مجھے بھی پسند آیا۔ افسوس یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں نواب رائے کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی، وہ سب اکارت گئی یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لنڈورے رہے اور شاید رہیں گے!"[۵۲] اور پھر پریم چند پہلی بار اپنی کہانی 'بڑے گھر کی بیٹی' کے ساتھ زمانہ میں نمودار ہوئے۔ اُس کے بعد سے پریم چند نام اُن کے افسانوی ادب کے لیے مخصوص ہوگیا۔ منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "ایجوکیشنل گزٹ میں پریم چند نام نہیں دینا چاہتا۔ معلوم نہیں یہ حضرت ہاتھ پیر سنبھالنے پر کیا لکھیں، پڑھیں۔ انھیں قصہ گو رہنے دیجیے۔ بیٹھے بیٹھے پریم اور ویر رس کے قصے لکھا کریں۔"[۵۳]

'عشق دنیا اور حب وطن' کی اشاعت، اور پریم چند نام اختیار کرنے کے درمیان ان کی صرف چار کہانیاں شائع ہوئیں جن میں 'رگناہ کا اگن کنڈ' مارچ ۱۹۱۰ء کے زمانہ میں 'افسانہ کہن' کے فرضی نام سے شائع ہوئی۔ 'رانی سارندھا' اگست، ستمبر ۱۹۱۰ء کے 'زمانہ' میں قسط وار شائع ہوئی لیکن اس میں مصنف کا نام صیغۂ راز میں رہا۔ اسی طرح 'سیر درویش' بھی 'زمانہ' اپریل، مئی جون ۱۹۱۰ء میں قسط وار شائع ہوئی۔ لیکن درمیان کے صرف ایک شمارہ میں مصنف کی حیثیت سے نواب رائے نام شایع ہوا 'بے غرض محسن' عنوان کی کہانی الہ آباد کے اردو ماہنامہ 'ادیب' میں شایع ہوئی جس میں مصنف کا نام 'د۔ ر' درج کیا گیا۔

---

[۵۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۷
[۵۲] پریم چند: مکتوب بحوالہ دیا نرائن نگم: پریم چند کی باتیں: زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷
[۵۳] ایضاً

اسی طرح پریم چند کے نام سے پہلی تخلیق کی اشاعت کے بارے میں مختلف طرح کے شکوک پیدا ہو سکتے ہیں لیکن امرت رائے کے خیال میں 'بڑے گھر کی بیٹی' پہلی کہانی ہے، جو پریم چند کے نام سے شائع ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں: "نواب رائے کے مرحوم ہونے کے چار پانچ مہینہ بعد ۱۹۱۰ء کے اکتوبر نومبر میں آکر پریم چند کا جنم ہوا۔ اس نئے کے ساتھ چھپنے والی پہلی کہانی 'بڑے گھر کی بیٹی' ہے" [۵۱] 'بڑے گھر کی بیٹی' کی اشاعت کی تاریخ بیان کرنے میں امرت رائے کو تسامح ہوا ہے۔ یہ کہانی اکتوبر، نومبر ۱۹۱۰ء میں نہیں بلکہ 'زمانہ' کے ایک ہی شمارہ، دسمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے اعتراض کیا ہے کہ دسمبر ۱۹۱۰ء کے 'زمانہ' میں شائع ہونے کی بنا پر 'بڑے گھر کی بیٹی' کو اولیت کیوں عطا کی جائے جب اس سے تین ماہ قبل ستمبر ۱۹۱۰ میں 'بے غرض محسن' شائع ہو چکی تھی [۵۲] یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں پریم چند کے نام سے شائع ہونے والی پہلی کہانی کا مسئلہ ہے، نہ کہ اس وقت کے تمام ناموں کو شامل کر کے پہلی کہانی کا تعین کرنا ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے 'بے غرض محسن' ایک فرضی نام 'د۔ ر' کے ساتھ شائع ہو چکی تھی، پریم چند کے نام سے نہیں۔ اس مختصر سے وقفہ میں مختلف ناموں سے پریم چند کی کہانیاں شائع ہوتی رہیں، جو 'عشق دنیا اور حب وطن' سے شروع ہو کر 'بے غرض محسن' تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ صرف تین ماہ قبل اشاعت کی بنیاد پر کس طرح فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہی کہانی پہلے لکھی بھی گئی تھی۔ ہمارے خیال میں پریم چند کے نام سے شائع ہونے والی کہانیوں میں 'بڑے گھر کی بیٹی' کو اولیت حاصل ہے۔ مدن گوپال لکھتے ہیں: "پریم چند کے نام ہی میں کوئی جادو تھا۔ پریم چند کا نام اپناتے ہی کوہ قاف کی پریاں، حاتم طائی کے قصے اور فارسی زدہ نثر کے اثرات سب کافور ہو گئے۔ 'بڑے گھر کی بیٹی' پریم چند کی اچھی کہانیوں میں شامل کی جاتی ہے۔" [۵۳] امرت رائے

---

[۵۱] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۱۱۳

[۵۲] قمر رئیس: تلاش و توازن ص ۱۸

[۵۳] مدن گوپال: قلم کا مزدور ص ۴۶

۱۱

کا بیان ہے کہ پریم چند کو اپنی تمام کہانیوں میں 'بڑے گھر کی بیٹی' سب سے زیادہ پسند تھی۔[۵۱] پریم چند کے نام سے ان کی کہانیوں کا پہلا اردو مجموعہ پریم پچیسی حصّہ اوّل کی اشاعت ۱۹۱۵ء میں شروع ہوئی اور حصّہ دوم کی اشاعت مارچ ۱۹۱۸ء میں ہوئی۔ ان کی کہانیوں کے ہندی اور اردو نام، ان کا زمانۂ اشاعت، ان کو پہلی بار شائع کرنے والے رسالے کا نام اور دیگر حقائق اگلے صفحات میں پیش کیے جائیں گے۔

ہندی میں اشاعت :

ہندی کے علمائے ادب میں یہ تصور عام ہے کہ پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کا سفر اردو سے شروع کیا تھا۔ لیکن اُس کے بعد انھوں نے بعض وجوہ کی بنا پر اردو سے اپنا تعلق منقطع کرلیا اور اردو کے بجائے ہندی کو اپنی زندگی کے آخری لمحات تک تخلیقی کاوشوں کی بنیاد بنائے رکھا۔ اس عرصے میں شاذ و نادر ہی اردو میں کچھ لکھا ہوگا۔ ڈاکٹر یگیہ دت شرما لکھتے ہیں: "منشی جی نے اپنا ساہتیہ آرمبھ میں اردو میں پرکاشت کیا تھا، پرنتو شیگھر ہی آپ نے ہندی ساہتہ کو اپنا لیا۔"[۵۲] یہ بیان انتہائی گمراہ کن اور صداقت سے کوسوں دور ہے اور پریم چند کے بارے میں مسخ شدہ تصور پیش کرتا ہے۔ اس پہلو پر زیرِ نظر کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں اس کا اعادہ کرنا مقصود نہیں لیکن اتنا عرض کردینا ضروری ہے کہ پریم چند اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنے خیالات پیش کرتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ آخری چند برسوں میں وہ ہندی (ہندی اتھوا ہندستانی) کی طرف زیادہ مائل ہوگئے تھے۔ لیکن اردو سے اُن کا تعلق آخر دم تک قائم رہا۔ پریم چند زندگی کے آخری لمحات تک اردو میں بھی لکھتے رہے۔ اردو مجلسوں میں اردو مصنف کی حیثیت سے شامل ہوتے رہے۔ اپنے خیالات اردو مصنف کی حیثیت سے اردو عوام کے سامنے پیش کرتے رہے جس میں مختلف مواقع پر ذہنی و فکری سطح پر انھیں شدید مخالفتوں کا سامنا بھی

---

۵۱ امرت رائے: پریم چند، قلم کا سپاہی ص۸۶

۵۲ یگیہ دت شرما: ہندی کے اپنیاس کار ص۴۷

کرنا پڑا کیوں کہ پریم چند کے زاویہ نظر سے اُس زمانے کے اردو کے کئی زعماء کے خیالات ہم آہنگ نہیں تھے۔ جن میں مولانا عبدالحق، سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن پریم چند ان لوگوں کے دبدبے سے مرعوب نہیں ہوئے اور اپنے خیالات انتہائی بے باکی، جراٴت، ولولہ انگیزی اور دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتے رہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو بولنے والوں کی اکثریت پریم چند کی ہم نوا، اور ان کے نظریات سے ہم آہنگ رہی۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں صرف اردو میں لکھا لیکن بعد میں نہ صرف یہ کہ ان کے ناول ہندی میں شایع ہوئے اور اُن کی کہانیوں سے ہندی رسالوں کی زینت بڑھی بلکہ انھوں نے رسائل کی ادارت اور نشر و اشاعت بھی کی۔ اس لیے یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ پریم چند کو ہندی کا ادیب قرار دینا چاہیئے یا اردو کا۔ یا دونوں کا۔ ان کے بعض ناولوں اور کہانیوں کے اردو مسودے موجود نہیں ہیں مگر متعدد ناولوں اور کہانیوں کے ہندی مسودات بھی ناپید ہیں۔ کہانیوں کے ضمن میں صورت حال مزید دلچسپ ہے کیوں کہ آج بھی پرانے اخبار و رسائل میں پریم چند کی ایسی کہانیاں مل جاتی ہیں جو اردو یا ہندی کسی ایک ہی زبان میں شائع ہوئی ہیں۔ اس طرح یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ پریم چند کی ابتدائی تخلیقات جو اردو میں شائع ہوئیں، ان کا ہندی ترجمہ خود پریم چند نے کیا یا کسی اور شخص نے۔ اگر اس کا ترجمہ خود پریم چند نے نہیں کیا، تو ان تخلیقات کو پریم چند کی ہندی تخلیق کی شکل میں قبول کرنا کہاں تک درست اور انصاف پر مبنی ہے؟ یہ اور اسی طرح کے مختلف اہم مسائل پریم چند کے اردو یا ہندی ادبیات کے مطالعہ میں سامنے آتے ہیں۔

پریم چند کا ہندی کی طرف راغب ہونا یا ان کی تخلیقات کی اشاعت کی نوبت اُس وقت آئی تھی، جب انھیں اردو میں ہر دلعزیزی اور مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ اُن کی کہانیاں اشاعتی اعزاز اور معاوضے کے ساتھ مقتدر و معروف اردو رسائل و اخبارات میں شائع ہوتی تھیں جن میں 'زمانہ'، کے علاوہ 'ہمدرد'، اور 'کہکشاں' قابل ذکر ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم کے معاوضہ ادا کرنے یا معاوضے کے لیے پریم چند

کے تقاضے کا ذکر ان کے متعدد مراسلات میں موجود ہے۔ امرت رائے نے تسلیم کیا ہے کہ اردو کے مختلف اخبار و رسائل سے پریم چند کو معاوضے ملتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اپنے اخبار 'ہمدرد' میں پریم چند کی کوئی کہانی شایع کرتے تو انھیں معاوضے کے طور پر ایک اشرفی مخمل کی ڈبیہ میں رکھ کر پیش کرتے ۵۱ منشی دیانرائن نگم لکھتے ہیں: " اردو میں مسٹر محمد علی نے اپنے اخبار 'ہمدرد' کے لیے کئی افسانے تیس روپے فی افسانہ کے حساب سے لکھائے تھے۔ دو ایک اور پرچوں نے یہی معاوضہ دیا۔" ۵۲ پریم چند نے ایک مکتوب میں خاص طور سے معاوضے کا ذکر کیا ہے: 'کہکشاں' اور 'صبح امید' مجھے ہر ایک قصہ کے پندرہ روپے دیتے ہیں۔ بعض چھوٹے قصوں کے دس روپے ہی لے لیتا ہوں۔ 'سوتیلی ماں' کے دس روپے ملے مگر 'خون حرمت' کے پندرہ روپے۔" ۵۳ لیکن پریم چند معاوضے کی شرح سے مطمئن نہ تھے۔ ۲۲ مئی ۱۹۱۴ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: " اردو کی ہوا آج کل بگڑی ہوئی ہے... جتنے موجودہ رسالے ہیں، ان میں کسی کو فروغ نہیں ہے، سب کتے کی زندگی جیتے ہیں۔" ۵۴ نتیجہ میں ہندی کی طرف متوجہ ہونے کی تمہید تیار ہوگئی۔ پریم چند، اُس زمانے کے دیگر اردو مصنفین سے زیادہ معاوضے حاصل کرنے کے باوجود اردو دنیا سے ناآسودہ رہے۔ انھیں اپنی مالی حالت کو بہتر کرنے کے لیے اردو میں تصنیف و تالیف کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اسی درمیان ان کی ملاقات پنڈت منن دویدی گج پوری سے ہوئی۔ جو ہندی زبان و ادب کے زبردست شیدائی تھے۔ پریم چند نے 'زمانہ' دسمبر ۱۹۲۱ء کے شمارے میں دویدی جی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ انھیں کے دیباچہ کے ساتھ ہندی میں کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'سپت سروج' شائع ہوا۔ غالباً انھیں کی تحریک پر ہندی کی طرف رغبت میں شدت پیدا ہوئی۔ امرت رائے کا بیان ہے: "اپنی

---

۵۱ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۱۵۳

۵۲ دیانرائن نگم، 'پریم چند کی باتیں'، زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۵۳ پریم چند: چیٹھی پتری ج ۱ ص ۸

۵۴ ایضاً ص ۳۱

اسی دماغی پریشانی اور چھٹپٹاہٹ کی حالت میں منشی جی کا دھیان پہلی بار بہت زوروں کے ساتھ ہندی کی اُور گیا۔ اردو اخباروں سے آمدنی کچھ خاص نہیں تھی۔ کتابوں کا بھی حال بُرا تھا۔ 'جلوۂ ایثار' سے سال بھر میں تیس روپے ملتے تھے۔ 'پریم پچیسی' چھپ کر تیار ہوتے ہوتے مہایدھ شروع ہو گیا جب کہ منشی جی کے شبدوں میں جنگ کی دھن میں شاید ہی کسی کو قصے کہانی کا شوق ہو۔" [۱]

اردو میں کس مپرسی کی شکایت کو اردو بیزاری نہیں قرار دینا چاہیے۔ کیونکہ پریم چند کی وابستگی میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اردو میں تخلیق کرنے کے علاوہ ترجمے کے لیے بھی تیار تھے۔ منشی دیا نرائن نگم کے نام ۱۹۱۳ء کے مکتوب میں یہ فقرے ملتے ہیں: "آپ مجھے اپنے ہندی ڈپارٹمنٹ کا ایڈیٹر سمجھیے میں اخبارات و رسائل سے مناسب اور دلچسپ ترجمے کر دیا کروں گا۔ کہیں ان پر نوٹ اور تنقید لکھوں گا" [۲] اسی زمانے میں پریم چند کانپور کے آریہ سماجی ہندی رسالہ 'پرتاپ' کے مدیر گنیش شنکر ودیارتھی کے نزدیک آئے اور متاثر ہوئے جن کا ذکر انھوں نے اپنی رفیقۂ حیات شیورانی دیوی سے کیا تھا [۳] منشی دیا نرائن نگم کے نام ۴ ستمبر ۱۹۱۴ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "پرتاپ کے اصرار سے مجبور ہو کر ایک مختصر سا قصہ ہندی میں اس کے وجے دشمی نمبر کے لیے لکھا ہے، ہندی لکھنی تو آتی نہیں مگر کچھ قلم توڑ موڑ دیا ہے" [۴] اور پھر قلم کو توڑنے مروڑنے کی کوشش سال بھر جاری رہی۔ تقریباً ایک سال بعد انھوں نے یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو منشی دیا نرائن نگم کو اطلاع دی: "ہندی ترجمے کے لیے کئی جگہ سے اصرار ہوا ہے اور میں خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لوں گا... اردو میں اب گذر نہیں ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کردوں گا۔ اردو نویسی میں کس ہندو کو فیض ہوا ہے جو مجھے ہو جائے گا۔" [۵] اس جذبہ کے پس پشت اردو میں اقلیت کی حیثیت سے اکثریت

---

۱ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۱۵۰

۲ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۷

۳ شیورانی دیوی: پریم چند گھر میں ص ۲۴

۴ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۳۶

۵ ایضاً ص ۴۶

کی بے انصافیاں برداشت کرنے کا المیہ ہے۔ جس میں نام نہاد مذہب کی بنیادوں پر تخلیق کاروں اور فن کاروں کی مقبولیت کا معیار متعین ہوتا تھا۔ پریم چند ذاتی سطح پر محسوس کرتے تھے کہ ان سے بدرجہا کم صلاحیتوں کے ادیبوں کو ادبی وقار کے ساتھ اخبار و رسائل میں جگہ ملتی اور انھیں آخیر میں بھرتی کے طور پر شامل کیا جاتا۔ اس مکتوب کے آخری فقرے غمازی کرتے ہیں کہ پریم چند کو ہندی کی طرف متوجہ کرنے میں صرف ان کی معاشی حالت یا اپنی تخلیقات کے لیے قارئین کا وسیع تر حلقہ مہیا کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ پریم چند اپنے دور کے حالات اور سیاسی و سماجی کیفیات کی کشمکش میں آریہ سماج کی طرف نہ صرف رجوع ہو گئے تھے بلکہ اس کی سرگرمیوں میں عملی تعاون کرنا چاہتے تھے۔ ان کے ایک مکتوب میں ان کے آریہ سماجی رکن ہونے کا ذکر ہے جو ۶ رفروری ۱۹۱۳ء کو منشی دیا نرائن نگم کے نام لکھا گیا: "مجھے اس وقت (روپوں) چنداں ضرورت نہیں، مگر میرے ذمے ہمیر پور آریہ سماج کے دس روپے باقی ہیں بار بار تقاضا ہوا ہے مگر اپنی تہی دستی نے اجازت نہ دی کہ ادا کردوں۔ اگر آپ afford کر سکیں تو براہ راست میرے نام سے ہمیر پور آریہ سماج کے سکریٹری کے نام دس روپے کا منی آرڈر کردیں ..... یہاں اب جلسہ بھی عنقریب ہونے والا ہے۔" [۵۱]

اردو سے کسی ہندو کو فیض نہ پہنچنے کی شکایت اور پریم چند کے قلم سے ایسے قبول کرنے کو دل نہیں چاہتا! امرت رائے نے اس کی ذمہ داری آریہ سماجی ذہنیت کے سر ڈال دی ہے: "کاہے کو ٹھیس لگ گئی منشی جی کو جو یہ آخری جملہ اُن کی قلم کی نوک پر اُتر آیا؟ کہیں ہندو وتو کی اس وشیش گندھ کے پیچھے اُن کے تت کالین آریہ سماجی من کا سنسکار تو نہیں ہے۔" [۵۲] لیکن یہ تنہا واقعہ نہیں ہے۔ اس طرح کے جذبات کا اعادہ پریم چند نے متعدد موقعوں پر کیا ہے۔ منشی دیا نرائن نگم نے ایک اردو اخبار نکالنے کا ارادہ کیا اور پریم چند سے مشورہ کیا تو انھوں نے بغیر کسی تکلف کے یہ فقرے اپنے یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھ کر ارسال کر دئے: "نام ہندو بہت

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۷

۵۲ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۱۵۲

موزوں تھا۔ لیکن شاید اس نام کا کوئی پرچہ پنجاب سے نکلنے لگا ہے ..... اخبار کا نمونہ کامریڈ ہی ہو۔ پالیسی ہندو ہو۔ اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتقاد نہیں رہا اور اس کی کوشش فضول ہے۔" ۵۱ اسی طرح ۱۹۲۴ء میں جب اُن کے ڈراما 'کربلا' کو بعض مسلمانوں نے ناپسند کیا تو پریم چند کو اس میں مذہبی عصبیت کی کارفرمائی نظر آئی۔ انھوں نے منشی دیا نرائن نگم کو لکھا: "اگر مسلمانوں کو یہ بھی منظور نہیں ہے کہ کسی ہندو کی زبان و قلم سے اُن کے کسی مذہبی پیشوا یا امام کی مدح سرائی بھی ہو تو میں اس کے لیے مُصر نہیں ہوں ... شیعہ حضرات اگر مذہبی پیشوا کی مثنوی پڑھتے ہیں، افسانے پڑھتے ہیں، مرثیہ سنتے ہیں تو انھیں ڈرامے سے کیوں اعتراض ہو؟ کیا اس لیے کہ ایک ہندو نے لکھا ہے!" ۵۲

پریم چند غصّے اور جھلاّہٹ میں اس حقیقت کو نظر انداز کر گئے کہ عزاداریٔ امام حسین میں ہندوستان کے بیشتر فرقے برابر سے شریک ہوتے ہیں۔ لکھنؤ کے اہم ترین مرثیہ گویوں میں چھنّو لال دلگیر کا نام نہایت احترام و عقیدت سے لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مشہور مرثیہ گو بھی غیر مسلم ہوئے ہیں مثلاً نانک چند نانک، کنور سین مضطر، راجا الفت رائے الفت وغیرہ۔ شمالی ہند میں ہندو راجا مہاراجے بڑے انہماک، ذوق و شوق، اور عقیدت مندی سے تعزیہ داری کرتے رہے ہیں۔ افتخار الدولہ راجا میوہ رام کا عزاخانہ سلاطین اودھ کے دور میں پورے ملک میں ممتاز تھا۔ ۵۳

پریم چند کی ادبی زندگی کی ابتدائی دو دہائیوں میں ملک مختلف طرح کے سیاسی حالات میں گرفتار رہا۔ جن میں منٹو مارلے اصلاحات کو خصوصی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ اس نے جداگانہ طریقۂ انتخاب کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو وسیع تر

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۳۱

۵۲ ایضاً ص ۱۴۶

۵۳ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مسیح الزماں: اردو مرثیہ کا ارتقاء، کمال الدین حیدر: سوانحیات سلاطین اودھ حصہ اول، برق سیتاپوری: تذکرۂ بحرِ سخن، سفارش حسین: اردو مرثیہ، جعفر رضا: دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی، صفدر حسین: لکھنؤ کی تہذیبی میراث، رشید موسوی: دکن میں مرثیہ اور عزاداری وغیرہ

کرنے کی سعئ لاحاصل کی۔ حالانکہ اس وقت اس کی مخالفت کسی نے نہیں کی بلکہ وقتی طور پر ہی سہی ترکی کے مسئلہ خلافت کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یگانگت و یک جہتی بھی نظر آئی لیکن عبداللہ یوسف علی کا خیال ہے کہ ہندوؤں سے مسلمانوں کی دلچسپی کا سبب اہل یورپ کے خلاف مسلمانوں کا ردعمل تھا۔ [1] اور ڈاکٹر عابد حسین کے خیال میں اس ہم آہنگی کا سبب مہاتما گاندھی کی پرکشش شخصیت تھی [2] اس میل جول کے اسباب پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ دراصل یہ قربت وقتی تاثرات کا نتیجہ تھی، جو تھوڑے دنوں کے بعد ختم ہوگئی۔ انگریزوں کی کوششوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے۔

پریم چند کے ہندی کی طرف متوجہ ہونے کو ملک میں سیاسی وسماجی حالات میں نشوونما پانے والے ماحول وحالات کے پس منظر میں دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جنھیں فراموش کرکے صحیح فیصلے تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ وہ اپنی ادبی زندگی کی ابتدائی دو دہائیوں میں تذبذب میں گرفتار شخص کی طرح آریہ سماج اور تحریک آزادی کے گرد وپیش چکر لگاتے رہے۔ ان کا مزاج عام ہندوستانی کی طرح سادہ و بے لوث تھا۔ جو روز وشب کی نیرنگیوں میں گرفتار ہوکر تغیرات سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے۔ کبھی حالات کی ستم ظریفیوں کو نوشتۂ تقدیر قرار دیتا ہے اور تن بہ تقدیر ہوکر خود کو حالات کے سپرد کردیتا ہے۔ کبھی انجام سے بے خبر، مصالح سے بے نیاز اور صحیح صورت حال سے ناواقف ہوکر جذبات کو عملی دنیا سمجھنے لگتا ہے۔ اُسے عمل کبھی آگے کی طرف بڑھاتا ہے اور کبھی پیچھے واپس کرتا ہے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں گویا سُراب کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ تذبذب میں گرفتار یہ عام انسان سرزمین ہند کے مختلف علاقوں میں نظر آئے گا۔ پریم چند ان لوگوں میں نہیں تھے جو دقیانوسی ہوکر ایک عالم پر قناعت کرلیتے ہیں۔ وہ کبھی اس راہ پر گام زن ہوئے تو کبھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے ہندو مسلم اختلاف کی خلیج

---

[1] عبداللہ یوسف علی: انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ ص۲۶۲

[2] عابد حسین: قومی تہذیب کا مسئلہ ص۲۲۸

کو شدید کرب و اضطراب کے ساتھ دیکھا اور جب وقت آیا تو اسے حتی الوسع اپنی شخصیت کی ہمہ گیری کے ساتھ پاٹنے کی کوشش کی۔ انھوں نے فرقہ واریت کی دہکتی ہوئی آگ سے نہ صرف یہ کہ خود کو صحیح و سلامت نکال لیا بلکہ ان کے لیے آتش نمرود گلزار بن گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آج پریم چند ادبیات کی تاریخ کوئی اور داستان کہتی ہوتی۔

پریم چند نے پہلی بار کب سے ہندی میں لکھنا شروع کیا اس کے مختلف نقطہ نظر ہیں:

۱۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما کے خیال میں پریم چند نے اپنے ناول 'وردان' کے ساتھ پہلی بار ہندی میں قدم رکھا۔[۵۱] چوں کہ 'وردان' (جلوہ ایثار) کا سن اشاعت ۱۹۲۱ء ہے اس لیے ان کی ہندی میں تصنیف و تالیف کی ابتدا ۱۹۲۱ء سے قرار پائے گی۔

۲۔ ڈاکٹر پرمانند سری واستو کے خیال میں پریم چند نے 'پنچ پرمیشور' ۱۹۱۶ء کی اشاعت کے بعد تمام تر ہندی میں لکھا۔ اس کے پورو کی سب ہی کہانیاں اردو میں ہی تھیں۔"[۵۲]

۳۔ ڈاکٹر شیلا گپت لکھتی ہیں: "۱۹۱۵ کے بعد پریم چند پورنتیا ہندی میں لکھنے لگے۔"[۵۳]

۴۔ ڈاکٹر لکشمی نرائن لال کا خیال ہے: "۱۹۱۷ء کے اپرانت پریم چند ہندی سنسار کے کہانی کار ہو گئے۔"[۵۴]

۵۔ ڈاکٹر سریش سنہا کا بیان ہے: (پریم چند کی) "۱۹۱۵ء میں اردو کہانیوں کا انواد 'سپت سروج' کے نام سے پرکاشت ہوا۔"[۵۵]

۶۔ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر کا قول ہے کہ پریم چند ہندی میں 'پریما' ۱۹۰۶ء کے ساتھ نمودار ہوئے۔[۵۶]

۷۔ ڈاکٹر راجیشور گرو کے خیال میں: "پریم چند ہندی میں ۱۹۱۳ء کے بعد آئے۔"[۵۷]

---

۵۱ رام بلاس شرما: پریم چند اور ان کا یگ ص ۲۱

۵۲ پرمانند سری واستو: ہندی کہانی کی رچنا پرکریا ص ۹۳

۵۳ شیلا گپت: پریم چند اور ان کا ساہتیہ ص ۱۳

۵۴ لکشمی نرائن لال: ہندی کہانیوں کی شلپ ودھی کا وکاس ص ۹۷

۵۵ سریش سنہا: ہندی کہانی ادبھو اور وکاس ص ۳۲۷

۵۶ رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص ۲۳۹

۵۷ راجیشور گرو: پریم چند ایک ادھین ص ۱۲۰

۱۲

ان بیانات میں جو زبردست تضاد و اختلاف ہے اس پر مزید اظہار خیال کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۰۶ء، ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۱ء میں بیک وقت پہلی بار پریم چند کا ہندی میں داخلہ بیان کیا گیا ہے۔ اب ان بیانات کے ساتھ پریم چند کا اپنا بیان بھی ملاحظہ ہو۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۲۶ کے مکتوب میں لکھتے ہیں: "۱۹۰۴ء میں ایک ہندی ناول 'پریما' لکھ کر انڈین پریس سے شائع کرایا" ۵۱ جس سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو خیال ہوا کہ پریم چند نے ابتدا سے ہندی، اردو دونوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ ۵۲ ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیوں کہ 'پریما' ہندی تخلیق نہیں ہے بلکہ ان کے اردو ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ترجمہ ہے۔ پریم چند کے مکتوب مورخہ ۴ر ستمبر ۱۹۱۴ء کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ 'پرتاپ' کو کہانی ارسال کرنے تک پریم چند ناگری رسم خط سے برائے نام ہی واقف تھے۔ ۱۹ر ستمبر ۱۹۱۷ء کے قبل ان کی کسی ہندی تخلیق کی تلاش تحصیل حاصل ہے۔ علاوہ بریں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ امرت رائے کے قول کے مطابق ان کی پہلی زبان اردو تھی اور پہلی زبان میں لکھنے کی سہولت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۵۳

پریم چند نے ہندی میں قدم رکھا تو اس کے ایک حلقے نے وسیع القلبی سے ان کا استقبال کیا۔ لیکن ایک بڑا حلقہ ادبی و تہذیبی معیاروں پر مخالفت کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ پریم چند کے خیالات و تصورات ہی نہیں ان کی زبان و اسلوب ہندی کے لیے سم قاتل ہے، اس لیے اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۵۴ آچار نند دلارے

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۶۶

۵۲ مسعود حسین خاں: گئودان، تصنیف یا ترجمہ، فکر و نظر ۱۹۷۱ء

۵۳ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۱۵۱

۵۴ محترمی فراق گورکھپوری نے اس ضمن میں راقم الحروف کو مندرجہ ذیل حقائق کی طرف متوجہ کیا:

۱۔ پریم چند کو کبھی ہندی ساہتیہ سمیلن یا ناگری پرچارنی سبھا کا عہدہ دار نہیں بنایا گیا۔

۲۔ پریم چند کی زندگی تک ہندی ادبیات کی تاریخ میں ان کو جگہ نہیں دی گئی۔

۳۔ پریم چند کو ہندی ادیب کی حیثیت سے کبھی منگلا انعام و اعزاز نہیں دیا گیا۔

۴۔ پریم چند کے اسلوب کو ہندی کا اسلوب نہیں سمجھا جاتا۔

باجپئی نے اقرار کیا ہے کہ اس طرح برہمنوں کی مخالفت کا سبب ان کی سماجی "ٹیک" تھی۔[51] اس ردعمل کو وقتی قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پریم چند کے خطوط میں اس کا یہ ردعمل برابر موجود ہے۔ منشی اقبال ورما سحر ہتھگامی کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "آپ صاحبان کا خیال درست ہے۔ الہ آباد میں برہمن پارٹی ہے۔ اودھ نرائن جی اسی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہیں اوٹ پٹانگ باتیں کہہ کر مجھے بدنام کر رہے ہیں"[52]

معاشی زاویہ نظر سے پریم چند کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادیبوں کے حالات میں زیادہ فرق نظر نہیں آتا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں اوپندر ناتھ اشک کے نام ایک مکتوب میں اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ اشک نے پریم چند کی تقلید میں اردو سے ہندی میں قدم رکھا تھا: "ہندی میں اخباروں کی حالت اردو سے بہتر نہیں ہے میں خود دو اخبار نکال رہا ہوں اور دونوں میں برابر گھاٹا آ رہا ہے یہاں تک کہ اب جی بیزار ہو گیا ہے اور چاہتا ہوں کہ کسی طرح خوبصورتی سے نجات پا جاؤں۔"[53]

پریم چند کے اردو سے ہندی میں داخل ہونے کے متعلق کئی طرح کے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اس طرح وہ اپنے خیالات کے ابلاغ و ترسیل کے لیے کسی بہتر ذریعہ کی تلاش میں نکلے؟ ہندی زبان و ادب کی خدمت کرنا چاہتے تھے؟ اس طرح تحریک آزادی کی رفتار میں اپنے قلم کی جولانیوں سے تیزی پیدا کرنے چاہتے تھے؟ وغیرہ وغیرہ، پریم چند کے مکاتیب، جو منشی دیا نرائن نگم یا دیگر افراد کے نام ہیں، ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ مجموعی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کے پس منظر میں چاہے آریہ سماج ہو یا کانگریس، پریم چند ہندی میں تخلیقات کی اشاعت کے ذریعہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی تمنا کے ساتھ ہندی میں گئے تھے۔ اردو میں شہرت و عظمت کی اعلاو ارفع منزلیں حاصل کرنے کے باوجود انھیں تشفی نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اتنی ہی شہرت و مقبولیت ہندی میں حاصل ہو جائے تو انھیں مالی دقتوں سے نجات حاصل ہو جائے

---

۵۱ نند دلارے باجپئی: ہندی ساہتیہ بیسویں شتابدی ص ۸۹

۵۲ پریم چند: مکتوب بحوالہ راج بہادر لمگوڑہ: منشی پریم چند کے سفر تنین، زمانہ، پریم چند نمبر ۱۹۲۷ء

۵۳ پریم چند: چٹھی پتری جلد ۲۔ ص ۲۴۰

گی کیوں کہ ہندی میں امکانات اردو کے مقابلے میں زیادہ تھے۔ لیکن واقعہ یوں ہے کہ اردو ہندی دونوں زبانوں میں مسلسل اشاعت کے باوجود پریم چند کی مالی حالت میں زیادہ فرق نہ آسکا۔ پریم چند آخیر تک شدید مالی الجھنوں میں گرفتار رہے۔ اُن کے مکاتیب کے مطالعے سے قاری کو بار بار یہ تمنّا متاثر کرتی ہے کہ کاش پریم چند کو دو وقت کی روٹیوں کا سہارا ہوتا اور وہ کسی قدر اطمینان کے ساتھ ادبی و تخلیقی کام کر سکتے۔ ان کی معاشی کشمکش کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنے بیٹے کی موت پر اطمینان کا احساس ہوا تھا۔ منشی دیا نرائن نگم کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "تقدیر نے تو اپنی دانست میں مجھے سزا دی ہوگی لیکن میں خوش ہوں کہ فکروں کا آدھا بوجھ سر سے دور ہو گیا۔" [۱]

تخلیقات کا نقل لفظ یا ترجمہ:

پریم چند کی ہندی اور اردو نگارشات کے تقابلی مطالعے میں تخلیق، ترجمہ اور نقل لفظ (Transliteration) کے مسائل ناگزیر ہو جاتے ہیں، کیوں کہ یہ تہری اشاعتیں باہمی طور پر مخلوط ہو گئی ہیں، جن کو الگ الگ کرنا ضروری ہے۔ مدنظر رہے کہ:

(۱) ۱۹۱۴ء کے قبل پریم چند کے ہندی میں تخلیق کرنے کا ثبوت نہیں ملتا۔

(۲) بعد کے ادوار میں جو نگارشات اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہوئیں ان کے متن میں جا بجا شدید اختلاف ہے۔

(۳) بعد کے دور میں پریم چند کی بعض نگارشات اردو کے قبل ہندی میں شائع ہو گئیں۔

(۴) آج بھی پریم چند کی بعض نگارشات اردو اخبار و رسائل میں مل جاتی ہیں، جو ہنوز ہندی میں شائع نہیں ہو سکی ہیں۔

(۵) پریم چند کی چند نگارشات صرف ہندی میں شائع ہوتی رہیں۔ اُن کی اردو اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔

متذکرہ بالا نوع میں ابتدائی دور اور اردو رسالوں میں ہنوز محفوظ نگارشات واضح طور پر اردو کی تخلیقات ہیں، جو بعد میں ہندی میں ترجمہ کی گئیں لیکن ایسی نگارشات جو پہلے

---

[۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱۔ ص ۱۰۲

ہندی میں شائع ہوئیں، متنازع فیہ ہیں کہ انھیں پریم چند نے ہندی میں لکھا یا اس کی اصل اردو میں تیار کی گئی اور کسی دوسری فرد نے یا پریم چند نے ہندی میں ترجمہ کر دیا۔ پریم چند نے خود وضاحت نہیں کی ہے۔ اُن کے متواتر مگر متضاد بیانات کے پیش نظر ان سے مزید توقع نامناسب معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنی تمام کہانیوں اور ناولوں کے بارے میں بالکل صحیح اور درست انداز میں زمانہ تصنیف اور ان کے اردو اور ہندی میں اشاعت کی معلومات فراہم کر سکتے تھے۔ 'ہم خرما و ہم ثواب' کی اشاعت ۱۹۰۴ء میں بیان کر کے موصوف نے ہندی تخلیقات کا سلسلہ اسی وقت سے بیان کیا تھا حالاں کہ اُن کے بیانات کا تجزیہ کر کے گذشتہ صفحات میں واضح کیا جا چکا ہے کہ ستمبر ۱۹۱۴ء تک پریم چند اچھی طرح ہندی لکھنا نہیں جانتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند کی نگارشات کی ہندی میں اشاعت ۱۹۱۴ء کے بعد شروع ہوتی ہے۔ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اگر پریم چند نے ۱۹۰۴ء سے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ تو ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک دس برس کے طویل وقفے کے لیے کیا کہا جائے گا جس میں اُن کی ہندی کی کوئی تخلیق نظر نہیں آتی۔ دس برس کے بعد دوسری تخلیق کی اشاعت کی داستان پریم چند کی طرح کے مصنف کے لیے جو مسلسل لکھتا رہا ہو نہ صرف تخلیقی سلسلے کو مجروح کرتی ہے بلکہ مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کے بعد کے دور میں پریم چند نے ہندی میں بھی لکھا۔ ایک بار انھوں نے مولانا محمد عاقل سے کہا تھا: "کبھی میں اردو میں پہلے لکھتا ہوں اور اس کا انواد کرتا ہوں اور کبھی ہندی میں لکھتا ہوں اور بعد میں اس کا اردو میں انواد کرتا ہوں۔" [۵۱] ۲۲ اپریل ۱۹۲۳ کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "ادھر میں نے لکھنا بند سا کر رکھا ہے۔ فرصت ہی نہیں ملتی۔ ملکانہ شدھی پر ایک مختصر مضمون لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔" [۵۲]

پریم چند کا ہندی کی طرف خصوصی توجہ دینا، اردو کے بعض حلقوں نے ناپسند کیا اور ان کو طنز و تعریض کا نشانہ بھی بنایا اس سلسلے کا ایک واقعہ دسمبر ۱۹۳۵ء سے مئی ۱۹۳۶ء تک کے 'شاہکار' لاہور کے شماروں میں دیکھا جا سکتا ہے جس میں پریم چند کو

---

[۵۱] محمد عاقل: سورگیہ منشی پریم چند، ہنس سمرتی انک ۱۹۳۷ء

[۵۲] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱۔ ص ۱۳۲

کئی بار اپنی صفائی دینا پڑی۔ آخری بیان میں موصوف لکھتے ہیں: "میں ہندی اس لیے نہیں کہنے (لکھنے) لگا کہ ہندی والوں نے مجھ پہ سونے کی تھیلیاں نثار کر دیں بلکہ صرف اس لیے کہ ہر ایک ادیب کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ اُس کی تصنیف زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچے۔ میں نے جو کچھ کہا (لکھا) حسب ضرورت پہلے ہندی میں لکھا مگر دونوں زبانوں میں لکھا۔ اور آج ایسی ایک لائن بھی نہیں ہے جو اردو اور ہندی دونوں میں نہ ہو میں نے جس فضا میں تربیت پائی ہے، وہ ہندی نہ تھی، خالص اردو تھی۔ مگر پھر بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستان میں اردو کے مقابلے میں ناگری رسم الخط کے عام ہونے میں زیادہ آسانیاں ہیں ..... ہندستانی کے معنی ہی، وہ زبان ہے، جو ہندوستان میں عام طور پر بولی اور لکھی جاتی ہے۔ وہ سہل قسم کی اردو اور سہل قسم کی ہندی ہے۔ افراط و تفریط سے پاک، مولویت اور پنڈتائی کے اثر سے باہر"۔[۱] لیکن پریم چند کا اپنی تخلیقات کے بارے میں یہ بیان کئی اعتبار سے محل نظر ہے۔ یہ دعوا کہ ان کی نگارشات کی ایک سطر بھی ایسی نہیں ہے، جو اردو اور ہندی دونوں میں شائع نہ ہوئی ہو، انتہائی مبالغہ آمیز ہے، خیر اس وقت کا کیا ذکر ہے، آج بھی پریم چند کی متعدد نگارشات اردو اور ہندی میں کسی ایک زبان میں شائع ہیں۔ انھوں نے غالباً معترضوں کی زبان بند کرنے کی غرض سے دعوا کر لیا، جس کا حقیقت سے دور کا واسطہ نہیں۔

پریم چند کی نگارشات کے اردو اور ہندی مخطوطات اور اشاعتوں پر غور کرنے میں مندرجہ ذیل حقائق پر نظر رکھنا چاہیے:

۱۔ پریم چند کے تمام مسودات ان کے خاندان میں محفوظ نہیں ہیں، امرت رائے نے راقم الحروف کو بتایا کہ ان کے خیال میں زیادہ تر مسودات ناشرین یا رسائل کو اشاعت کے لیے ارسال کیے گئے تھے۔

۲۔ پریم چند کے شاگرد منشی منظور الحق کلیم کا بیان ہے کہ جولائی ۱۹۱۶ء سے مئی ۱۹۱۸ء تک کی تمام تخلیقات اُن کے قلم سے صاف کی ہوئی ہیں۔[۲]

---

[۱] پریم چند: عذر تقصیر شاہکار مئی ۱۹۳۶ء

[۲] منظور الحق کلیم: منشی پریم چند مرحوم ایک شاگرد کی نظر میں، زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

غالباً یہ بیان اردو تخلیقات کے سلسلے میں ہے کیوں کہ اس وقت تک پریم چند کم وبیش اردو میں ہی لکھتے تھے۔ پریم چند کے ایک دوسرے شاگرد منشی منیر حیدر بیباک ماہلی نے، جو پریم چند کے رفیق کار بھی رہ چکے تھے، پروفیسر احتشام حسین کو بتایا تھا جس کا ذکر موصوف نے راقم السطور سے کیا کہ بیباک نے پریم چند کی متعدد اردو کہانیوں کے ترجمے ہندی میں کیے تھے، جو بعد میں پریم چند کی ہندی تخلیق کی حیثیت سے ہندی اخبار و رسائل میں شائع ہوئے۔

۳۔ منشی اقبال ورما سحر ہتگامی سے پریم چند کے ترجمہ کرانے اور اجرت ادا کرنے کا ذکر پریم چند کے متعدد مکاتیب میں موجود ہے۔ سحر ہندی اور اردو دونوں سے واقف تھے۔ عین ممکن ہے کہ انھوں نے اردو اور ہندی دونوں میں ترجمے کیے ہوں۔ پریم چند اگست ۱۹۲۵ء میں منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "حضرت سحر کو میں نے -/۲۰۰ دینا طے کرلیا۔ وہ راضی بھی ہو گئے.... اگر وہ راضی ہوں تو 'گوشۂ عافیت'، بھی اُن سے پورا کروالوں گا اور کچھ نئی کہانیوں کا ترجمہ بھی"۔[۵۱] پھر ۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء کو لکھتے ہیں: "منشی اقبال ورما صاحب مارے تقاضوں کے ناک میں دم کیے ہوئے ہیں حالانکہ ایک سو پچاس دے چکا ہوں لیکن ابھی انھیں اتنا ہی اور دینا ہے"[۵۲] اسی طرح ۱۲ فروری ۱۹۳۰ء کو دوبارہ لکھتے ہیں: "آپ نے پچھلے مہینے اقبال ورما صاحب کی مدد کی، میری جانب سے، کی تھی۔ ابھی اُن کے قرض سے میں سبکدوش نہیں ہوا ہوں۔ میری کتابوں کا پچھلا حساب تو صاف ہو گیا لیکن نئے سال کا حساب باقی ہے۔"[۵۳]

۴۔ پریم چند نے ۱۹۲۹ء میں دوسرے کے لیے اردو میں ترجمے کا کام کیا۔ ہندستانی اکیڈمی نے گالس وردی کی 'جسٹس'، 'اسٹرائف' اور 'سلور باکس' کا اردو ترجمہ کرانے کا منصوبہ بنایا اور یہ کام منشی دیا نرائن نگم کے سپرد ہوا تو پریم چند نے ان کی طرف سے ترجمہ کرنا شروع کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا مصنف جو دوسروں کے لیے اردو میں ترجمہ کرتا ہو

---

۵۱ پریم چند: چیٹھی پتری ج ۱ ص ۱۵۶

۵۲ ایضاً ص ۱۶۱

۵۳ ایضاً ص ۱۷۶

خود اپنے لیے اردو میں کیوں کر نہیں کرے گا۔اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ۱۹۲۹ء تک پریم چند اردو میں مسلسل لکھ رہے تھے۔ ۲۸ فروری ۱۹۲۹ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں: "ہاں 'جسٹس' میں نے شروع کردیا ۱۶-۱۷ صفحات کر بھی ڈالے ابھی ابھی اُس کا ہندی ترجمہ تو آیا نہیں۔ اس لیے کہ وہ سب مشکلات جو پہلے ڈکشنریوں یا مشوروں سے حل کی تھیں، پھر آرہی ہیں اس لیے جب تک ہندی ترجمہ نہ آجاوے، اس وقت تک کے لیے ملتوی کرتا ہوں۔ دوسری کتاب کے متعلق میں یہی کہوں گا کہ آپ خود ہی کرلیں۔ میں نے سمجھا تھا، ایک نشست میں ۷، ۸ صفحات ہو جائیں گے۔ پر اب دیکھتا ہوں تو مشکل سے چار صفحات ہوتے ہیں اور میرے پاس ایک نشست سے زیادہ وقت نہیں اگر اسے کرتا ہوں تو میرا 'پردہ مجاز' رہا جاتا ہے صبح کو کرتا ہوں تو 'کرم بھومی' میں حرج ہوتا ہے۔ اور کون سا وقت ہے؟ 'جسٹس' تو میں کسی نہ کسی طرح کر ہی ڈالوں گا۔ لیکن باقی دونوں کو میرا استعفیٰ ہے۔ اتنے ہی وقت میں، میں زیادہ فائدہ کا کام کر سکتا ہوں۔" ؎۵۱

۵۔ پریم چند کے معتبر ناقد مدن گوپال کا بیان ہے کہ پریم چند نے ۲۹-۱۹۲۸ء میں متذکرہ بالا اردو ترجمے کا کام حاصل کرنے کی جدوجہد میں اس قضیے میں بھی شرکت کرلی تھی کہ آیا ہندو اردو میں بہتر طور پر ترجمہ کرسکتے ہیں یا نہیں۔ انھوں نے پریم چند کے اردو میں تصنیف و تالیف کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک بار پریم چند کے ایک ہندی مدّاح نے ان کے پہلو میں اردو مسودہ دیکھ کر خفگی کے ساتھ پوچھا۔ کیا آپ کو اب بھی اردو سے دلچسپی ہے؟ یقینی طور پر! پریم چند نے جواب دیا۔ کیا آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ اب تک اردو میں تصنیف و تالیف کرتے ہیں؟ میں اردو میں تخلیق کرتا ہوں۔ میری صبح ہندی کے لیے اور شام اردو کے لیے ہے ؎۵۲

۶۔ امرت رائے نے پریم چند کے ناولوں کی فہرست پیش کرتے ہوئے، اظہار کیا ہے کہ پریم چند کے ناولوں میں اکثر و بیشتر کی تصنیف اردو میں

۵۱۔ مدن گوپال: منشی پریم چند ص ۲۷۸

۵۲۔ ایضاً ص ۲۸۱

ہوئی لیکن بسا اوقات ان کے ترجمے اردو میں شایع ہونے سے قبل ہندی میں شائع ہوگئے۔[۵۱]

۷۔ ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کی تحقیق کے مطابق پریم چند نے اپنے تمام ناول ہندی کے قبل اردو میں لکھے، بعد میں جن کے ترجمے ہندی میں شائع ہوئے۔ ان کے خیال میں ہندی ترجمے بھی خود پریم چند نے کیے تھے وہ لکھتے ہیں: "پریم چند کے سرجن کی ایک انیہ وشیشتا یہ ہے کہ انھوں نے پرایہ اپنے اپنیاسوں کی روپ ریکھائیں انگریزی میں بنائیں۔ مول اپنیاس اردو میں لکھے اور بعد میں سویم ان کا انواد کیا۔ تین بھاشاؤں میں کاریہ کرنے پر بھی انھیں کبھی کوئی آسویدھا نہیں ہوئی۔"[۵۲]

۸۔ پریم چند کے عزیز دوست پروفیسر فراق گورکھپوری نے راقم السطور سے بیان کیا کہ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۶ء کے درمیان جب ان کا اور پریم چند کا شب و روز کا ساتھ تھا، پریم چند اپنی کم و بیش تمام نگارشات فراق صاحب اور دوسرے دوستوں کو سناتے تھے جو زبان و رسم خط کے اعتبار سے "سو فیصدی اردو" ہوتی تھیں۔ پروفیسر فراق کے قول کے مطابق، ایک بار انھوں نے پریم چند کے نام سے شائع شدہ کسی ہندی تخلیق کی زبان پر اعتراضات کیے تو پریم چند نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ ان کی زبان اردو میں مستند ہو چکی ہے۔ انھیں ہندی ترجمے کی زبان کی فکر نہیں ہے۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ پریم چند خود کو اردو کا ادیب سمجھتے تھے اور اس حیثیت سے اپنی زبان پر فخر کرتے تھے۔

۹۔ پریم چند کے بعض خطوط میں براہ راست ہندی میں بھی لکھنے کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۷ فروری ۱۹۲۴ء کو منشی دیا نرائن نگم کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں: مضامین لکھنے کی بار بار کوشش کرتا ہوں مگر یقین مانیے ہندی رسائل اس قدر دق کرتے ہیں کہ کچھ کیے نہیں بن پڑتا۔ اب میں کہانیاں اردو میں نہیں، ہندی میں لکھ کر بھیج دیا کرتا ہوں۔"[۵۳] پھر انھیں کو ۲۵ جون ۱۹۲۴ء کو لکھتے ہیں: "میں نے مینیجر 'ہنس' کو تاکید کردی ہے کہ جب میرا افسانہ چھپے، وہ اس کا پروف 'زمانہ' کو بھیج دیا کریں اور 'ہنس' میں لکھ دیا کریں۔ اردو ترجمے کا حق 'زمانہ' کے

---

[۵۱] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص۶۵۵

[۵۲] کمل کشور گوئنکا: پریم چند کے اپنیاسوں کا شلپ ودھان ص۳۰

[۵۳] پریم چند چٹھی پتری ج ۱ ص۱۴۱

لیے محفوظ۔ سال میں پانچ چھ سے زائد نہیں لکھتا۔ ہاں، سحر صاحب اس کام کے لیے بہت موزوں ہیں۔" ۵۱ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند نے اخبار و رسائل کی مسلسل فرمائشوں سے مجبور ہو کر ہندی میں بھی لکھا لیکن جو دلائل و شواہد پیش کیے جا چکے ہیں، ان کی روشنی میں فیصلہ کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے کہ ہندی میں ان کی کوششیں مبتدیانہ و نومشقانہ تھیں جن کو تخلیقی عمل سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ پریم چند نے رسائل و اخبارات کی فرمائش، مالی منفعت کے امکانات اور زیادہ تر دوسروں سے ترجمہ یا نقل لفظ کرایا ہوگا ۵۲ ڈاکٹر گنگا پرشاد ومل نے تسلیم کیا ہے کہ پریم چند کی زبان کا تانا بانا اور مزاج ہندی نہیں بلکہ اردو ہوتا ہے۔ ۵۳

۱۰۔ اس دور کی اردو اور ہندی نگارشات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ہندی میں نہ صرف شدت سے ترجموں کی بو محسوس ہوتی ہے، بلکہ متعدد موقعوں پر ترجموں کی زبردست خامیاں پکار پکار کر اعلان کر دیتی ہیں کہ پریم چند نے ان پر نظر ثانی کرنے کی بھی زحمت نہیں کی ہے پھر یہ حادثہ بھی ہوتا تھا کہ پریم چند کی تخلیقات ان کے علم و اطلاع کے بغیر اخبار و رسائل ترجمہ کرا کے شائع کر دیتے تھے۔ پریم چند نے ایک واقعہ کا ذکر

---

۵۱ پریم چند چٹھی پتری ج ۱ ص۲۰۹

۵۲ ایسے مصنف جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اُردو سے کیا ہے، اپنی سہولت کے پیش نظر عام طور پر اُردو میں پہلا مسودہ تیار کرتے ہیں جن کے ہندی ترجمے بعد میں کیے جاتے ہیں۔ راقم السطور نے چشم دید طور پر اُپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ، شمشیر بہادر سنگھ اور دیگر کئی مصنفین کو ان کا پہلا مسودہ اردو میں تیار کرتے دیکھا ہے لیکن بعض اوقات یہ لوگ براہ راست ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ اس کا دوسرا رخ بھی دلچسپ ہے۔ اردو کے متعدد مصنفین ہندی میں ہندی مصنف کی حیثیت سے مشہور و معروف ہیں۔ حالانکہ ان میں اکثر و بیشتر ہندی کے حروف تہجی سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں، چہ جائے کہ ہندی میں تصنیف و تالیف کر سکیں۔ ان میں منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی قاضی عبد الستار، جیلانی بانو، خدیجہ مستور، رضیہ سجاد ظہیر، عبد اللہ حسین، راہی معصوم رضا، شوکت صدیقی، شوکت تھانوی واجدہ تبسم، اے حمید وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان کی تصانیف کے ترجمے دوسروں نے کیے ہیں، جن کا مصنف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کون جانے مستقبل میں یہ لوگ اور انھیں کی طرح کتنے لوگ پریم چند کی طرح ہندی کے ادیب و مصنف قرار دیے جانے لگیں!

۵۳ گنگا پرساد ومل: پریم چند ص۹۳

منشی دیا نرائن نگم کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ اصل کہانی اردو میں لکھی تھی۔ پہلے اس کا ترجمہ ہندی میں شائع ہوا اور پھر ہندی سے کسی نے اردو میں چھاپ دیا۔ موصوف لکھتے ہیں :

" زمانہ، کے لیے ایک مضمون لکھا تھا، اس کا ہندی ترجمہ کلکتہ، کے ایک رسالہ میں نکلا تھا۔ میں نے مضمون صاف کیا مگر ہندی میں نکلنے کے تیسرے ہی دن، اس کا ترجمہ لاہور کے 'پرتاپ'، میں نظر آیا، اس لیے اُس قصہ کو نہ بھیج سکا۔ صندوق میں صاف کیا ہوا پڑا ہے۔ حالانکہ لاہوری ترجمہ بالکل بھدّا ہے مگر قصہ تو وہی ہے" [۵۱]

اسی طرح پریم چند کے نام سے شائع شدہ اردو اور ہندی تخلیقات میں اکثر ترمیم و اضافہ کیا جاتا رہا ہے۔ جس کا اعتراف بعض اوقات ان کے مدیروں نے کیا ہے۔ پریم چند کی کہانی 'سانپ کی معشوقہ'، کو دوبارہ 'ناگ جی'، کے نام سے 'تہذیب نسواں'، میں ۵ر اگست اور ۲۲ر اگست ۱۹۲۲ء کو قسط وار شایع کرتے ہوئے، مدیر موصوف لکھتے ہیں: " ہم منشی پریم چند صاحب کا یہ دل چسپ مختصر افسانہ دلی شکریے کے ساتھ رسالہ 'ہزار داستان'، سے نقل کرتے ہیں اور اسے لڑکیوں کے مناسب حال بنانے میں ہمیں جو خفیف تبدیلیاں کرنا پڑی ہیں، ان کے لیے مصنف اور اڈیٹر 'ہزار داستان'، سے معافی چاہتے ہیں۔" اسی طرح پریم چند کی وفات کے بعد بھی مختلف اخبار و رسائل اور درسی کتب میں پریم چند کی تخلیقات ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جس کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے کون تیار ہوگا !

ناول

پریم چند کی تخلیقات کے نقش اوّل کے سلسلہ میں ان کے کئی ناولوں کا ذکر کیا جا چکا۔ پریم چند کے ناولوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف نہیں ہے البتہ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر نے کسی غلط فہمی کی بنا پر " ان کے ایک درجن اپنیاس" بیان کر دیے ہیں، جو صحیح نہیں ہے۔ [۵۲] پریم چند کے تخلیقی ناولوں کی تعداد ۱۵ (پندرہ) ہے یہاں ان کا بالترتیب ذکر کیا جاتا ہے۔

---

۵۱ پریم چند چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۲۷

۵۲ رام رتن بھٹناگر: کلاکار پریم چند ص ۲

۱۔ اسرار معابد : देवस्थान-रहस्य

یہ پریم چند کی اولین افسانوی تخلیق ہے جو بنارس کے اردو اخبار 'آوازہ خلق' میں ۸ر اکتوبر ۱۹۰۳ سے یکم فروری ۱۹۰۵ تک قسط وار شایع ہوئی۔ اردو میں کتابی صورت میں ہنوز شائع نہیں ہوسکی۔ اس کا ہندی ترجمہ امرت رائے نے ہنس پرکاشن الہ آباد سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا ہے جو 'منگلا چرن' میں شامل ہے۔

۲۔ ہم خرما و ہم ثواب : प्रेमा

اردو میں ہم خرما و ہم ثواب کے دو ایڈیشن شائع ہوئے پہلا ایڈیشن۔ بابو مہادیو پرشاد ورما نے طبع کیا اور دوسرا نول کشور پریس لکھنؤ نے۔ کسی اشاعت پر سن اشاعت طبع نہیں ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ 'پریما' ۱۹۰۴ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا۔

۳۔ کشنا : किशना

یہ ناول سراسر ناپید ہے۔ 'زمانہ' کے اکتوبر نومبر ۱۹۰۷ کے ایک تبصرہ کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناول ۱۹۰۷ ء میں بنارس کے میڈیکل ہال پریس سے اردو میں شائع ہوا۔

۴۔ روٹھی رانی : रूठी रानी

یہ ناولٹ پہلی بار 'زمانہ' میں اپریل تا اگست ۱۹۰۷ء قسط وار شائع ہوا۔ اردو ہندی دونوں میں آسانی سے ملتا ہے۔ اردو میں پہلی بار لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور سے شائع ہوا۔ ہندی میں پہلی بار امرت رائے نے ہنس پرکاشن الہ آباد سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔ 'منگلا چرن' میں شامل ہے۔

۵۔ جلوۂ ایثار : वरदान

پہلی اردو اشاعت ۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الہ آباد سے ہوئی۔ ہندی میں ۱۹۲۱ء میں گرنتھ بھنڈار بمبئی نے شائع کیا۔

۶۔ بازار حسن : सेवासदन

اردو میں دو حصوں میں شائع ہوا۔ پہلا حصہ ۱۹۲۱ء میں اور دوسرا حصہ ۱۹۲۲ء میں لاہور کے دارالاشاعت پنجاب نے شائع کیا۔ ہندی میں پہلی بار دسمبر ۱۹۱۸ء

میں ہندی پستک ایجنسی کلکتہ سے شائع ہوا۔

۷۔ گوشۂ عافیت : प्रेमाश्रम

ہندی میں ۱۹۲۲ء میں ہندی پستک ایجنسی کلکتہ سے شائع ہوا۔ اردو میں پہلی اشاعت ۱۹۲۸ء میں دارالاشاعت پنجاب، لاہور سے ہوئی۔

۸۔ چوگان ہستی : रंगभूमि

ہندی میں ۱۹۲۵ء میں پہلی بار گنگا پستک مالا، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اردو میں پہلی اشاعت ۱۹۲۷ء میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے ہوئی۔

۹۔ پردۂ مجاز : कायाकल्प

ہندی میں پہلی بار ۱۹۲۸ء میں بنارس سے شائع ہوا اردو میں پہلی اشاعت لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور سے ہوئی۔ اردو میں پہلی اشاعت پر سن درج نہیں ہے۔

۱۰۔ نرملا : निर्मला

یہ ناول ہندی ماہ نامہ ’چاند‘ میں نومبر ۱۹۲۵ سے نومبر ۱۹۲۶ تک قسط وار شائع ہوا۔ کتابی صورت میں پہلی بار ۱۹۲۷ء میں چاند پریس الٰہ آباد سے ہندی میں طبع ہوا۔ اردو میں پہلی بار ۱۹۲۹ء گیلانی الکٹرک پریس لاہور سے شائع ہوا۔

۱۱۔ بیوہ : प्रतिज्ञा

ہندی میں پہلی اشاعت ۱۹۲۹ء میں بنارس سے ہوئی۔ اردو میں مئی ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔

۱۲۔ غبن : ग़बन

اس کی ہندی اشاعت ۱۹۳۱ء کے اوائل میں سرسوتی پریس بنارس سے ہوئی۔ اردو میں پہلی بار لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور نے شائع کیا جس پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ غالباً ۱۹۳۲ء تک اردو میں شائع ہو چکا تھا۔

۱۳۔ میدان عمل : कर्मभूमि

اس کی پہلی ہندی اشاعت ۱۹۳۲ء میں سرسوتی پریس بنارس سے ہوئی۔ اردو میں جامعہ ملیہ دہلی نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔

۱۴۔ گئودان : गोदान

اس کی پہلی ہندی اشاعت ۱۹۳۶ء میں سرسوتی پریس بنارس سے ہوئی۔ اردو میں پہلی بار مکتبہ جامعہ دہلی سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔

۱۵۔ منگل سوتر : मंगलसूत्र

یہ پہلی بار ہندی میں ۱۹۴۸ء میں بنارس سے شائع ہوا۔ اردو میں ہندی سے ترجمہ ہوکر شائع ہوا۔

کہانیاں

پریم چند کی کہانیوں پر متعدد تحقیقی مقالے موجود ہیں۔ لیکن ان کی کہانیوں کی صحیح تعداد متعین کرنے میں مختلف و متضاد بیانات پیش کیے جاتے ہیں، جن کا سرنامہ پریم چند کا اپنا بیان ہے، موصوف لکھتے ہیں: "میری کہانیوں کی کل سنکھیا لگ بھگ ڈھائی سو ہے"۔[۵۱] آچاریہ نند دُلارے باجپئی کا ارشاد گرامی ہے: "پریم چند جی کی کہانیوں کی سنکھیا ۳۰۰ سو کے لگ بھگ ہے اس کے اتیرکت ان کی اردو کہانیوں کی سنکھیا بھی ۱۰۰ (ایک سو) کے اوپر ہے"[۵۲] اس طرح آچاریہ باجپئی کے قول کی روشنی میں پریم چند کی کہانیوں کی مجموعی تعداد ۴۰۰ (چار سو) قرار پاتی ہے، جو مبالغہ پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر لکھتے ہیں: "پریم چند نے ہندی ساہتیہ کو ڈھائی سو کہانیاں دی ہیں"۔[۵۳] ڈاکٹر اندرناتھ مدان کا قول ہے کہ پریم چند نے "۲۵۰ (دو سو پچاس) کے لگ بھگ کہانیاں لکھیں"۔[۵۴] لکشمی نرائن لال کا خیال ہے: "سنکھیا کرنے پر ان کی کل اردو کہانیاں ۱۷۸ (ایک سو اٹھہتر) ہیں"۔[۵۵] ڈاکٹر دیوراج اپادھیائے کا بیان ہے کہ پریم چند کے ذریعہ "قریب چار سو کہانیاں

---

[۵۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۲۳۶

[۵۲] نند دلارے باجپئی: پریم چند ساہتک ودیچن ص ۱۵۵

[۵۳] رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص ۲۱۷

[۵۴] اندرناتھ مدان: پریم چند ایک ودیچن ص ۱۳۸

[۵۵] لکشمی نرائن لال: ہندی کہانیوں کی شلپ ودھی کا وکاس ص ۹۷

ہندی ساہت کو پراپت ہوئیں۔"[51] ڈاکٹر جتیندر پاٹھک لکھتے ہیں: "پریم چند نے لگ بھگ چار سو کہانیاں لکھیں"[52] ڈاکٹر کیدار ناتھ اگروال لکھتے ہیں: "کہا جاتا ہے انھوں نے لگ بھگ ۲۵۰ (دو سو پچاس) کہانیاں لکھی ہیں۔"[53]

متذکرہ بالا مختلف و متضاد بیانات کی روشنی میں پریم چند کی کہانیوں کی صحیح تعداد کا تعین دشوار ہی نہیں، ناممکن ہے۔ غالباً محققین کرام نے بلا کسی تجزیے یا تلاش و جستجو کے محض پریم چند کے بیان پر بھروسہ کر کے ان کے بیان کو دہرا دیا ہے۔

پریم چند کی ادبی زندگی کی ابتدا اور ان کی پہلی کہانی کی اشاعت کا تعین کرنے میں خود انھیں کے متضاد بیانات کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند کی کہانیوں سے متعلق بنیادی حقائق دریافت کرنا موخر رہا ہے۔ پریم چند پر درجنوں تحقیقی مقالوں کی موجودگی میں ابھی تک ان کی کہانیوں کی مجموعی تعداد (اردو، ہندی میں ان کے عنوانات اور پہلی بار اشاعت کی تاریخ اور جگہ معلوم کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی ہے، جو پریم چند پر تحقیقی کام کرنے والوں کی سہل انگاری ہے اس طرح کا کام خصوصی دقت نظر و جاں فشانی کا مطالبہ کرتا ہے، جس میں لائبریریوں کی خاک چھاننے اور کرم خوردہ رسائل و اخبارات کے گرد و غبار صاف کرنے کی خدمت بھی بالواسطہ شامل ہو جاتی ہے!

ہندی میں پریم چند کے کارناموں پر مختلف زاویوں سے برابر لکھا جا رہا ہے لیکن بدقسمتی سے ہندی مصنفین کی نئی نسل اردو زبان و رسم خط سے نابلد ہے، اس لیے اردو ماخذ کا جائزہ لینے سے قاصر رہ جاتی ہے، کیوں کہ اردو اور ہندی دونوں سے پوری واقفیت کے بغیر پریم چند پر ایمانداری سے کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ ان کی معذوری دوسروں کے عطا کردہ حقائق کو آمنا و صدقنا قبول کرنے پر مجبور کرتی ہے اس طرح بنیادی حقائق میں غلطیوں کے اعادہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اردو میں پریم چند پر تحقیقی مقالے تیار کرنے والوں پر ہندی سے عدم واقفیت کا الزام نہیں رکھا جا سکتا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہاں بھی ہندی تصانیف سے احتراز کی فضا قائم ہے۔ ان میں اکثر تحقیقی مقالے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں، جس کی بنا پر کاموں کی تکرار ہو رہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند

---

[51] دیوراج اپادھیا: آدھنک ہندی کتھا ساہتیہ اور منووگیان ص ۱۸۲

[52] جیتندر پاٹھک: کتھاکار پریم چند ص ۳۶

[53] کیدار ناتھ اگروال: پریم چند کی کہانیاں، پریم چند اور گورکی ص ۲۲۹

کی کہانیوں کے متعلق اپنے نتائج پیش کرنے سے قبل اب تک اس سلسلہ کی کوششوں کا مختصراً جائزہ لے لیا جائے۔

پریم چند کی ادبی زندگی کے اکثر مسائل و مباحث کی طرح ان کی کہانیوں کے بارے میں بنیادی حقائق فراہم کرنے میں منشی دیا نرائن نگم کو اولیت حاصل ہے، جنھوں نے 'زمانہ' میں پریم چند کی کہانیوں کی پہلی بار ایک فہرست شائع کر کے[۵۱] ان پر کام کرنے والوں کی راہیں کھول دیں۔ اگرچہ ان کی فہرست نامکمل اور تضاد کا شکار رہے، جس میں 'زمانہ' میں شائع شدہ کئی کہانیاں مثلاً 'گناہ کا اگن کنڈ' مارچ ۱۹۱۱ء 'خون سفید' جولائی ۱۹۱۷ء 'حج اکبر' ستمبر ۱۹۱۷ء "کرکیٹ میچ' جولائی ۱۹۳۷ء وغیرہ۔ نظرانداز ہو گئی ہیں لیکن تمام غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس فہرست کی اہمیت و افادیت کم نہیں کی جا سکتی ہے۔ آج جب 'زمانہ' کی مکمل فائل کسی ایک جگہ نہیں ملتی، یہ فہرست بنیادی دستاویز کا کام دیتی ہے۔ 'زمانہ' کے علاوہ پریم چند کی کہانیاں آزاد، ادیب، کہکشاں، ہمدرد، صبح امید، بہارستان، ہزار داستان، مرقع، تہذیب نسواں، شباب اردو، نقاد اور العصر رسائل و اخبار میں شائع ہوتی رہیں، جن کی فہرست ابھی تک تیار نہیں کی جا سکی ہے۔ ان رسائل کی ورق گردانی سے توقع ہے کہ بعض ایسی کہانیوں کا سراغ ملے جو اب تک اُردو یا ہندی میں نایاب ہیں۔

پریم چند کی کہانیوں کی تلاش و تجسّس میں امرت رائے کی خدمات ناگزیر ہیں۔ انھوں نے مختلف رسائل و اخبارات اور اردو مجموعوں سے ان کی چھپن (۵۶) ایسی کہانیاں ڈھونڈھ نکالیں جو اس وقت تک ہندی مجموعوں میں شامل نہیں تھیں۔ ان میں بعض کہانیوں کو مدن گوپال نے اپنی دریافت بتایا ہے[۵۲] ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پریم چند کی کہانیوں کے ادوار معین کرنے کی کوشش کی اور بعض مجموعوں کی اشاعت کا زمانہ طے کیا لیکن انھوں نے کسی کم یاب تخلیق کی نشاندہی نہیں کی[۵۳] ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی پریم چند کی کہانیوں کے متعلق بعض بنیادی حقائق کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے پریم چند کی کہانیوں کی مجموعی تعداد دو سو سرسٹھ قرار دی ہے جن میں دو سو تین (۲۰۳) مان سرور، کی آٹھ جلدوں میں، سات (۷) 'کفن' میں اور چھپن (۵۶)

---

۵۱ دیا نرائن نگم: مضمون، زمانہ اور پریم چند: زمانہ، پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۵۲ مدن گوپال: منشی پریم چند: ص ۴۵۹-۵۶۱

۵۳ مسعود حسین خاں، پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور: پریم چند شخصیت اور کارنامے مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس ص ۴۲-۴۳۲

گپت دھن کی دو جلدوں میں شامل ہیں۔ دکفن کے متعلق ڈاکٹر قمر رئیس کی اطلاع صحیح نہیں ہے۔ اس میں سات (۷) کے بجائے چودہ (۱۴) تخلیقات شامل ہیں۔ اس طرح کہانیوں کی مجموعی تعداد دو سو تہتر (۲۷۳) ہو جاتی ہے۔ اردو کی کہانیوں کی تعداد بیان کرنے میں بھی موصوف سے تسامح ہوا ہے۔ انھوں نے کہانیوں کے مجموعوں سے اعداد و شمار کر ان کی تعداد ایک سو چورانوے (۱۹۴) بیان کردی ہے حالاں کہ ان میں کئی کہانیاں ایک سے زیادہ مجموعوں میں شامل ہیں۔ پریم چند کی اردو کہانیوں کی مجموعی تعداد دو سو چار (۲۰۴) قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔ راقم السطور کہانیوں کی پہلی اشاعت کی تاریخ کے تعین میں بھی ان کی تحقیق سے متعدد جگہوں پر متفق نہیں ہے۔ آئندہ صفحات میں کہانیوں کا گوشوارہ پیش کیا جا رہا ہے اس سے مقابلہ کرکے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند کی کہانیوں کے مختلف مجموعوں کی اشاعت کا زمانہ متعین کرنے میں جو مستحسن کاوش کی ہے، ملاحظہ ہو: ۵۱

۱۔ سوزِ وطن	: جون ۱۹۰۸ء	۸۔ فردوسِ خیال	: ۱۹۲۹ء
۲۔ پریم پچیسی حصہ اول	: ۱۹۱۵ء	۹۔ پریم چالیسی حصہ اول	: ۱۹۳۰ء
۳۔ پریم پچیسی حصہ دوم	: ۱۹۱۸ء	۱۰۔ پریم چالیسی حصہ دوم	: ۱۹۳۰ء
۴۔ پریم بتیسی حصہ اول	: ۱۹۲۰ء	۱۱۔ آخری تحفہ	: ۱۹۳۴ء
۵۔ پریم بتیسی حصہ دوم	: دسمبر ۱۹۲۰ء	۱۲۔ زادِ راہ	: ۱۹۳۶ء
۶۔ خاکِ پروانہ	: ۱۹۲۸ء	۱۳۔ دودھ کی قیمت	: ۱۹۳۷ء
۷۔ خواب و خیال	: ۱۹۲۸ء	۱۴۔ واردات	: فروری ۱۹۳۸ء

ہندی میں پریم چند کی کہانیوں کے مجموعوں کا زمانہ اشاعت سب سے پہلے پروفیسر پرکاش چندر گپت نے متعین کرنے کی کوشش کی ۵۲ لیکن یہ کوشش چند مجموعوں تک محدود تھی اس کو ڈاکٹر گیتا لال نے سرانجام دیا۔ ان کی تحقیق کے مطابق کہانیوں کے مجموعوں کی اشاعت حسب ذیل ہے: ۵۳

۱۔ سپت سروج	: ۱۹۱۷ء	۳۔ پریم پورنما	: ۱۹۲۰ء
۲۔ نو ندھی	: ۱۹۱۸ء	۴۔ پریم پچیسی	: ۱۹۲۳ء

---

۵۱ قمر رئیس: تلاش و توازن ص ۱۰۴-۱۲۸

۵۲ پرکاش چندر گپت: کہانی کار: پریم چند چنتن اور کلا ص ۱۴۷

۵۳ گیتا لال: مضمون، پریم چند کے جیون تتھا ساہتیہ سمبندھی تتھیوں میں بھرانتیاں: ساہتیہ جنوری ۱۹۶۰ء

۵۔ پریم پرسودن :	۱۹۲۴ء	۱۲۔ پانچ پھول :	۱۹۲۹ء
۶۔ پریم پرمود :	۱۹۲۶ء	۱۳۔ سمر یاترا اور گیارہ رانیہ اجینتک کہانیاں	۱۹۳۰ء
۷۔ پریم پرتما :	۱۹۲۶ء	۱۴۔ سپت سمن :	۱۹۳۰ء
۸۔ پریم دوادشی :	۱۹۲۶ء	۱۵۔ پریم پنچمی :	۱۹۳۰ء
۹۔ پریم تیرتھ :	۱۹۲۸ء	۱۶۔ پرنیا اور انیہ کہانیاں :	۱۹۳۲ء
۱۰۔ پریم چترتھی :	۱۹۲۹ء	۱۷۔ پریم چند کی سرسرشیٹھ کہانیاں :	۱۹۳۳ء
۱۱۔ اگنی سمادھی تتھا انیہ کہانیاں :	۱۹۲۹ء	۱۸۔ مان سرور جلد اول :	۱۹۳۶ء

ان کے علاوہ مان سرور جلد دوم بھی پریم چند کی زندگی میں شائع ہوگئی تھی۔ لیکن ان کی بنیاد پر کہانیوں کے زمانے کا تعین کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، کیوں کہ ان میں متعدد کہانیاں ایک سے زیادہ مجموعوں میں جگہ پاگئی ہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں : ؎۱

۱۔ بینک کا دیوالہ (پریم دوادشی، پریم چترتھی) ۲۔ لاگ ڈانٹ (پریم پرسون، پریم چترتھی) ۳۔ گرہ داہ (پریم پرسون، سپت سمن، پریم دوادشی) ۴۔ ڈیر کا انت (سپت سمن، پریم پچیسی) ۵۔ مندر (پریم تیرتھ، پریم پیوش، سپت سمن) ۶۔ ایمان کا فیصلہ (پریم پورنما، سپت سمن) ۷۔ سجان بھگت (پریم پیوش، سپت سمن) ۸۔ ماتا (نوندھی، سپت سمن) ۹۔ آتمارام (پریم پچیسی، پریم دوادشی) ۱۰۔ درگا کا مندر (پریم پورنما، پریم دوادشی) وغیرہ

متذکرہ بالا مجموعوں کی تمام کہانیاں 'مان سرور' کی آٹھوں جلدوں اور 'کفن' میں شائع ہوگئی ہیں جن کی مجموعی تعداد دو سو سترہ (۲۱۷) ہے۔ ان کے علاوہ امرت رائے کی تلاش کردہ چھپن (۵۶) کہانیاں ہیں جو 'گپت دھن' کی دو جلدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ اس طرح پریم چند کی کہانیوں کی تعداد دو سو تہتر (۲۷۳) قرار پاتی ہے۔ ان مجموعوں میں کہانیاں بغیر کسی ترتیب و انتخاب کے شائع کی گئی ہیں، جن سے قارئین کو ان کے زمانے کے تعین میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ بریں امرت رائے نے 'حضرت علی' عنوان کے مضمون کو کہانی قرار دے کر ذکر کیا ہے، جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے ؎۲ اس طرح کہانیوں کی مجموعی تعداد دو سو چوہتر (۲۷۴) ہو جاتی ہے۔

؎۱ رام دین گپت : پریم چند اور گاندھی واد ص ۲۸۱

؎۲ امرت رائے : پریم چند قلم کا سپاہی ص ۶۶۴

امرت رائے نے ان میں سے دو سو چوبیس (۲۲۴) کہانیوں کی پہلی اشاعت کا زمانہ معلوم کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے[۵۱] جن کا ذیل کے گوشوارہ سے مقابلہ کیا جائے تو جا بجا اختلاف بھی نظر آئے گا۔ کیوں کہ راقم السطور نے امرت رائے کی تلاش کردہ تاریخوں کے قبل کی تاریخیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سریندر آنند نے پریم چند کی کہانیوں کی مجموعی تعداد دو سو بہتر (۲۷۲) بیان کی ہے اور کسی غلط فہمی میں پڑ کر بعض کہانیوں کے مختلف عنوانات درج کر دیے ہیں جس سے مطالعہ کی دشواریوں میں اضافہ ہوتا ہے۔[۵۲]

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے پریم چند کی کہانیوں کے بنیادی حقائق پر کام کرنے کی خصوصی ضرورت ہے۔ پورا کام کسی ایک شخص کے بس کی بات بھی نہیں بلکہ مختلف زاویوں سے الگ الگ لوگوں کے متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ پریم چند کی متعدد کہانیاں کئی کئی رسالوں میں طبع ہوتی رہی ہیں، اس لیے کسی ایک رسالہ کی اشاعت کی بنیاد پر اولیت کا فتویٰ نہیں دیا جا سکتا۔ اس وقت کے فیصلے آئندہ کی تحقیق کی روشنی میں بدلتے رہیں گے۔

راقم السطور کے نزدیک پریم چند کی کہانیوں کی مجموعی تعداد دو سو چوہتر (۲۷۴) قرار دینا درست نہیں ہے کیونکہ اس میں تین (۳) ایسی تخلیقات شامل کر لی گئی ہیں جو کہانی کے مروجہ دائرے سے یکسر باہر ہیں۔ ان کا مختصر مضمون 'حضرت علی' سیرت سے متعلق مضامین میں شمار ہونا چاہیے اور ان کے مجموعہ 'کفن' میں شامل شدہ دو نگارشات 'میری پہلی رچنا' اور 'جیون سار' کو سوانحی مضامین کی حیثیت دی جانا چاہیے۔ ان میں آخر الذکر 'ہنس' کے آتم کتھا وشیشناک میں اسی حیثیت سے شایع ہوا تھا۔ ان کے مجموعوں میں دو کہانیاں 'معمہ' اور 'نیا ئیہ' کی الگ الگ عنوانات کے ساتھ تکرار ہو گئی ہے۔ 'معمہ' کے عنوانات 'سمسیا' (مان سرودر جلد ۴) 'دشم سمسیا' (مان سرودر جلد ۸) ہیں اور 'نیا ئیہ' مان سرودر جلد ۲) دوسری بار 'بنی کا نیتی نرواہ' (گپت دھن جلد ۲) میں شائع ہوئی۔ ان کے علاوہ 'بمبوق' کے فرضی نام کی 'تانگے والے کی بڑ' (زمانہ ستمبر ۱۹۱۶ء) اور 'شادی کی وجہ' (زمانہ مارچ ۱۹۲۷ء) کو امرت رائے نے پریم چند کی کہانیوں میں شامل کیا ہے[۵۳] اس کی بنیاد یہ ہے کہ زمانہ گروپ کے بعض

---

۵۱ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۶۵۷-۶۶۴
۵۲ سریندر آنند: پریم چند کہانی کار ص ۶۷-۵،
۵۳ پریم چند: گپت دھن ج ۲ ص ۱۸۴-۱۹۲

دوست پریم چند کو ازراہ تفنن طبع "بمبوق" کہتے تھے! ۵۱ اس نام سے لکھنے کا نہ تو پریم چند نے کہیں ذکر کیا ہے اور نہ ان کی کہانیوں کی فہرست میں منشی دیا نرائن نگم نے ہی شامل کیا ہے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان نگارشات کی اشاعت اس دور میں (۲۷-۱۹۲۶ء) ہوتی ہے، جب پریم چند کی شہرت نقطۂ عروج پر تھی۔ اگر یہ پریم چند کی تخلیقات ہوتیں تو یقیناً انھیں کے نام سے شائع ہوتیں، نہ کہ کسی ایسے نام سے جو قارئین کے لیے سراسر نامانوس ہو۔ ہمارے خیال میں انھیں پریم چند کی تخلیقات میں شامل کرنا درست نہیں ہے۔ اس طرح امرت رائے کی پیش کردہ تعداد دو سو چوہتر (۲۷۴) میں سات (۷) مضامین (حضرت علی، میری پہلی رچنا، جیون سار، سمسیا، نیا یُہ، تانگے والے کی بڑ اور شادی کی وجہ) کو وضع کر دینے پر ان کی تعداد دو سو سرسٹھ (۲۶۷) رہ جاتی ہے۔

پریم چند کی کہانیوں کے تعین میں ایک دوسرے فرضی نام "پشلم" کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے جو ۱۷-۱۹۱۲ء کے مختلف رسائل میں نظر آتا ہے اور جس کی کہانیاں پریم چند کی کہانیوں سے کسی حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔ مثلاً اسی نام سے شائع شدہ کہانی 'مضمون نگار کی بیوی' (العصر، فروری ۱۹۱۷ء) کہانی کی بناوٹ، خیالات کی ترتیب اور طرزِ تحریر پریم چند کی کہانیوں کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ پریم چند ابتداً اپنے نئے نام کو زمانہ کے لیے مخصوص رکھنا چاہتے تھے۔ پیارے لال شاکر کا بیان ہے: "ان کے افسانے نواب رائے کے نام سے 'ادیب' میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے ایک بار لکھا کہ ادیب کے لیے جو افسانے آپ بھیجتے ہیں، ان میں اپنا نام 'پریم چند' کیوں نہیں لکھتے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں منشی دیا نرائن نگم سے وعدہ کر چکا ہوں کہ پریم چند کے نام سے کسی اور پرچے میں نہ لکھوں گا۔" ۵۲ پیارے لال شاکر ہی 'العصر' کے بھی مدیر تھے، عین ممکن ہے کہ اپنی وضعداری میں انھوں نے متذکرہ بالا کہانی بھی 'پشلم' کے فرضی نام سے شائع کی ہو۔ اس مسئلے پر اہل نظر کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے لیکن موجودہ صورت حال میں 'بمبوق' کی طرح ہی 'پشلم' کی کہانیوں کو بھی پریم چند کی تخلیقات میں نہیں شامل کرنا چاہیے۔

زیرِ نظر مطالعہ میں ایک دلچسپ صورت حال کا ذکر بھی ضروری ہے۔ پریم چند کی

---

۵۱ امرت رائے: گپت دھن ج ۱ ص ۲

۵۲ پیارے لال شاکر: مضمون، منشی پریم چند کی یادیں: زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

غیر معمولی مقبولیت کی بنا پر اردو میں ان کے نام کے فرضی مصنف پیدا ہو گئے جن کی متعدد تخلیقات پریم چند کے نام سے مختلف کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں اور جنھیں دیکھ کر پریم چند کا قاری ششدر رہ جاتا ہے [1]۔ پریم چند کے انتقال کے بعد "سریجیت پریم چند ایم اے" کی ایک کہانی 'پریم کا بلیدان' (سدھا، لکھنؤ: مارچ ۱۹۳۹ء) راقم کی نظر سے گذری، جسے سرسری نظر سے دیکھنے والا بھی اُسے پریم چند کی تخلیق قرار نہیں دے گا۔ اس طرح کی نگارشات سے ہمیشہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، ورنہ پریم چند کے نام سے نہ جانے کیا کیا اور کس کس کی چیزیں شامل ہو جائیں گی!

اسی طرح کی دلچسپ باتوں میں ایک اور کا ذکر پروفیسر فراق گورکھپوری کرتے ہیں۔ انھوں نے راقم السطور سے بیان کیا کہ ایک بار پریم چند اور مجنوں گورکھپوری نے ان کے بیان کردہ پلاٹ پر کہانیاں لکھیں، جو الگ الگ شائع ہوئیں۔ پریم چند کی کہانی 'آبھوشن' مان سرودر جلد ۶ میں ملتی ہے، جس کا مجنوں گورکھپوری کی کہانی سے موازنہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک پلاٹ دو فنکاروں کے ذہنی سطح اور تخلیقی عمل سے کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ یہاں ایک دلچسپ اتفاق کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پریم چند کی دو کہانیاں 'برات' اور 'قاتل کی ماں' جو اردو مجموعوں میں شامل ہیں، شیورانی دیوی کے ہندی مجموعہ 'ناری ہردے' میں شامل ہیں۔ ان کہانیوں کو خود پریم چند نے شیورانی دیوی کے نام سے 'ہنس' میں شائع کیا تھا! اس معمے کے لیے بہتر تھا کہ اسے خود شیورانی دیوی ہی حل کرتیں، راقم السطور کو جب ان سے شرف نیاز حاصل ہوا، وہ اپنی عمر کے اس حصے میں تھیں، جہاں بحث و استفسار کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان دو کہانیوں کے متعلق امرت رائے لکھتے ہیں: "منشی جی کے نام سے یہ کہانیاں کب اور

---

[1] پروفیسر عبدالسلام نے کسی پریم چند کے ناول 'جھنکار' کا ذکر کیا ہے، جو شاہین پبلیکیشنز کراچی سے شائع ہوا ہے۔ (عبدالسلام: اردو ناول بیسویں صدی میں ۱۹۷۳ء)۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اسی طرح کی ۱۸ (اٹھارہ) کتابیں تلاش کی ہیں جو عام طور سے پریم چند کی تخلیقات میں شامل کر لی جاتی ہیں جن میں تذکرہ بالا ناول کے علاوہ باقی ۱۷ (سترہ) کے نام یہ ہیں: (۱) مسافر (۲) کشمکش (۳) دولہن (۴) عشق خاموش (۵) زلزلہ (۶) کپال کنڈلہ (۷) منورمہ (۸) ٹھوکر (۹) طوفان (۱۰) خاموش طبیعت (۱۱) عورت کی محبت (۱۲) لڑکی (۱۳) پربھات (۱۴) کوچوان (۱۵) طلسم مجاز (۱۶) سیرن (۱۷) عشق کا راز
قمر رئیس: تلاش و توازن ۱۹۶۸ء

کیسے اردو میں چھپنے لگیں، رہسیہ کا ادگھاٹن ہوئے بنا ان کہانیوں کو اس سنگرہ میں شامل کرنا ٹھیک نہیں جان پڑا ہو سکتا ہے کہ وے سنگرہ منشی جی کے دیہانت کے بعد پرکاشکوں نے اپنے من سے تیار کر لیے ہوں۔[۱] لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیوں کہ ان کہانیوں میں 'برات' آخری تحفہ (۱۹۳۴ء) اور 'قاتل کی ماں' واردات (۱۹۳۷ء) میں شامل ہے ان مجموعوں کو خود پریم چند نے ترتیب دیا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں پریم چند کی کہانیاں ہیں، جنھیں انھوں نے کسی بنا پر شروع میں اپنی اہلیہ کے نام سے شائع کر دیا تھا لیکن بعد میں خود انھیں اپنے مجموعے میں شامل کر لیا۔ یہاں 'برات' اور 'قاتل کی ماں' پریم چند کی کہانیوں کی فہرست میں شامل کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ نئی کہانیوں کی بھی تلاش و تحقیق کی گئی جس میں مدن گوپال اور بعض دیگر صاحبان نے پانچ کہانیوں کی نشان دہی کی جو رسالوں میں شائع ہوئیں لیکن کسی مجموعے یا فہرست میں شامل نہیں ہیں۔

راقم کو اردو اور ہندی کے مختلف رسائل و اخبارات اور کہانیوں کے مجموعوں سے ۲۵ (پچیس) ایسی کہانیاں دستیاب ہوئیں، جو اب تک کی فہرستوں میں شامل نہیں تھیں یہ کہانیاں راقم السطور کی ترتیب و مقدمہ کے ساتھ ہنس پرکاشن، الہ آباد سے گپت دھن حصہ سوم میں عنقریب شائع ہوں گی۔

اس طرح پریم چند کی تمام کہانیاں ہندی میں بغیر کسی ترتیب و تہذیب کے مان سروور کی آٹھ جلدوں اور گپت دھن کی تین جلدوں اور کفن میں شامل ہیں۔ اردو میں متفرق مجموعے ہیں، جو ہندی کی طرح تہذیب و ترتیب سے بے نیاز اور اغلاط سے پر ہیں۔ راقم السطور نے پریم چند کی تمام کہانیوں کو تاریخی ترتیب کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے ان میں ایسی کہانیاں ہیں جو اب تک نایاب تھیں۔ یہ مجموعہ آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے اور 'جہان پریم چند' کے نام سے زیر طبع ہے زیر نظر تحقیقی مقالے میں پہلی بار تلاش و تحقیق کر کے پریم چند کی اب تک کی دستیاب کہانیوں کی مجموعی تعداد ۲۹۳ (دو سو ترانوے) متعین کی گئی ہے، جن میں امرت رائے کی فہرست کی متذکرہ بالا ۷ (سات) نگارشات شامل نہیں ہیں۔ ان میں اردو اور ہندی کی کہانیاں الگ الگ کی گئی ہیں۔ ان میں ۱۳۲ (ایک سو بتیس) اولاً اردو میں، ۹۲ (بانوے) اولاً ہندی میں بعدہٗ اردو میں اور ۶۹ (انہتر) کہانیاں اب تک اردو میں شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ آیندہ صفحات میں پریم چند کی کہانیوں کا گوشوارہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں تمام کہانیوں کی پہلی اشاعت، اردو اور ہندی مجموعوں کے نام، ان کے اردو اور ہندی کے عنوانات وغیرہ پہلی بار دیے جا رہے ہیں، جن کہانیوں کے عنوانات بعد میں تبدیل ہو گئے، ان کے حوالے بھی موجود ہیں۔

---

[۱] امرت رائے: گپت دھن ج ۱ و ۲ ص ۱۰

پہلی بار اردو میں شائع ہونے والی کہانیاں

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۱	آب حیات	-	صبح امید مارچ ۱۹۲۰ء	-	-
۲	آتمارام	आत्माराम	زمانہ جنوری ۱۹۲۰ء	پریم بتیسی ۔ ۱	مان سرودر ۔ ۷
۳	آخری تحفہ	आखिरी तोहफ़ा	چندن اگست ۱۹۲۱ء	آخری تحفہ	گپت دھن ۔ ۱
۴	آلھا	आल्हा	زمانہ جنوری ۱۹۱۲ء	پریم پچیسی ۱	گپت دھن ۔ ۲
۵	آہ بیکس	ग़रीब की हाय	زمانہ اکتوبر ۱۹۱۱ء	ایضاً / دیہات کے افسانے	مان سرودر ۔ ۸
۶	اشک ندامت		کہکشاں جنوری ۱۹۲۰ء	..	..
۷	اصلاح	पशु से मनुष्य	کہکشاں اپریل ۱۹۲۰ء	پریم بتیسی ۔ ۲	مان سرودر ۔ ۸
۸	اکسیر	ज्योति	عصمت ۱۹۲۳ء	دودھ کی قیمت	ایضاً ۔ ۱
۹	اماوس کی رات	अमावस्या की रात्रि	زمانہ اپریل ۱۹۱۲ء	پریم پچیسی ۲	ایضاً ۔ ۶
۱۰	امرت	अमृत	زمانہ مارچ ۱۹۱۳ء	ایضاً	گپت دھن ۔ ۱
۱۱	اناتھ لڑکی	अनाथ लड़की	زمانہ جون ۱۹۱۴ء	پریم بتیسی ۱	ایضاً ۔ ۱
۱۲	انتقام	प्रतिशोध	زمانہ اکتوبر ۱۹۲۳ء	پریم چالیسی ۱	ایضاً ۔ ۲
۱۳	اندھیر	अंधेर	زمانہ جولائی ۱۹۱۳ء	پریم پچیسی ۲	ایضاً ۔ ۱
۱۴	بازیافت	शांति	اگست ۱۹۲۰ کے قبل	پریم بتیسی ۲	مان سرودر ۔ ۷
۱۵	بانسری		کہکشاں جنوری ۱۹۲۰ء	-	-
۱۶	بانکا زمیندار	बांका ज़मींदार	زمانہ اکتوبر ۱۹۱۳ء	دیہات کے افسانے	گپت دھن ۔ ۱
۱۷	بانگ سحر	शंख़नाद	پریم بتیسی حصہ اول ۱۹۲۰ء کے قبل	پریم بتیسی ۔ ۱	مان سرودر ۔ ۷
۱۸	برات		آخری تحفہ ۱۹۳۴ء کے قبل	آخری تحفہ	-
۱۹	بڑی بہن	.	ادیب جولائی ۱۹۱۱ء	.	.
۲۰	بڑے بابو	बड़े बाबू	بہارستان فروری ۱۹۲۷ء	خاک پروانہ	گپت دھن ۔ ۲
۲۱	بڑے گھر کی بیٹی	बड़े घर की बेटी	زمانہ دسمبر ۱۹۱۰ء	پریم پچیسی ۔ ۱ / دیہات کے افسانے	مان سرودر —

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۲۲	بزم پریشاں	दुस्साहस	زمانہ جون ۱۹۲۲ء	۔	مان سرودر ۔ ۸
۲۳	بعد از مرگ	मृत्यु के पीछे	صبح امید ستمبر ۱۹۲۰ء	۔	ایضاً ۔ ۸
۲۴	بند دروازہ	बंद दरवाज़ा	{پریم چالیسی ۔ ۲ ۱۹۳۰ء کے قبل}	پریم چالیسی ۔ ۲	گپت دھن ۔ ۲
۲۵	بوڑھی کاکی	बूढ़ी काकी	کہکشاں جولائی ۱۹۲۰ء	پریم بتیسی ۲	مان سرودر ۔ ۸
۲۶	بیٹی کا دھن	बेटी का धन	زمانہ نومبر ۱۹۱۵ء	{پریم بتیسی ۱ دیہات کے افسانے}	ایضاً ۔ ۸
۲۷	بے غرض محسن	नेकी	ادیب ستمبر ۱۹۱۰ء	پریم پچیسی ۱	گپت دھن ۔ ۱
۲۸	بینک کا دیولہ	बैंक का दिवाला	کہکشاں فروری ۱۹۱۹ء	پریم بتیسی ۱	مان سرودر ۔ ۷
۲۹	پچھتاوا	पछतावा	زمانہ نومبر ۱۹۱۴ء	{پریم بتیسی ۱ دیہات کے افسانے}	ایضاً ۔ ۶
۳۰	پنچایت	पंचपरमेश्वर	زمانہ مئی جون ۱۹۱۶ء	ایضاً	ایضاً ۔ ۷
۳۱	تالیف قلب	आदर्श-विरोध	تہذیب نسواں ستمبر ۱۹۲۲ء	۔	ایضاً ۔ ۸
۳۲	تحریک	प्रेरणा	{خاک پروانہ اپریل ۱۹۲۸ء کے قبل}	خاک پروانہ	ایضاً ۔ ۴
۳۳	ترسول	तिरसूल	{پریم چالیسی ۔ ۱ ۱۹۳۱ء کے قبل}	پریم چالیسی ۔ ۱	گپت دھن ۔ ۲
۳۴	تریا چرتر	त्रिया-चरित्र	زمانہ جنوری ۱۹۱۳ء	پریم پچیسی ۔ ۲	ایضاً ۔ ۱
۳۵	جگنو کی چمک	जुगनू की चमक	زمانہ اکتوبر ۱۹۱۶ء	۔	مان سرودر ۔ ۶
۳۶	حج اکبر	महातीर्थ	زمانہ ستمبر ۱۹۱۷ء	پریم بتیسی ۲	ایضاً ۔ ۷
۳۷	حسن انتخاب	परीक्षा	العصر دسمبر ۱۹۱۴ء	۔	ایضاً ۔ ۸
۳۸	حسن ظن	लोकमत का सम्मान	زمانہ اکتوبر ۱۹۲۲ء	۔	ایضاً ۔ ۷
۳۹	حقیقت	तथ्य	زادراہ ۱۹۳۶ء کے قبل	زادراہ	کفن
۴۰	خاکِ پروانہ[1]	अपनी करनी	زمانہ ستمبر اکتوبر ۱۹۱۴ء	خاک پروانہ	گپت دھن ۔ ۱
۴۱	خنجرِ وفا	वफ़ा का ख़ंजर	زمانہ نومبر ۱۹۱۸ء	پریم پچیسی ۔ ۲	ایضاً ۔ ۱
۴۲	خواب پریشاں	अनिष्ट शंका	کہکشاں اگست ۱۹۱۹ء	ایضاً	مان سرودر ۔ ۸
۴۳	خودی	ख़ुदी	خاک پروانہ اپریل ۱۹۲۸ء کے قبل	خاک پروانہ	گپت دھن ۔ ۲
۴۴	خوفِ رسوائی		ادیب ستمبر ۱۹۱۱ء	۔	۔

[1] پہلی اشاعت میں عنوان ، شامت اعمال ، تھا ۔

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۴۵	خون حرمت	इज़्ज़त का ख़ून	صبح امید ستمبر ۱۹۱۹ء	پریم پچیسی ۲	گپت دھن ۲
۴۶	خون سفید	ख़ून सफ़ेद	زمانہ جولائی ۱۹۱۴ء	ایضاً	مان سرودر ۸
۴۷	دارا شکوہ کا دربار		آزاد، ستمبر ۱۹۰۸ء	۔	۔
۴۸	داروئے تلخ		ہمدرد، ۱۷ جولائی ۱۹۱۲ء	۔	۔
۴۹	دستِ غیب	प्रारब्ध	زمانہ اپریل ۱۹۲۱ء	خواب و خیال	ایضاً ۷
۵۰	دعوت شیراز	दुराशा	خواب و خیال ۱۹۲۸ء کے قبل	ایضاً	ایضاً ۶
۵۱	دفینہ	गुप्तधन	ادب لطیف سالنامہ ۳۹ء	۔	ایضاً ۸
۵۲	دفتری	दफ़तरी	کہکشاں اکتوبر ۱۹۲۹ء	پریم بتیسی ۱	ایضاً ۷
۵۳	دیر و حرم	मंदिर और मस्जिद	آزاد ۱۹۲۵ء		گپت دھن ۲
۵۴	دنیا کا سب سے انمول رتن	दुनिया का सबसे अनमोल रतन	سوز وطن جون ۱۹۰۸ء کے قبل	سوز وطن	ایضاً ۱
۵۵	دو بھائی	दो भाई	زمانہ جنوری ۱۹۱۶ء	پریم بتیسی ۱	مان سرودر ۷
۵۶	دوسری شادی	दुसरी शादी	چندن ستمبر ۱۹۳۱ء	۔	گپت دھن ۲
۵۷	دونوں طرف سے		زمانہ مارچ ۱۹۱۱ء	۔	۔
۵۸	دھوکا	धोखा	زمانہ نومبر ۱۹۱۶ء	پریم بتیسی ۱	مان سرودر ۶
۵۹	دھوکے کی ٹٹی		ادیب نومبر ۱۹۱۲ء	۔	۔
۶۰	دیوی	देवी	پریم چالیسی حصہ اول ۱۹۳۰ء کے قبل	پریم چالیسی ۱	گپت دھن ۲
۶۱	راجپوت کی بیٹی	मर्यादा की वेदी	زمانہ جنوری ۱۹۱۷ء	پریم بتیسی ۱	مان سرودر ۶
۶۲	راج ہٹ	राजहठ	زمانہ دسمبر ۱۹۱۲ء	پریم پچیسی ۱	گپت دھن ۱
۶۳	راجہ ہردول	राजा हरदौल	زمانہ اپریل ۱۹۱۱ء	ایضاً	مان سرودر ۶
۶۴	رانی سارندھا	रानी सारंधा	زمانہ ستمبر ۱۹۱۰ء	ایضاً	ایضاً
۶۵	راہِ خدمت	सेवामार्ग	زمانہ جون ۱۹۱۸ء	پریم بتیسی ۲	ایضاً ۸
۶۶	روحِ حیات		زمانہ جنوری ۱۹۲۱ء	۔	۔
۶۷	روشنی		ادبی دنیا نومبر ۱۹۳۲ء	واردات	۔

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۶۸	روئے سیاہ		صبح امید نومبر ۱۹۲۰ء		
۶۹	زنجیر ہوس	बासना की कड़ियां	کہکشاں ستمبر اکتوبر ۱۹۱۸ء	پریم بتیسی ۲	گپت دھن-۱
۷۰	سانپ کی معشوقہ ؎۱	नाग पूजा	ہزار داستان جولائی ۱۹۲۲ء		مان سرودر-۷
۷۱	ستی	सती	آخری تحفہ ۱۹۳۴ء کے قبل	آخری تحفہ	ایضاً-۴
۷۲	سر پُر غرور	घमंड का पुतला	زمانہ اگست ۱۹۱۶ء	پریم بتیسی ۱	ایضاً
۷۳	سکون قلب ؎۲	शांति	عصمت ۱۹۳۴ء	واردات / دودھ کی قیمت	ایضاً-۱
۷۴	سگِ لیلی		ادیب اپریل ۱۹۱۲ء	۔	۔
۷۵	سوانگ	स्वांग	جامعہ جنوری ۱۹۲۵ء	واردات	گپت دھن-۲
۷۶	سودائے خام		نیرنگ دہلی ۱۹۳۴ء		
۷۷	سوتیلی ماں	विमाता	کہکشاں جون ۱۹۱۹ء	پریم بتیسی-۲	مان سرودر-۸
۷۸	سیر درویش	शाप	زمانہ اپریل تا جون ۱۹۱۰ء	حب وطن	ایضاً-۶
۷۹	شدھی		خواب و خیال ۱۹۲۸ء کے قبل	خواب و خیال	۔
۸۰	شعلۂ حسن	ज्वालामुखी	زمانہ مارچ ۱۹۱۷ء	۔	ایضاً-۸
۸۱	شکار	शिकार	زمانہ جون ۱۹۱۰ء	آخری تحفہ	ایضاً-۱
۸۲	شکاری راجکمار	शिकारी राजकुमार	زمانہ اگست ۱۹۱۴ء	پریم بتیسی ۲	مان سرودر-۸
۸۳	شیخ مخمور	शेख़ मख़मूर	سوز وطن جون ۱۹۰۸ء کے قبل	سوز وطن	گپت دھن-۱
۸۴	صرف ایک آواز	सिर्फ़ एक आवाज़	زمانہ اگست ستمبر ۱۹۱۳ء	پریم پچیسی ۲	ایضاً
۸۵	صلۂ ماتم	शोक का पुरस्कार	سوز وطن جون ۱۹۰۸ء کے قبل	سوز وطن	ایضاً
۸۶	عالم بے عمل	नसीहतों का दफ़्तर	زمانہ مئی جون ۱۹۱۲ء	۔	ایضاً
۸۷	عشق دنیا و حب وطن	सांसारिक प्रेम और देश-प्रेम	زمانہ اپریل ۱۹۰۸ء	سوز وطن	ایضاً
۸۸	عیدگاہ	ईदगाह	عصمت سالگرہ نمبر ۳۳ء	دودھ کی قیمت	مان سرودر-۱
۸۹	غم نہ داری بز بخر	कोई दुख न हो तो बकरी खरीद लो	واردات ۱۹۳۶ء کے قبل	واردات	گپت دھن-۲

؎۱ 'ناگ جی' عنوان سے تہذیب نسواں میں ۵ ر اور ۲۲ ر اگست ۱۹۲۲ کو قسط وار شائع ہوئی۔
؎۲ واردات میں کہانی کا عنوان 'شانتی' ہے۔

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۹۰	غیرت کی کٹاری	ग़ैरत की कटार	زمانہ جولائی ۱۹۱۵ء	پریم بتیسی ۲	گپت دھن-۱
۹۱	فتح [1]	विजय	زمانہ اپریل ۱۹۱۸ء	ایضاً ۲	ایضاً-۱
۹۲	قاتل	क़ातिल	آخری تحفہ ۱۹۳۴ء کے قبل	آخری تحفہ	ایضاً-۲
۹۳	قاتل کی ماں		واردات ۱۹۳۶ء کے قبل	واردات	•
۹۴	قوم کا خادم	राष्ट्र सेवक	پریم چالیسی ۱-۱۹۳۰ کے قبل	پریم چالیسی ۱	گپت دھن-۲
۹۵	کپتان	कप्तान साहब	زمانہ دسمبر ۱۹۱۷ء	خاک پروانہ	مان سروور-۵
۹۶	کرشمۂ انتقام		زمانہ فروری ۱۹۱۱ء	•	•
۹۷	کرموں کا پھل	कर्मों का फल	پریم پچیسی ۲، ۱۹۱۸ء کے قبل	پریم پچیسی ۲	گپت دھن-۱
۹۸	کرکیٹ میچ	क्रिकेट मैच	زمانہ جولائی ۱۹۳۷ء	•	ایضاً-۲
۹۹	کسم	कुसुम	عصمت سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء	دودھ کی قیمت	مان سروور-۲
۱۰۰	کفن	कफ़न	جامعہ دسمبر ۱۹۳۵ء	•	کفن
۱۰۱	کیفر کردار		ادیب جولائی ۱۹۱۲ء	•	•
۱۰۲	گناہ کا اگن کنڈ	पाप का अग्निकुंड	زمانہ مارچ ۱۹۱۰ء	پریم پچیسی ۱	مان سروور-۶
۱۰۳	لال فیتہ	लाल फ़ीता	زمانہ جولائی ۱۹۲۱ء	خواب و خیال	پریم چتر کھی
۱۰۴	ماتا	ममता	زمانہ فروری ۱۹۱۲ء	پریم پچیسی ۱	کفن-۵
۱۰۵	مایۂ تفریح	विनोद	زمانہ فروری ۱۹۲۵ء	خواب و خیال	مان سروور-۳
۱۰۶	مریدی	गुरुमंत्र	فردوس خیال ۱۹۲۹ء کے قبل	فردوس خیال	ایضاً
۱۰۷	مرض مبارک	मुबारक बीमारी	پریم پچیسی ۱ ۱۹۱۵ء کے قبل	پریم پچیسی-۱	گپت دھن-۱
۱۰۸	مرہم	विस्मृति	زمانہ جنوری فروری ۱۹۱۵ء	ایضاً-۲	مان سروور-۷
۱۰۹	مزارِ آتشیں	अग्निसमाधि	مرقع جنوری ۱۹۲۸ء	خاک پروانہ	ایضاً-۵
۱۱۰	مس پدما	मिस पद्मा	زادراہ ۱۹۳۶ء کے قبل	زادراہ	ایضاً-۲
۱۱۱	مشعل ہدایت	उपदेश	زمانہ مئی ۱۹۱۷ء	دیہات کے افسانے	ایضاً-۸
۱۱۲	معمہ [2]	विषम समस्या	زمانہ مارچ ۱۹۲۱ء	•	ایضاً-۸

[1] یہی کہانی 'سمسیا' کے نام سے بھی مان سروور-۴ میں شامل ہے۔
[2] کہکشاں میں بھی شائع ہوئی۔

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۱۱۳	ملاپ	मिलाप	زمانہ جون ۱۹۱۳ء	زادراہ	گپت دھن-۱
۱۱۴	مناون	मनावन	زمانہ جولائی ۱۹۱۲ء	پریم پچیسی ۲	ایضاً - ۱
۱۱۵	منتر	मंत्र	زمانہ فروری ۱۹۲۸ء	پریم چالیسی ۱	مان سرودر-۵
۱۱۶	منزل مقصود	आखिरी मंज़िल	زمانہ اگست ستمبر ۱۹۱۱ء	پریم پچیسی-۲	گپت دھن-۱
۱۱۷	موٹھ	मूठ	زمانہ جنوری ۱۹۲۲ء	خواب وخیال	مان سرودر-۸
۱۱۸	مہر پدر[ملہ]	पुत्र-प्रेम	زمانہ جولائی ۱۹۲۰ء	۰	گپت دھن-۲
۱۱۹	نادان دوست	नादान दोस्त	اپریل ۱۹۲۸ء کے قبل	خاک پروانہ	ایضاً
۱۲۰	نغمہ روح	आत्म-संगीत	نیرنگ خیال مارچ اپریل ۱۹۲۷ء	ایضاً	مان سرودر-۵
۱۲۱	نگاہ ناز	धर्मसंकट	زمانہ مئی ۱۹۱۳ء	پریم بتیسی ۱	ایضاً-۸
۱۲۲	نمک کا داروغہ	नमक का दरोग़ा	اوائل ۱۹۱۵ء کے قبل	پریم پچیسی ۱	مان سرودر-۸
۱۲۳	نوک جھونک	ब्रह्म का स्वांग	زمانہ دسمبر ۱۹۲۰ء	خواب وخیال	ایضاً-۸
۱۲۴	نیچ ذات کی لڑکی	शूद्रा	زمانہ دسمبر ۱۹۲۵ء	۰	ایضاً-۲
۱۲۵	نیک بختی کے تازیانے	सौभाग्य के कोड़े	فردوس خیال ۱۹۲۹ء کے قبل	فردوس خیال	ایضاً-۳
۱۲۶	نئی بیوی	नया विवाह	افسانہ لاہور مئی ۱۹۳۲ء	واردات	ایضاً-۲
۱۲۷	وطن کی قیمت	..	نیرنگ دہلی جنوری ۱۹۳۱ء	.	.
۱۲۸	وفا کا دیوتا	स्मृति का पुजारी	عصمت سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء	دودھ کی قیمت	مان سرودر-۴
۱۲۹	وفا کی دیوی	..	آخری تحفہ ۱۹۳۴ء کے قبل	آخری تحفہ	.
۱۳۰	وکرمادت کا تیغہ	विक्रमादित्य का तेग़ा	زمانہ جنوری ۱۹۱۱ء	پریم پچیسی ۱	گپت دھن ۱
۱۳۱	ہولی کی چھٹی	होली की छुट्टी	زادراہ جولائی ۱۹۳۶ء کے قبل	زادراہ	ایضاً-۲
۱۳۲	یہی میرا وطن ہے	यही मेरा मातृभूमि है	سوز وطن جون ۱۹۰۸ء کے قبل	سوز وطن	مان سرودر-۶

ملہ یہ کہانی اردو میں شائع ہونے کے ایک ماہ قبل سرسوتی جون ۱۹۲۰ء میں شائع ہو گئی تھی۔ غالباً اردو اور ہندی میں ساتھ ساتھ بھیجی گئی تھی۔

پہلی بار ہندی اور پھر اردو میں شائع ہونے والی کہانیاں

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۱	آخری حیلہ	आखिरी हीला	ہنس اپریل ۱۹۳۱ء		مان سروور-۱
۲	آشیاں برباد	जेल	ہنس فروری ۱۹۳۱ء	زاد راہ	ایضاً-۷
۳	آنسوؤں کی ہولی	आंसुओं की होली	پریم تیرتھ ۱۹۲۹ء کے قبل	پریم چالیسی	ایضاً-۵
۴	ابھاگن	निर्वासन	چاند جون ۱۹۲۴ء	ایضاً-۲	ایضاً-۳
۵	ادیب کی عزت	लेखक	ہنس نومبر ۱۹۳۱ء	آخری تحفہ	کفن
۶	استعفیٰ	इस्तीफ़ा	بھارتیندو دسمبر ۱۹۲۸ء	پریم چالیسی-۱	مان سروور-۵
۷	الزام	लांछन	مادھوری اگست ۱۹۲۶ء	ایضاً	ایضاً
۸	امتحان	परीक्षा	پریم پرسون ۱۹۲۶ء کے قبل	ایضاً-۲	ایضاً-۲
۹	انسان کا مقدس فرض	मनुष्य का परमधर्म	سودیش مارچ ۱۹۲۰ء	ایضاً-۱	ایضاً-۳
۱۰	انصاف کی پولیس	खुदायी फ़ौजदार	چاند نومبر ۱۹۳۴ء	دیہات کے افسانے / واردات	ایضاً-۲
۱۱	ایمان کا فیصلہ	ईश्वरी न्याय	سرسوتی جولائی ۱۹۱۷ء	پریم بتیسی-۲	ایضاً-۵
۱۲	بدنصیب ماں	बेटों वाली विधवा	چاند نومبر ۱۹۳۲ء	واردات	ایضاً-۱
۱۳	بڑے بھائی صاحب	बड़े भाई साहब	ہنس نومبر ۱۹۳۴ء	زاد راہ	ایضاً-۱
۱۴	بھاڑے کا ٹٹو	भाड़े का टट्टू	مادھوری جولائی ۱۹۲۵ء	فردوس خیال	ایضاً-۳
۱۵	بھوت	भूत	مادھوری اگست ۱۹۲۴ء	ایضاً	ایضاً-۴
۱۶	بوہنی	बोहनी	بھارت ۱۹۲۸ء	پریم چالیسی ۱	گپت دھن-۲
۱۷	بیوی سے شوہر	पत्नी से पति	مادھوری اپریل ۱۹۳۰ء	ایضاً ۲	مان سروور-۷
۱۸	پوس کی رات	पूस की रात	مادھوری مئی ۱۹۳۰ء	ایضاً	ایضاً-۱
۱۹	تالیف	मंत्र	مادھوری فروری ۱۹۲۶ء	خاک پروانہ	ایضاً-۵
۲۰	توبہ	दीक्षा	مادھوری ستمبر ۱۹۲۴ء	فردوس خیال	ایضاً-۳
۲۱	تہذیب کا راز	सभ्यता का रहस्य	مادھوری مارچ ۱۹۲۵ء	ایضاً-۲	ایضاً-۴

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۲۲	جلوس	जुलूस	ہنس مارچ ۱۹۳۰ء	پریم چالیسی ۲	ایضاً ۔ ۷
۲۳	جنت کی دیوی	स्वर्ग की देवी	چاند ستمبر ۱۹۲۵ء	ایضاً	ایضاً ۔ ۳
۲۴	جہاد	जिहाद	پانچ پھول ۱۹۲۹ء کے قبل	ایضاً	ایضاً ۔ ۷
۲۵	جیل	आहुति	ہنس نومبر ۱۹۳۰ء	آخری تحفہ	کفن
۲۶	چکمہ	कौशल	چاند اگست ۱۹۲۳ء	پریم چالیسی ۲	مان سرور ۳
۲۷	چوری	चोरी	مادھوری ستمبر ۱۹۲۵ء	ایضاً ۔ ۱	ایضاً ۔ ۵
۲۸	حرز جاں	कवच	وشال بھارت دسمبر ۱۹۲۹ء	ایضاً ۔ ۲	گپت دھن ۔ ۲
۲۹	حسرت	नरक का मार्ग	چاند مئی ۱۹۲۵ء	ایضاً ۔ ۲	مان سرور ۳
۳۰	خانہ برباد	विद्रोही	مادھوری نومبر ۱۹۲۸ء	ایضاً ۔ ۱	ایضاً ۔ ۲
۳۱	خانہ داماد	घरजमायी	مادھوری نومبر ۱۹۲۹ء	زاد راہ	ایضاً ۔ ۱
۳۲	داروغہ کی سرگزشت	दरोग़ा जी	مادھوری اگست ۱۹۲۸ء	پریم چالیسی ۔ ۱	ایضاً ۔ ۴
۳۳	درگا مندر	दुर्गा का मंदिर	سرسوتی دسمبر ۱۹۱۷ء	پریم بتیسی ۔ ۲	ایضاً ۔ ۷
۳۴	دعوت	निमंत्रण	سرسوتی نومبر ۱۹۲۶ء	خاک پروانہ	ایضاً ۔ ۵
۳۵	دو بہنیں	दो बहनें	مادھوری اگست ۱۹۳۶ء	دودھ کی قیمت	کفن
۳۶	دو بیل	दो बैलों की कथा	ہنس اکتوبر ۱۹۳۱ء	آخری تحفہ	مان سرور ۔ ۲
۳۷	دودھ کی قیمت	दूध का दाम	ہنس جولائی ۱۹۳۴ء	دودھ کی قیمت	ایضاً ۔ ۲
۳۸	دو سکھیاں	दो सखियां	مادھوری مئی ۱۹۲۸ء	پریم چالیسی ۔ ۲	ایضاً ۔ ۴
۳۹	دینداری	हिंसा परमो धर्मः	مادھوری دسمبر ۱۹۲۶ء	ایضاً ۔ ۱	ایضاً ۔ ۵
۴۰	دیوی	स्त्री और पुरुष	چاند جون ۱۹۲۵ء	ایضاً ۔ ۲	ایضاً ۔ ۳
۴۱	ڈامل کا قیدی	डामुल का क़ैदी	ہنس نومبر ۱۹۳۲ء	زاد راہ	ایضاً ۔ ۲
۴۲	ڈگری کے روپے	डिग्री के रुपये	مادھوری جنوری ۱۹۲۵ء	فردوس خیال	ایضاً ۔ ۳
۴۳	ڈیمانسٹریشن	डिमान्स्ट्रेशन	پریما اپریل ۱۹۳۱ء	آخری تحفہ ہمایوں جنوری ۱۹۲۲ء	ایضاً ۔ ۴
۴۴	رام لیلا	रामलीला	مادھوری اکتوبر ۱۹۲۶ء	پریم چالیسی ۔ ۱	ایضاً ۔ ۵

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۴۵	راہِ نجات	मुक्तिमार्ग	وشال بھارت اپریل ۱۹۲۴ء	فردوسِ خیال	مان سروور ۲
۴۶	ریاست کا دیوان	रियासत का दीवान	ہنس مئی ۱۹۳۴ء	دودھ کی قیمت	ایضاً ۔ ۲
۴۷	زادِ راہ	मृतक-भोज	پرنیا تمھا اپنہ کہانیاں ۱۹۳۲ء کے قبل	زاد راہ	ایضاً ۔ ۴
۴۸	زاویۂ نگاہ	गृहनीति	چاند اگست ۱۹۳۵ء	دودھ کی قیمت	ایضاً ۔ ۲
۴۹	زیور کا ڈبہ	चमत्कार	مادھوری مارچ ۱۹۳۲ء	زاد راہ	ایضاً ۔ ۲
۵۰	ستی	सती	مادھوری مارچ ۱۹۲۷ء	خواب و خیال	ایضاً ۔ ۵
۵۱	ستیاگرہ	सत्याग्रह	مادھوری دسمبر ۱۹۲۲ء	خاکِ پروانہ	ایضاً ۔ ۲
۵۲	سزا	दंड	چاند اکتوبر ۱۹۲۵ء	پریم چالیسی ۲	ایضاً ۔ ۸
۵۳	سوا سیر گیہوں	सवासेर गेहूँ	چاند نومبر ۱۹۲۴ء	فردوسِ خیال	ایضاً ۔ ۴
۵۴	سوت	सौत	سرسوتی دسمبر ۱۹۱۵ء	پریم بتیسی ۔ ۱	ایضاً ۔ ۸
۵۵	سہاگ کا جنازہ	सुहाग का शव	مادھوری جولائی ۱۹۲۸ء	پریم چالیسی ۔ ۱	ایضاً ۔ ۵
۵۶	شراب کی دکان	शराब की दुकान	ہنس مئی ۱۹۳۰ء	نیرنگِ خیال سالنامہ ۱۹۳۱	ایضاً ۔ ۷
۵۷	شطرنج کی بازی	शतरंज के खिलाड़ी	مادھوری اکتوبر ۱۹۲۴ء	خواب و خیال	ایضاً ۔ ۲
۵۸	شکست کی فتح	हार की जीत	مریادا مئی ۱۹۲۲ء	ایضاً	ایضاً ۔ ۸
۵۹	شکوہ شکایت	गिला	ہنس اپریل ۱۹۳۲ء	واردات / جامعہ جنوری ۱۹۲۶ء	ایضاً ۔ ۱
۶۰	طلوعِ محبت	प्रेम का उदय	ہنس جون ۱۹۳۱ء	آخری تحفہ	ایضاً ۔ ۴
۶۱	عبرت	बोध	پریم پورنیما ۱۹۲۰ کے قبل	خواب و خیال	ایضاً ۔ ۸
۶۲	عجیب ہولی	विचित्र होली	سُدرشن مارچ ۱۹۲۱ء	خاک پروانہ	ایضاً ۔ ۲
۶۳	عفو	क्षमा	مادھوری جون ۱۹۲۴ء	پریم پچیسی	ایضاً ۔ ۳
۶۴	علاحدگی	अलग्योझा	مادھوری اکتوبر ۱۹۲۹ء	خاک پروانہ	ایضاً ۔ ۱
۶۵	فکرِ دنیا	अधिकार चिंता	مادھوری اگست ۱۹۲۲ء	ایضاً	ایضاً ۔ ۶
۶۶	فریب	लांछन	مادھوری فروری ۱۹۳۱ء	زاد راہ	ایضاً ۔ ۱

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۶۷	فلسفی کی محبت	त्यागी का प्रेम	مریادا نومبر ۱۹۲۱ء	خواب و خیال	مان سرودر-۶
۶۸	قربانی	बलिदान	سرسوتی مئی ۱۹۱۸ء	پریم تبلیسی-۱ دیہات کے افسانے	ایضاً-۸
۶۹	قزاقی	कजाकी	مادھوری اپریل ۱۹۲۶ء	پریم چالیسی ۱	ایضاً-۵
۷۰	قہر خدا کا	बासी भात में खुदा का साझा	ہنس اکتوبر ۱۹۳۴ء	زادراہ	ایضاً-۲
۷۱	کش مکش[۱]	आग-पीछा	مادھوری فروری ۱۹۲۹ء	پریم چالیسی-۱	ایضاً-۴
۷۲	کفارہ	प्रायश्चित	سرسوتی جنوری ۱۹۲۹ء	ایضاً	ایضاً-۵
۷۳	گھاس والی	घास वाली	مادھوری دسمبر ۱۹۲۹ء	ایضاً-۲	ایضاً-۱
۷۴	گلی ڈنڈا	गुल्ली-डंडा	ہنس فروری ۱۹۲۹ء	واردات	ایضاً-۱
۷۵	لاٹری	लाटरी	ہنس اکتوبر ۱۹۲۵ء	زادراہ	ایضاً-۲
۷۶	لعنت	जीवन का शाप	ہنس جون ۱۹۳۵ء	ایضاً	ایضاً-۲
۷۷	لیلیٰ	लैला	سرسوتی جنوری ۱۹۲۶ء	فردوس خیال پریم چالیسی ۲	ایضاً-۳
۷۸	مالکن	स्वामिनी	وشال بھارت ستمبر ۱۹۳۱ء	واردات	ایضاً-۱
۷۹	ماں	माँ	مادھوری جولائی ۱۹۲۹ء	پریم چالیسی ۲	ایضاً-۱
۸۰	مجبوری	नैराश्य-लीला	چاند اپریل ۱۹۲۳ء	ایضاً	ایضاً-۳
۸۱	مزارِ اُلفت	दो क़ब्रें	مایا جنوری ۱۹۳۰ء	ایضاً	ایضاً-۴
۸۲	مستعار گھڑی	माँगे की घड़ी	مادھوری جولائی ۱۹۲۷ء	خاک پروانہ	ایضاً-۴
۸۳	معصوم بچہ	बालक	ہنس اپریل ۱۹۳۳ء	واردات	ایضاً-۲
۸۴	مفت کرم داشتن	मुफ़्त का यश	ہنس اگست ۱۹۳۴ء	ایضاً	ایضاً-۲
۸۵	مندر	मंदिर	چاند مئی ۱۹۲۷ء	پریم چالیسی ۱	ایضاً-۵
۸۶	نجات	सद्गति	وشال بھارت اکتوبر ۱۹۳۱ء	آخری تحفہ	ایضاً-۴
۸۷	نخلِ امید	कामना तरु	مادھوری اپریل ۱۹۲۷ء	خواب و خیال	ایضاً-۵
۸۸	نزولِ برق	वज्रपात	مادھوری مارچ ۱۹۲۴ء	فردوس خیال	ایضاً-۳

[۱] بعض ایڈیشنوں میں کہانی کا عنوان "حسن و شباب" لکھا گیا ہے۔

نمبر شمار	اردو نام	ہندی نام	پہلی اشاعت	اردو مجموعہ	ہندی مجموعہ
۸۹	نیکی کی سزا	सज्जनता का दंड	سرسوتی مارچ ۱۹۱۶ء	[1]	مان سرور ـ ۸
۹۰	نیور	नेउर	ہنس جنوری ۱۹۳۳ء	زادِ راہ	ایضاً ـ ۲
۹۱	وراگ	वैराग्य	سوادھینتا [2]	ماہنامہ شاعر مئی جون ۱۹۶۹ء	۰
۹۲	وفا کی دیوی	देवी	چاند اپریل ۱۹۲۵ء	ایضاً	گیت دھن ـ ۲

صرف ہندی میں شائع ہونے والی کہانیاں

نمبر شمار		ہندی نام	پہلی اشاعت	ہندی مجموعہ
۱	آبھوشن	आभूषण	مادھوری اگست ۱۹۲۳ء	مان سرور ۶
۲	آپ بیتی	आप बीती	مادھوری جولائی ۱۹۲۳ء	ایضاً ـ ۶
۳	آدھار	आधार	پریم پرمود ۱۹۲۶ء کے قبل	ایضاً ـ ۳
۴	ابھلاشا	अभिलाषा	مادھوری نومبر ۱۹۲۸ء	ایضاً ـ ۴
۵	اُدّھار	उद्धार	چاند ستمبر ۱۹۲۴ء	ایضاً ـ ۳
۶	اُنماد	उन्माद	مادھوری جنوری ۱۹۲۱ء	ایضاً ـ ۲
۷	انوبھو	अनुभव	۰	ایضاً ـ ۱
۸	ایک آنچ کی کسر	एक आंच की कसर	۰	ایضاً ـ ۳
۹	ایکٹریس	ऐक्ट्रस	مادھوری اکتوبر ۱۹۲۷ء	ایضاً ـ ۵
۱۰	باباجی کا بھوج	बाबाजी का भोजा	۰	ایضاً ـ ۳
۱۱	بوڑم	बौड़म	پریم پچیسی ۱۹۲۳ء کے قبل	ایضاً ـ ۸

---

[1] امتیاز علی تاج کے نام پریم چند کے خط مورخہ ۱۱ر فروری ۱۹۲۰ء میں ذکر ہے (چٹھی پتری ج ۲ ص۱۱۱) غالباً کہکشاں ہی میں شایع ہوئی۔

[2] ہربنس دوست کو سوادھینتا کے کسی شمارے میں ملی، ندا فاضلی نے اُردو میں منتقل کیا۔

نمبر شمار	ہندی نام		پہلی اشاعت	ہندی مجموعہ
۱۲	بہشکار	बहिष्कर	چاند دسمبر ۱۹۲۶ء	مان سرودر ـ ۵
۱۳	پروت یاترا [1]	पर्वत-यात्रा	مادھوری اپریل ۱۹۲۹ء	گپت دھن ـ ۲
۱۴	پریم سوتر	प्रेम-सूत्र	سرسوتی جنوری ۱۹۲۶ء	ایضاً ـ ۲
۱۵	پریم کی ہولی	प्रेम की होली	•	کفن
۱۶	پسن ہاری کا کنواں	पिसनहारी का कुआं	مادھوری جنوری ۱۹۲۸ء	مان سرودر ـ ۵
۱۷	پنڈت موٹے رام کی ڈائری	पंडित मोटे राम की डायरी	جاگرن جولائی ۱۹۳۴ء	کفن
۱۸	پوروسنسکار	पूर्व-संसकार	مادھوری دسمبر ۱۹۲۲ء	مان سرودر ـ ۸
۱۹	پے پجی	पैपुजी	مادھوری اکتوبر ۱۹۲۵ء	گپت دھن ـ ۲
۲۰	تاوان	तावान	ہنس ستمبر ۱۹۳۱ء	مان سرودر ـ ۱
۲۱	تگادا	तगादा	پرنیا تتھا انیہ کہانیاں ۱۹۲۱ کے قبل	ایضاً ـ ۴
۲۲	تینتر	तेंतर	چاند دسمبر ۱۹۲۴ء	ایضاً ـ ۳
۲۳	ٹھاکر کا کنواں	ठाकुर का कुआं	جاگرن اگست ۱۹۳۲ء	ایضاً ـ ۱
۲۴	جادو	जादू	ہنس مئی ۱۹۳۴ء	ایضاً ـ ۲
۲۵	جرمانہ	जुरमाना	•	کفن
۲۶	جھانکی	झांकी	جاگرن اگست ۱۹۳۲ء	مان سرودر ـ ۱
۲۷	چکمہ	चकमा	نومبر ۱۹۲۲ء	ایضاً ـ ۶
۲۸	دل کی رانی	दिल की रानी	چاند نومبر ۱۹۳۳ء	ایضاً ـ ۱
۲۹	دھکّار	धिक्कार	چاند فروری ۱۹۲۵ء	مان سرودر ـ ۱
۳۰	دھکّار	धिक्कार	مادھوری فروری ۱۹۳۰ء	ایضاً ـ ۳
۳۱	ڈھپور سنکھ	ढपोर-संख	ہنس مارچ ۱۹۳۱ء	ایضاً ـ ۴
۳۲	راج بھکت	राजभक्त	مادھوری فروری ۱۹۲۳ء	ایضاً ـ ۶

[1] پنڈت رتن ناتھ سرشار کے "سیر کوہسار" سے ماخوذ ہے۔

نمبر شمار	ہندی نام		پہلی اشاعت	ہندی مجموعہ
۳۳	رسک سمپادک	रसिक सम्पादक	جاگرن مارچ ۱۹۳۳ء	مان سرور-۱
۳۴	رہسیہ	रहस्य	ہنس ستمبر ۱۹۳۶ء	کفن
۳۵	سبھاگی	सुभागी	مادھوری مارچ ۱۹۳۰ء	مان سرور-۱
۳۶	سجان بھگت	सुजान भगत	مادھوری مئی ۱۹۲۷ء	ایضاً-۵
۳۷	سمپادک موٹے رام شاستری	सम्पादक मोटे राम शास्त्री	مادھوری ستمبر ۱۹۲۶ء	-
۳۸	سمر یاترا	समर-यात्रा	ہنس اپریل ۱۹۳۰ء	ایضاً-۷
۳۹	سوت	सौत	وشال بھارت دسمبر ۱۹۳۱ء	گیت دھن-۲
۴۰	سوتیہ رکھشا	स्वत्व-रक्षा	مادھوری جولائی ۱۹۲۲ء	مان سرور-۸
۴۱	سچائی کا اپہار	सचाई का उपहार	.	ایضاً-۸
۴۲	سوپن	स्वप्न	ونیا جولائی ۱۹۳۰ء	-
۴۳	سہاگ کی ساڑی	सुहाग की साड़ी	اوشا مئی ۱۹۳۰ء	ایضاً-۷
۴۴	سیلانی بندر	सैलानी बंदर	مادھوری فروری ۱۹۲۴ء	گیت دھن-۲
۴۵	غمی	ग़मी	متوالا ۳۱ اگست ۱۹۲۹ء	-
۴۶	فاتحہ	फ़ातिहा	وشال بھارت مارچ ۱۹۲۹ء	مان سرور-۷
۴۷	قانونی کمار	क़ानूनी कुमार	مادھوری اگست ۱۹۲۹ء	ایضاً-۲
۴۸	قیدی	कैदी	ہنس جولائی ۱۹۳۲ء	ایضاً-۲
۴۹	کایر	कायर	وشال بھارت جنوری ۱۹۳۳ء	ایضاً-۱
۵۰	کُتسا	कुत्सा	جاگرن جولائی ۱۹۳۲ء	ایضاً-۲
۵۱	کشمیری سیب	काश्मीरी सेब	ہنس اکتوبر ۱۹۳۶ء	کفن
۵۲	کھچڑ	खुचड़	مادھوری فروری ۱۹۲۹ء	مان سرور-۴
۵۳	گرہ داہ	गृहदाह	جون ۱۹۲۳ء	ایضاً-۶
۵۴	لاگ ڈانٹ	लाग-डाट	جولائی ۱۹۲۱ء	ایضاً-۶
۵۵	ماتا کا ہردے	माता की हृदय	چاند جولائی ۱۹۲۵ء	ایضاً-۳

نمبر شمار	ہندی نام		پہلی اشاعت	ہندی مجموعہ
۵۶	مکتی دھن	मुक्तिधन	مادھوری مئی ۱۹۲۴ء	مان سروور - ۳
۵۷	منوورت	मनोवृत्ति	ہنس مارچ ۱۹۳۴ء	ایضاً - ۱
۵۸	موٹر کی چھینٹیں	मोटर की छींटें	•	ایضاً - ۲
۵۹	موٹے رام جی شاستری	मोटे राम शास्त्री	مادھوری جنوری ۱۹۲۸ء	گپت دھن - ۲
۶۰	میکو	मैकू	ہنس جون ۱۹۳۰ء	مان سروور - ۷
۶۱	نشہ	नशा	چاند فروری ۱۹۳۴ء	ایضاً - ۱
۶۲	نبی کی نیتی نرواہ[۱]	नबी की नीति निर्वाह	سرسوتی مارچ ۱۹۲۴ء	گپت دھن - ۲
۶۳	نیراشیہ	नैराश्य	چاند جولائی ۱۹۲۴ء	مان سروور - ۳
۶۴	ودھونس	विध्वंस	•	ایضاً - ۸
۶۵	وشواس[۲]	विश्वास	چاند اپریل ۱۹۲۵ء	ایضاً - ۳
۶۶	ویر کا انت	वैर का अंत	سرسوتی اپریل ۱۹۲۳ء	ایضاً - ۷
۶۷	ویشیا	वेश्या	چاند فروری ۱۹۳۳ء	ایضاً - ۲
۶۸	ہولی کا اپہار	होली का उपहार	مادھوری اپریل ۱۹۳۱ء	کفن
۶۹	یہ بھی نشہ وہ بھی نشہ	यह भी नशा वह भी नशा		ایضاً

گذشتہ صفحات میں پریم چند کے ہندی اور اردو فن پاروں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اس کی روشنی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ پریم چند نے ۱۹۱۵ء تک محض اردو میں لکھا جن کے ہندی ترجمے دوسروں نے کئے اور ان تراجم پر انھوں نے نظر ثانی کی بھی زحمت نہیں کی ہے۔ اس دور کے پریم چند کی نگارشات کو ہندی کی ادبی تاریخ میں اسی حد تک اہمیت دی جا سکتی ہے کہ اس کے پس منظر میں آئندہ ادوار کے پریم چند کی تشکیل ہوتی ہے۔ ▲ ▲ ▲

[۱] یہ کہانی "تیاگی" کے نام سے 'مادھوری' مارچ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی

[۲] اس کہانی پر الزام لگایا گیا کہ Eternal City سے ماخوذ ہے

بحوالہ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۳۳۴

دور آغاز

دورِ آغاز

۵۵ پریم چند کے تخلیقی عمل کا دورِ اول ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۵ء تک محیط ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی کاوشوں کا نقش اوّل ۱۹۰۰ء قرار دیا تھا اور ۱۹۱۶ء میں ہندی کی طرف رجوع ہوئے۔ ۱۹۰۳ء سے قبل ان کے کسی افسانوی تخلیق کا علم نہیں ___ البتہ مضامین، تبصرے اور انشائیے شائع ہوئے۔ سن ۱۹۰۰ء کو اس لیے مزید اہمیت حاصل ہے کہ اسی سال ۲ر جولائی کو ان کا پہلا تقرر بہرائچ کے ضلع اسکول میں پانچویں ماسٹر کی جگہ پر ہوا۔ حُسن اتفاق ہے کہ پریم چند نے جس سال سے سرکاری ملازمت شروع کی اسی سال سے انھوں نے منضبط طور پر ادبی تخلیق کا آغاز کیا۔ انھوں نے ۱۹۰۴ء میں ٹیچرس ٹریننگ کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا لیکن ریاضی کی تدریس میں معذوری کا اندراج بھی ہوا۔ اسی سال انھوں نے اردو ورناکیولر اسپشل امتحان مع دیگر زبان ہندی پاس کیا۔ اس وقت تک ناول نگار نواب رائے عالم وجود میں آچکے تھے جو ناول نگار پریم چند کا ہراول تھے۔ یہ تخلیقی عمل کا پہلا سرگرم دور ہے جو پرتاب گڈھ، الہ آباد، ہمیرپور اور کانپور کے قیام میں گذرا۔ اسی درمیان ان کا تعارف 'زمانہ' کے مدیر منشی دیا نرائن نگم سے ہوا جنھوں نے ان دنوں اردو میں ایک نیا رسالہ شائع کیا تھا۔ انھیں پابندی سے لکھنے والے ادیب کی ضرورت تھی اور انھیں اپنی نگارشات کی اشاعت کے لیے کسی مناسب رسالے کی۔ نتیجہ میں ابتدا کا رسمی تعارف رفتہ رفتہ یگانگت

ویکجہتی میں تبدیل ہوگیا اور جب پریم چند مئی ۱۹۰۵ء سے جون ۱۹۰۹ء کے درمیان سوا چار سال تک، کان پور میں رہے تو رسمی تعلقات نے دو حقیقی بھائیوں کے پرخلوص رشتے کی شکل اختیار کرلی، جو زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہی۔

پریم چند کی نگارشات میں ابتدا سے حب الوطنی، ایثار و قربانی اور روایت سے بغاوت کے جذبات کی کارفرمائی متوجہ کرتی ہے۔ اس کے محرکات کے تجزیہ و تفہیم کے لیے اس وقت کے ان سیاسی عوامل کو پیش نظر رکھنا ہوگا جنھوں نے ملک کے سیاسی مد و جزر کو انقلابی رجحان میں تبدیل کردیا تھا۔ اس کا رد عمل وسیع تر انداز میں ظاہر ہوا انگریزی سامراج نے عوامی جذبات و عمل کے جوالا مکھی کو چیلنج کیا۔ احکامات و قوانین کی دفعات کی شمشیریں برہنہ کی گئیں لیکن اس سے منزل دار و رسن کی طرف بڑھنے والوں کے عزم و استقلال میں اضمحلال نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ ان کے جذبات میں مجاہدانہ اور والہانہ انداز نظر آنے لگا۔ ۱۹۰۷ء میں پریونشن آف سڈیشس میٹنگ ایکٹ اور ۱۸۱۸ء میں رول III کی تجدید کی گئی ۔۔۔ درِ زنداں کھول دیا گیا۔ حب الوطنی کے نشہ سے سرشار سیاسی رہنما اور محب وطن گرفتار کرلیے گئے، جن کا جرم آزادی کی تمنا تھی مگر جنھیں فرد جرم عطا کیے بغیر جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۷ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیان ملک گیر انقلابی سرگرمیاں نقطۂ عروج پر پہنچنے لگیں۔ راش بہاری گھوش اور اربندو کی شعلہ نوائیوں نے بنگال کو آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا کردیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں علی پور سازش کیس ہوا۔ بنگال کے اس وقت کے گورنر، کلکتہ کے پولیس مجسٹریٹ کنگس فرڈ، اور چندرنگر کے میئر کے قتل کی کوششیں کی گئیں اس وقت کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ نتیجہ میں انگریزی سامراج نے تشدد و بربریت کے دہانے کھول دیے۔ اس زمانے کے دیگر واقعات میں سیاسی مزاحمت، کا ذکر ضروری ہے، جنھیں انگریزوں نے ڈکیتی کا نام دیا تھا۔ جب کلکتہ کا کنگس فرڈ تبدیل ہوکر منظفر پور آگیا تو ۳۰ اپریل ۱۹۰۸ء کو خودی رام بوس (۱۵ برس) اور پرپھل چاکی (۱۷ برس) نے اسے قتل کردینے کا منصوبہ بنایا مگر وہ بچ گیا۔ اس کی بیوی اور کئی دوسرے لوگ مارے گئے۔ پرپھل چاکی نے گولی مار کر خودکشی کرلی لیکن خودی رام بوس بچ نکلے لیکن بعد میں انھیں گرفتار کرلیا گیا اور ۱۱ اگست ۱۹۰۸ء کو سزائے موت دے دی گئی۔ اس قربانی کو ملک گیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھیں مادرِ وطن کے جیالے سپوت کے روپ میں دیکھا گیا۔ ان پر

محبت و عقیدت کے پھول نچھاور کیے گئے۔ اس زمانے کے قومی اخباروں میں تلک کا 'کیسری'، وویکانند کا 'اُنج' اور اروند یوس کا 'بندے ماترم' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انگریزی سامراج نے سیاسی زمین پر پنجۂ استبداد کی گرفت سخت سے سخت تر کردی۔ ۱۹۰۸ء میں کسپلوسیو سبسٹینز ایکٹ اور نیوز پیپر ایکٹ نافذ کیے گئے۔ پریس ایکٹ نے آزادیٔ تحریر کا گلا گھونٹنا شروع کیا اور اخباروں پر سنسر کی قینچی بجلی بن کر گرنے لگی۔ صرف ایک برس (۱۹۱۱ء) میں ساڑھے تین سو پریس، تین سو اخبارات و رسائل اور پانچ سو سے زاید کتابیں ضبط کی گئیں۔ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیان تقسیم بنگال اور سودیشی کے اندولن کے پس منظر میں تحریک آزادی آگ و خون کے دریا میں ہچکولے کھاتی رہی۔ لیکن اس سے عوام میں خوف یا پژمردگی پیدا نہ ہوئی بلکہ انھوں نے تحریک کو نئی سمتوں اور نئے افق سے روشناس کیا۔

پریم چند کی تخلیقات کے دور اول میں ان پر بنگلا ادبیات کے اثرات واضح ہیں۔ اس دور کے پریم چند دیگر زبانوں، خاص کر بنگلا سے قصے کر اپنی کہانیاں تیار کرتے تھے۔ ۷ر جون ۱۹۱۳ء کو مہوبہ سے پریم پچیسی اردو کے ضمن میں منشی دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں:

" اور جنیل کوئی قصہ نہیں۔ ایک ہے سو وہ ادھورا پڑا ہے۔ ہاں ایک قصہ میں نے بنگالی سے اخذ کیا تھا، وہ اگر آپ پسند کریں تو میں بھیج دوں۔ ہاں اس پر اپنا نام نہ دوں گا۔" [۵۱]

اور اسی درمیان شاذ و نادر ہندی سے بھی ترجمہ کرتے تھے۔ ۲۲ر مارچ ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں:

"رن تھمبور کے قلعہ پر ایک چھوٹا سا مضمون 'چھتری متر' سے اخذ کر کے روانہ کرتا ہوں"[۵۲]

۲۲ر مئی ۱۹۱۴ء کو لکھتے ہیں۔" ایک اور قصہ بھی بھیجتا ہوں یہ کچھ عرصہ ہوا بنگلا سے ترجمہ ہو کر 'مریادا' میں نکلا تھا۔ قصہ نہایت دلچسپ ہے ورنہ میں ترجمہ کیوں کرتا۔"[۵۳]

پریم چند کے اردو ہندی افسانوی ادب کے تقابلی مطالعہ کے پس منظر میں ان ترجموں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس درمیان وہ پابندی سے 'زمانہ' کے لیے ہندی سے ترجمہ کرتے رہے۔ ۱۳ر مئی ۱۹۱۰ء کے مکتوب میں ایک اشارہ ملتا ہے کہ شاید منشی نرائن نگم نے کسی ہندی

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱۔ ص۲۲

۵۲ ایضاً ص۲

۵۳ ایضاً ص۳۰

رسالے کی اشاعت کا ارادہ کیا تھا۔ کیوں کہ پریم چند نے انھیں لکھا تھا: "ہندی پرچے کا کیا حشر ہوا۔ یعنی اس کی تجویز کھٹائی میں پڑگئی یا باقی ہے۔ نکلنے والا ہو تو ہندی لکھنے کی عادت ڈالوں۔"[۱] یہاں اہل نظر کی توجہ خصوصیت سے اس اقتباس کے آخری فقرے کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں، جو صاف صاف اعلان کر رہا ہے کہ پریم چند کو نہ صرف ہندی لکھنے کی عادت نہیں تھی۔ بلکہ اس میں مشق کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ بہر حال ہندی کے اس رسالے کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے اس زمانے میں پریم چند پابندی سے 'زمانہ' کے لیے ایک مستقل کالم 'رفتار زمانہ' لکھ رہے تھے جو ہندی اور انگریزی سے ترجمے پر مشتمل ہوتا تھا۔ ۶ فروری ۱۹۱۳ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "اب رہ گئے ہندی رسالے آپ مجھے اپنے ہندی ڈیپارٹمنٹ کا ایڈیٹر سمجھیے۔ میں اخبارات اور رسالوں سے مناسب اور دلچسپ ترجمے کردیا کروں گا۔ کہیں کہیں ان پر نوٹ اور تنقید لکھوں گا۔ ہندی شعرا کے دلچسپ اور مختصر سوانح عمریوں کا سلسلہ بھیجوں گا۔"[۲] ۱۰ نومبر ۱۹۱۴ء کو لکھتے ہیں: "میں اپنی موجودہ حالت کے اعتبار سے روزآنہ اخبار کے لائق کسی طرح نہیں ہوں پھر اردو اور ہندی دونوں کا بار مجھ سے کیوں کر چلے گا۔"[۳] ان میں اپنے نگارشات کے ترجمے بھی شامل ہیں۔ ۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو بستی سے لکھتے ہیں: "زمانہ کے لیے ایک قصہ لکھا ہے۔ میں ہندی میں بھی لکھ رہا ہوں۔ 'سرسوتی' کو ایک مضمون دیا ہے۔ 'پرتاپ' کے لیے لکھا۔ اس لیے زیادہ کام کرنے سے معذور ہوں۔"[۴] ناگری پرچارنی سبھا سے شائع شدہ ایک مضمون کے بارے میں ۱۶ دسمبر ۱۹۱۵ کو لکھتے ہیں: "ناگری پرچارنی میں ظرافت پر ایک بہت عالمانہ مضمون چھپا ہے۔ ترجمہ ہے۔ کہیے تو زمانہ کے لیے کچھ نئے عنوان سے اسی پر لکھ دوں۔ سرقہ بالجبر ہو یا باجازت؟ جواب سے بہت جلد مطلع کیجیے۔ کیوں کہ مضمون لمبا ہے۔"[۵] اردو سے اخذ کرکے ترجمہ کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔

---

[۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱۔ ص۹
[۲] ایضاً ص۱۷
[۳] ایضاً ص۳۶
[۴] ایضاً ص۴۹
[۵] ایضاً ص۵۱

۲۴ نومبر ۱۹۱۵ء کو لکھتے ہیں : " ابھی تک ہندی مجموعہ تیار نہیں ہوا ہے۔ یہ قصے پہلے پہل ہندی میں نکلیں گے اس کے بعد اردو میں بھی۔ ابھی انھیں چھاپ دینے سے ان کا نیا پن جاتا رہے گا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ اپنی اور کہانیاں بھی ترجمہ کرا کر چھاپوں۔" ؎۱ اس خط کا آخری فقرہ غمازی کر رہا ہے کہ پریم چند ہندی میں اپنی کہانیاں کسی دوسرے شخص سے ترجمہ کرا کے شائع کرنا چاہتے تھے۔ ذرا اس دلچسپ صورت حال کا تصور کیا جائے۔ ہندی اردو دونوں میں ایک دوسرے سے ترجمے کا کام خود کرتے ہیں اور اپنی کہانیاں کسی دوسرے سے ہندی میں ترجمہ کرانا چاہتے ہیں! اس کا سبب واضح ہے کہ پریم چند ہندی میں اپنی تخلیقات زبان و بیان کی پختگی کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے جو اس وقت تک ان کے بس کی بات نہ تھی۔

پریم چند کے تخلیقی عمل کے دور اوّل کی ۴۹ (انچاس) کہانیاں اور ۵ (پانچ) ناول اسرار معابد، ہم خرما و ہم ثواب، کشنا، روٹھی رانی اور جلوہ ایثار موجود ہیں۔ اس دور کے کارنامے اردو مزاج و کردار سے لبریز ہیں ان میں فنی زاویۂ نظر سے متعدد خامیاں اور کمیاں بھی ہیں جن پر پریم چند نے آنے والے دور میں قابو پالیا تھا۔ آیندہ سطروں میں ان تخلیقات کا ذکر کیا جائے گا۔

کہانیاں

پریم چند کی تخلیقات کے دور اوّل کی ۲۰ (بیس) کہانیاں ان کی زندگی میں ہندی میں منتقل ہو گئی تھیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں :

(۱) یہی میرا وطن ہے (۲) گناہ کا اگن کنڈ (۳) سیر درویش (۴) تسکار (۵) رانی سارندھا (۶) بڑے گھر کی بیٹی (۷) راجا ہردول (۸) آہ بے کس (۹) ماتما (۱۰) اماوس کی رات (۱۱) نگا ناز (۱۲) تسکاری راج کمار (۱۳) خون سفید (۱۴) پچھتاوا (۱۵) حُسن انتخاب (۱۶) نمک کا داروغہ (۱۷) مرہم (۱۸) بیٹی کا دھن (۱۹) کپتان اور (۲۰) سوت

ان کے علاوہ آگے درج شدہ ۲۱ (اکیس) کہانیاں امرت رائے نے

؎۱ پریم چند : چٹھی پتری ج ۱ ص۵۰

گپت دھن میں ترجمہ کر کے شائع کی ہیں :

(۱) دنیا کا سب سے انمول رتن (۲) شیخ مخمور (۳) صلۂ ماتم (۴) عشق دنیا اور حب وطن (۵) بے غرض محسن (۶) وکرمادت کا تیغہ (۷) منزل مقصود (۸) آلھا (۹) عالم بے عمل (۱۰) مناون (۱۱) راج ہٹ (۱۲) تریا چرتر (۱۳) امرت (۱۴) ملاپ (۱۵) اندھیر (۱۶) صرف ایک آواز (۱۷) بانکا زمیندار (۱۸) اناتھ لڑکی (۱۹) خاک پروانہ (۲۰) فرض مبارک اور (۲۱) غیرت کی کٹاری۔

متذکرہ بالا کہانیوں کے بارے میں کسی طرح کا شبہ نہیں کہ ان کا بعد میں امرت رائے نے ترجمہ کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں : "اردو سے پراپت کہانیوں کو جیوں کا تیوں چھاپ دینا ہندی پاٹھکوں کے پرت انیایہ سمجھ کر میں نے ان کو ہندی کا جامہ پہنایا ہے۔ منشی جی کی اپنی ہندی کا، یعنی کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکا!" ؎۵

اس کے باوجود مندرجہ ذیل ۸ (آٹھ) کہانیاں اردو اخبار و رسائل میں پڑی ہوئی ہیں جن کا ہندی ترجمہ شایع نہیں ہو سکا۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں :

(۱) دارا شکوہ کا دربار (۲) کرشمۂ انتقام (۳) دونوں طرف سے (۴) بڑی بہن (۵) خوف رسوائی (۶) کیفر کردار (۷) دھوکے کی ٹٹی (۸) سگ لیلی

اسی طرح مندرجہ ذیل کہانیاں اردو اخبار و رسائل میں شائع ہوئیں، لیکن اردو مجموعوں میں شائع نہ ہو سکیں :

(۱) دارا شکوہ کا دربار (۲) کرشمۂ انتقام (۳) دونوں طرف سے (۴) بڑی بہن (۵) خوف رسوائی (۶) کیفر کردار (۷) عالم بے عمل (۸) دھوکے کی ٹٹی (۹) سگ لیلی (۱۰) حسن انتقام اور (۱۱) داروئے تلخ۔

متذکرہ بالا کہانیوں میں صرف ایک کہانی 'سوت' ایسی ہے، جو پہلے ہندی ماہنامہ 'سرسوتی' کے دسمبر ۱۹۱۵ کے شمارہ میں شائع ہوئی، پھر اردو پریم بتیسی حصہ اول میں شامل ہوئی۔ اس اکیلی کہانی کے علاوہ تمام کہانیاں پہلے اردو میں شائع ہوئیں اور بعد کو کبھی ہندی میں۔ ان کہانیوں کا ہندی ترجمہ کس نے کیا، اب اس راز کا انکشاف

؎۵ امرت رائے : گپت دھن ج۔ ۱ (دیباچہ) ص۶

ہونا ناممکنات میں نظر آتا ہے۔ مگر اتنا یقینی ہے کہ اس زمانے تک پریم چند نے ہندی میں اتنی صلاحیت نہیں پیدا کی تھی کہ وہ خود ہندی میں ترجمہ کرسکتے۔ موجودہ صورت میں پریم چند کی زندگی میں شائع شدہ کہانیوں کو سر دست سامنے رکھا جا سکتا ہے، اور انھیں تجزیے کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ تمام کہانیوں کا تقابلی مطالعہ پیش کرنا طول امل ہے۔ یہاں ان کی دو منتخب کہانیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ جن میں دیگر کہانیوں کے مقابلے میں تبدیلی کے عناصر زیادہ ہیں :

بڑے گھر کی بیٹی

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہی پہلی کہانی ہے جو پریم چند نام سے پہلی بار دسمبر ۱۹۱۰ء کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ ہندی میں بھی اس کا یہی نام ہے۔ لیکن ہندی میں بعض تبدیلیاں ملتی ہیں۔ شری کنٹھ کے لیے اُردو میں ہے :

"پُرانے رسم و رواج کا ان سے زیادہ پر جوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا۔"

لیکن ہندی میں پرانے رسم و رواج کے معنی "قدیم ہندو تہذیب" لے لیے گئے ہیں۔ ہندی عبارت یہ ہے :

"پراچین ہندو سبھیتا کے گن گان ان کی دھارمکتا کا پردھان انگ تھا"

دوسری جگہ اردو میں ہے :

"یہ اور اسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لیے شری کنٹھ نے اپنے کئی ہم جولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔"

اس کا ہندی ترجمہ چند لفظوں کے اضافے سے یہ ہوا :

" اسی طرح کی وِدّ روہ پورن باتیں کہنے پر سری کنٹھ نے کتنی ہی بار اپنے کئی متروں کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔"

سری کنٹھ کی بیوی آنندی اپنے دیور کے لیے "گوشت پکانے بیٹھی" اس کو ہندی میں "اب وہ نیاو بنجن بنانے بیٹھی"، لکھا گیا ہے۔ اسی طرح عبارت میں ترمیم و اضافہ کی متعدد مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اردو میں ہے :

"سلسلہ تقریر دس بجے رات تک رہا۔ دو تین گھنٹے آنندی نے بے انتہا

اضطراب کے عالم میں کاٹے۔"

اس کو ہندی میں اضافے کے ساتھ یوں لکھا گیا:

"یہ وارتالاپ دس بجے رات تک ہوتا رہا۔ گاؤں کے بھدر پرشوں کو ان باتوں میں ایسا آنند ملتا تھا کہ کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہتی تھی۔ شری کنٹھ کو پنڈ چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ دو تین گھنٹے آنندی نے بڑے کشٹ سے کاٹے۔"

بعض جگہوں پر ترجمہ میں تخفیف کر دی گئی ہے۔ اردو میں آنندی کا مکالمہ ہے:

"مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں نہ اکڑتا پھرتا، بوٹیاں نچوا لیتی، اس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے۔"

اس کا ترجمہ ہندی میں تخفیف کے ساتھ کیا گیا:

"مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں نہ اکڑتا۔"

اس کہانی کے مترجم نے لفظوں کے متبادل تلاش کرنے میں سہل انکاری سے کام لیا ہے۔ اس نے 'نعم البدل' کو ہندی میں 'جگہ'، 'ظاہری خوبیوں' کو 'بیتر پر یہ گنوں' اور 'خط و کتابت' کا ترجمہ 'لکھا پڑھی' کیا ہے۔ سری کنٹھ کے اشتعال انگیز مکالمے کے لیے اردو میں ہے کہ بینی مادھو "یہ کفر زیادہ نہ سن سکے۔" جس کا ترجمہ ہندی میں کیا گیا ہے کہ "ایسی باتیں اور نہ سن سکے" اس طرح کے ترجمے کہانی کے تاثر کو مجروح کرتے ہیں۔ ایک جگہ اردو میں ہے کہ "جیسے چپراس گری کرنے کی بھی تمیز نہیں۔" اس کا ترجمہ ہندی میں کرتے ہوئے 'تمیز' کے بجائے 'شعور' کر دیا گیا: "جیس کو چپراس گری کرنے کا بھی شعور نہیں۔"

مرہم : وسمرتی

یہ کہانی پہلی بار 'زمانہ' میں جنوری فروری ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ ہندی میں اس کا عنوان 'وسمرتی' ہے۔ کہانی ترجمے میں جا بجا سے مختصر کر دی گئی ہے۔ ذیل میں اردو کے متن سے بعض اقتباسات کا ہندی سے مقابلہ کیا جاتا ہے:

(۱) شان سنگھ اور گمان سنگھ کی شادی کے متعلق اردو میں ہے:

"مگر دوسرے لگن کے موقع تک ان کی صورت نظر نہ آتی۔ گاؤں کے منچلے لوگ یہ

تماشہ دیکھنے کے لیے آئے دن ایک نہ ایک سوانگ رچایا کرتے تھے مگر کسی نہ کسی سبب سے یہ تمام سرگرمیاں اکارت اور بے اثر ثابت ہوتیں۔"

اس کا ترجمہ ہندی میں یوں ہے :

"کنتو دوسرے لگن تک وہ اپنا درشن نہ دیتے تھے کسی نہ کسی کارن ان بھائیوں کا یہ پرشرم نش پھل ہو جاتا تھا۔"

(۲) اردو متن کی ایک عبارت ہے :

"جب کوئی شخص ہمارے ساتھ خواہ مخواہ خلوص و یگانگی کے رشتے قائم کرنے لگے تو ہمیں سوچنا چاہیئے کہ آیا اس میں اس کی کوئی غرض تو مخفی نہیں ہے؟ ممکن ہے کہ وہ شخص بذاتہ نیک اور ہمدرد واقع ہوا ہو تو دوربینی کا تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ دیکھیں اس کا دوسروں کے ساتھ کیسا سلوک ہے۔ اگر ہم اپنی سادگی سے اس وہم میں پڑ جائیں کہ کوئی شخص ہم کو زیر بار احسان کرنے کے لیے ہماری حمایت و غم گساری پر آمادہ ہے تو یقینی امر ہے کہ ہم کو دغا بازی کا شکار بننا پڑے گا، کیوں کہ خالص احسان پر بھی زیادہ اعتماد کرنا اندیشے سے خالی نہیں"

اس کی متبادل ہندی عبارت یہ ہے :

"جب کوئی پُرش ہمارے ساتھ اکارن مترتا کا وِوہار کرنے لگے تو ہم کو سوچنا چاہیئے کہ اس میں اس کا کوئی سوارتھ تو نہیں چھپا ہے۔ یدی ہم اپنے سیدھے پن سے ان بھرم میں پڑ جائیں کہ کوئی منش ہم کو کیول انوگرہت کرنے کے لیے ہماری سہائتا کرنے پر تتپر ہے، تو ہمیں دھوکا کھانا پڑے گا۔"

(۳) لکن سنگھ اور دوجی کی محبت کا ذکر اردو میں ہے :

"دل آنکھوں سے باتیں کر لیتے۔ جن میں جتنا اختصار ہے، اتنی ہی بلاغت ہے اور جسے دیوار کا بھی خوف نہیں۔"

ہندی میں آخری فقرے نہیں ہیں، صرف "ہردے نیتر دوارا بات کر لیتے" درج ہے۔

(۴) مقدمہ کی کارروائیوں کے متعلق اردو میں ہے :

"ملزموں کو سشن سپرد کیا اور وعدۂ معشوق کی طرح مقدمے کی پیشیاں ہونے لگیں۔"

ہندی میں 'وعدۂ معشوق' کے ترجمے سے بچنے کے لیے یہ فقرہ اڑا دیا گیا۔

(۵) دوجی کے رویے کے متعلق اردو میں ایک تبصرہ ہے:

"بھائیوں کا فرض تھا کہ دونوں کی شادی کر دیتے۔ رنگین طبع حضرات کو عشقِ خانہ خراب کی یاد آئی۔ امیر اور داغ کے اشعار پڑھنے لگے۔"

ہندی میں امیر اور داغ کے حوالوں سے بچتے ہوئے ترجمہ کیا گیا:

"بھائیوں کا دھرم تھا کہ دونوں کا بیاہ کر دیتے۔"

(۶) اردو میں دونوں بھائیوں کے احساس ندامت کا بیان ہے:

"دل اپنی ذلت و بدنامی سے بیٹھے اور شرم سے جھکے ہوئے تھے۔ جس طرح ندی کی لہر جوش سے متوالی، گرجتی ہوئی کناروں سے ٹکرا کر پھر نیچے کی طرف آتی ہے، اسی طرح دونوں بھائیوں کا جوش ایک بار زور سے بھبک کر اب ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا ساری دنیا ہمارے اوپر ہنس رہی ہے۔ آفتاب کی زریں کرنیں سامنے کے درختوں سے گلے مل رہی تھیں۔ ان پر چڑیاں بیٹھی ہوئی وہی کرتی تھیں، جو آسودگی محلوں میں کرتی ہے۔ کیا وہ بھی دیکھ کر ہنستی تھیں۔ دونوں بھائی اسی طرح سر جھکائے اس درخت کے نیچے سے گذرے۔"

اس کا مختصر ترجمہ ہندی میں کیا گیا:

"ہردے ایمان سے سنکچت اور سر لجّا کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا، مانو ساری پرتھوی ہم پر ہنس رہی ہے۔"

(۷) اردو میں سیتا کو خواب میں دیکھنے کا تفصیلی بیان ہے۔ ترجمہ کرنے میں غیر معمولی اختصار سے کام لیا گیا ہے، جس سے کہانی کا تاثر و عمل دونوں مجروح ہو گیا ہے۔ خواب میں سیتا کی تنبیہہ اس طرح بیان کی گئی ہے کہ واقعہ ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ ہندی عبارت اس طرح ہے:

"سیتا نے اس کو ترسکار سے دیکھ کر کہا۔ تو کلنکنی ہے، میں تجھے اسپرش نہیں کر سکتی، تپسیا کی آنچ میں اپنے کو پوتر کر۔
دوجی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے نشچے کیا، میں اس کلنک کو مٹاؤں گی۔"

(۸) دوجی کی روانگی کے متعلق اردو میں ہے:

"وہ بھوکی، پیاسی ایک عالم وحشت میں چلی جاتی تھی، معلوم نہیں کہاں،"

شاید اس جگہ جہاں ہمدردی کی آواز اور خوشی کا خیال بھی نہ ہو۔"

اس کے ہندی ترجمہ میں آخری فقرے غائب ہوگئے اور صرف "وہ بھوکی، پیاسی، اُنماد کی دشا میں چلی جاتی تھی۔" رہ گیا۔

(۹) صحرا میں چٹان پر بیٹھے ہوئے نیم خوابی کے عالم میں دو جی کی آنکھیں بند ہوگئیں تو اس نے دوبارہ سیتا کو خواب میں دیکھا۔ ہندی میں اس خواب کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ اردو میں ہے۔

(۱۰) کہانی کے خاتمہ کا یہ فقرہ ہندی میں غائب ہے:

"مگر اس سچے جذبات والی بھولی بھالی عورت کی تصویر کبھی آنکھوں سے نہیں مٹ سکتی۔"

اسی طرح لفظوں کے متبادل تلاش کرنے میں مترجم یا ترجموں کی سہل انکاری کی انگنت مثالیں نظر آتی ہیں۔ 'شخص' اور 'کس و ناکس' کے بجائے 'پرش'، 'شیر و شکر' کا ترجمہ 'دودھ'، 'حمایت و غم گساری' کی جگہ پر 'سہایتا'، 'انتقام' کو 'کرودھ'، 'منزلِ مقصود' کے معنیٰ 'انشٹ سادھن کے مارگ'، وغیرہ لکھے گئے ہیں۔ 'بادہ پرستوں کی رات ہوئی' بلا کشانِ محبت جاگے" کا ترجمہ "ولاسیوں کی رات ہوئی سینوگی جاگے"، اور "جہاز پر سے اترتے ہی زخم دفا اور آداب محبت کا سیلاب سا امڈا"، کے بجائے ہندی میں "جہاز سے اترتے ہی پریم کی باڑھ سی آگئی" لکھ دینے پر اکتفا کی گئی۔ بسا اوقات خالص ہندی الفاظ کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ مثلاً 'جیونار' کے بجائے 'بھوجن'، 'ساون' کو 'شراون'، وغیرہ وغیرہ

اسرار معابد : دیوستھان رھسیہ

'اسرار معابد' پریم چند کی پہلی افسانوی تخلیق ہے۔ اس کے مصنف کی حیثیت سے منشی دھنپت رائے عرف نواب رائے الہ آبادی کا نام شائع ہوا۔ اس وقت تک پریم چند نام عالم وجود میں نہیں آیا تھا۔ ان کی نگارشات دھنپت رائے یا نواب رائے کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ یہاں ان کے نام کے ساتھ 'الہ آبادی'، کا مستزاد دلچسپ ہے خاص طور پر اس تخلیق میں، جو ان کی جنم بھومی بنارس سے شائع ہو رہی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دنوں پریم چند کا قیام الہ آباد میں تھا۔ یہیں انھوں نے 'اسرار معابد' لکھا اور اشاعت کے لیے بنارس کے اردو ہفتہ وار 'آوازۂ خلق'، کو ارسال کیا، جس میں ۸۔ اکتوبر ۱۹۰۳ء سے یکم فروری ۱۹۰۵ء تک قسط وار شائع ہوا۔ امرت رائے کو درمیان کا ایک شمارہ یکم ستمبر

۱۹۰۴ء حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شمارہ شائع بھی ہوا تھا یا نہیں۔ درمیان کا ایک شمارہ نہ ہونے کی بنا پر اسے موجودہ صورت میں ہندی میں نامکمل شائع کیا گیا ہے۔

'اسرار معابد، کتابی شکل میں اردو میں شائع نہیں ہو سکا ہے۔ اردو میں پریم چند ادبیات کے ماہرین اس کا ذکر کرتے تھے، لیکن انھوں نے تلاش وجستجو سے دامن بچائے رکھا۔ اتنا کہہ کر اکتفا کرلی کہ 'اسرار محبت، کے نام سے پریم چند کی پہلی تخلیق 'آوازۂ خلق' میں شائع ہوئی اس ناول کی تلاش و دریافت کی سعادت امرت رائے کو حاصل ہوئی۔ اس کے ملنے کی کہانی امرت رائے کی زبانی سنئے: "اسرار معابد (دیوستھان رہسیہ) کا حوالہ مجھ کو دو ایک اردو آلوچناگرنتھوں میں دیکھنے کو ملا۔ لیکن بس اتنا ہی کہ اسرار محبت (!) نام کا ایک قصہ منشی کا بنارس سے نکلنے والے اردو ساپتاہک 'آوازۂ خلق' میں سلسلہ وار نکلا۔ اتنا ہی سوتر کافی ہوا اور اس کو بہت بڑا شبھ سنجوگ ماننا چاہیئے کہ اس پرچے کی فائل مل گئی۔ یہ ایک بہت گمنام سا پرچہ تھا۔ جس کی فائل خود اس کے دفتر میں ہی مل سکتی تھی، اگر ملتی۔ دوسری جگہ اس کے ملنے کی قطعی امید نہیں تھی۔ نصیب اچھا تھا، جو یہ فائل اب تک وہاں سرگشت رہ آئی۔ بیچ کا ایک انک گم ہوگیا ہے۔ جس کا سنکیت یتھا استھان دے دیا گیا ہے۔" ۵۱

'اسرار معابد، کی ہندی اشاعت یوم پریم چند کے موقع پر ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ اس کے قبل اس کا ہندی ترجمہ نہیں ہو سکا تھا۔ یہ خدمت امرت رائے نے سرانجام دی۔ امرت رائے اس کے ترجمے کے بارے میں رقم طراز ہیں: "اس قصہ کو بالکل جیوں کا تیوں نہ چھاپ کر میں نے اُس کا ہندی روپانتر کرنا ٹھیک سمجھا کیونکہ بھاشا جہاں تہاں ہندی پاٹھکوں کے لیے بہت کلشٹ ہوگئی ہے لیکن اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ روپانتر بہت ہلکا روپانتر ہے۔ کم سے کم شبدوں اور واکیانشوں کو بدلا گیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ کیول ارتھ کی یا بھاؤ کی رکشا ہو بلکہ منشی جی کے شیلی کی بھی پوری پوری رکھشا ہو۔" ۵۲

"اسرار معابد، کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے۔ قصہ ایک مرکزی نقطہ کے چاروں طرف بے جان گردش کرتا ہے۔ اس دور کے اکثر وبیشتر قصوں اور داستانوں کی طرح کہانی حادثات کے ذریعہ آگے بڑھتی ہے۔

---

۵۱ امرت رائے: منگلاچرن ص ۹
۵۲ ایضاً "

خاص طور پر پنڈت رتن ناتھ سرشار کے 'فسانۂ آزاد' کی طرح۔ پریم چند پر ان دنوں سرشار کے اثرات حاوی تھے۔ 'اسرار معابد' کی کہانی انھوں نے سرشار کے انداز میں بُنی ہے۔ اُسی طرح ناچ گانے کی محفلیں سجائی ہیں، انھیں کے انداز میں طنز و تعریض کے تیر و سناں برسائے ہیں لیکن دونوں فنکاروں میں نمایاں فرق بھی ہے۔ سرشار کے طنز کے پس پشت عصری آگہی اور سماجی شعور کی نشتریت نہیں ہے جو پریم چند کی پہلی تخلیق میں اپنے تیکھے سماجی زاویۂ نظر کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔

پریم چند کے زاویہ نظر کے مطالعے میں کلیسائی نظام اور پاپائیت کی علامت یہاں کی برہمنیت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مذہب کے نام پر استحصال یورپ کی طرح ہندوستان میں بھی ہوتا رہا ہے بلکہ کسی حد تک یہاں 'چوں بخلوت می روند' کے اعتبار سے اضافہ ہوا ہے۔ عصری آگہی اور سماجی شعور کی سچی بصیرت نے پریم چند کو بالغ نظر اور حساس ادیب کی حیثیت سے استحصال کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ انھوں نے سماجی استحصال کی اس علامت پر تیشہ زنی کی۔ لیکن ان کی تیشہ زنی ان کی برہمن دشمنی کے بجائے برہمنی نظام کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ پنڈت موٹے رام شاستری سے لے کر 'گئودان' کے ماتا دین تک پریم چند برہمنی نظام کے شدید مخالف نظر آتے ہیں۔ ماتا دین کے منھ میں ہڈی کا ٹکڑا ڈال کر گویا بزعم خود برہمنیت کو شدت سے ذلیل و رسوا کر کے اس کی موت کا اعلان کرتے ہیں۔ ان کے اس زاویۂ نظر کو مدنظر رکھ کر 'اسرار معابد' اور 'فسانہ آزاد' کے طنزیات کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے 'اسرار معابد' کی زبان و بیان میں بھی سرشار کی تقلید کی ہے۔ انھیں کی طرح پرشکوہ فارسی و عربی الفاظ و واقعات و روایات، تشبیہہ و استعارہ، محاورے اور ضرب المثل وغیرہ پیش کیے ہیں، جن کے قارئین کب تصور کر سکتے تھے کہ یہی پریم چند کبھی 'گئودان' کی زبان لکھ سکیں گے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "الغرض شیوجی کی رسائی ذکاوت کی خوب تعریف ہوئی بھنگ کی منظوری ہو جانے سے لوگوں نے خوب جشن منایا۔ تمام دیوتاؤں نے اظہار مسرت کیا ملائک نے گل پوشی کی۔ پھولوں کی برکھا ہوئی۔ گندھرو اپسرا آئے اور یہ لاؤنی الاپنا شروع کیا .... الغرض اس لاؤنی کے بعد تمام دیوتا معابد فرما ہوئے اور جلسہ برخاست ہوا۔" [۵۱]

---

۵۱ پریم چند : اسرار معابد صفحہ ۴۲

'اسرار معابد' کے زبان و بیان کا لطف ہندی میں کس حد تک برقرار ہے۔ ذیل میں ناول کی ابتدائی سطریں درج کی جاتی ہیں :

"رات کا وقت! ابھی اس کالی بلا کی پہلی منزل ہے دور سے میٹھے سُروں کی آواز سنائی پڑتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کوکل کنٹھی، گوؤرنی سندری پریمیکا خوب دل توڑ توڑ کر گا رہی ہے۔ درشکوں کو بھاؤ بتا بتا کر لبھا رہی ہے۔ تعریفوں کی بوچھار ہو رہی ہے صدقوں کی بھرمار ہو رہی ہے۔ واہ وا کی صدا بلند ہے ہر شخص کا دل، خورسند ہے محفل کے لوگ سنگیت کی شراب سے مخمور ہیں۔ جلسہ کے شری منت انگوری شراب سے چور ہیں ....." ۵۱

باب سوم کے ابتدائی فقرے یہ ہیں :

"رام کلی جب سیر سپاٹے کرتی مکان پر پہنچی تو وہاں نیا تماشہ دیکھا۔ اُس کا شوہر ڈولی کہارے کر اُسے رخصت کرا لے جانے کو آیا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر رام کلی کا کلیجہ سَن سا ہو گیا۔ لگی دل میں سوچنے کہ یہ نکھٹو طوفان بے تمیزی کی طرح بیچ میں کہاں سے کود پڑا......" ۵۲

زیر نظر ناول کے آخری فقرے بھی دیکھ لیجئے :

جمعراتی ـــــ بھائی یہ تو بڑا بے ڈھب ہوا۔ ہم لوگوں نے تو اپنی اپنی فکر کرلی مگر اس بیچاری کے واسطے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اب یہ ڈیڑھ آنے پیسے بچ رہے ہیں، تھوڑا سا ستّو اور گڑ لے لو۔ اس وقت گذر بسر ہو جائے گی صبح کو اللہ مالک ہے کہیں ٹھکانہ لگ ہی رہے گا۔" ۵۳

متذکرہ بالا تینوں اقتباسات میں اردو اور ہندی الفاظ کا سنسکرت اور عربی رعایتوں کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے :

ہندی الفاظ : کوکل کنٹھی، گوؤرنی وغیرہ

---

۵۱ پریم چند : اسرار معابد ص۳

۵۲ ایضاً ص۵۷

۵۳ ایضاً ص۹۹

اردو الفاظ : خورسند، مخمور، ہمہ تن گوش وغیرہ

'اسرار معابد' کے ترجمہ میں کئی مقامات پر اردو زبان وادب کے الفاظ وروایات ہندی میں منتقل نہیں ہوسکتی تھیں۔ مترجم نے ان کا غلط استعمال کیا ہے، جس سے موجودہ ہندی ایڈیشن میں زبان وبیان کی متعدد خامیاں پیدا ہوگئیں ہیں۔ صرف متذکرہ بالا اقتباسات سے ہی حسب ذیل مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں :

(۱) "محفل کا چراغ دل کی تڑپ کے مارے بیقرار ہے۔"

(۲) "رام کلی کا کلیجہ سن سا ہوگیا۔"

(۳) "طوفان بے تمیزی کی طرح"

مجموعی اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ دیو استھان رہسیہ' اردو ناول 'اسرار معابد' کا ہندی ترجمہ ہے جو پریم چند کے تخلیقی ناولوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

ہم خرما وہم ثواب : پریما

گذشتہ صفحات میں پریم چند کی ابتدائی تخلیقات کے زمانۂ تصنیف واشاعت کے تعین میں 'ہم خرما وہم ثواب' اور 'پریما' کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر نے اس کو ۱۹۰۲ء کی تخلیق قرار دیا ہے۔ ۵۱ جو غیر صحیح ہے۔ اس کے بارے میں خود پریم چند کا بیان جس میں انھوں نے 'ہم خرما وہم ثواب' کو اپنی ابتدائی تصنیف اور ۱۹۰۰ء کی تخلیق بیان کیا ہے۔ اس پر گذشتہ صفحات میں بحث ہوچکی ہے۔ یہ پریم چند کا دوسرا ناول ہے منشی دیانرائن نگم کو ۳۰ جنوری ۱۹۰۵ء کو لکھتے ہیں : "بڑے اشتیاق سے منتظر ہوں کہ آپ نے میرا ناول ابھی تک پڑھا یا نہیں" ۵۲ اور پھر ۲۰ (بیس) دن بعد الہ آباد سے انگریزی میں خط لکھا کہ "دو ماہ سے زائد ہوئے کہ مجھے اپنے ناول کا مسودہ آپ کی خدمت میں آپ کے ملاحظہ کے لیے بھیجنے کا شرف حاصل ہوا۔ امید کہ آپ میرے لیے ایک ناشر مہیا کرنے کی زحمت کریں گے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ دسمبر کی ۸ تاریخ تھی، جب میں نے آپ کو کتاب بھیجی تھی۔" ۵۳

---

۵۱ رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص۱۴۰

۵۲ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص۱

۵۳ ایضاً ص۱

یہی 'اسرارِ معابد' کی اشاعت کا زمانہ بھی ہے، اس لیے کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ مذکرہ بالا مکتوب میں 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ذکر ہے۔

'ہم خرما و ہم ثواب' کا ہندی ترجمہ 'پریما' کے نام سے ۱۹۰۷ میں انڈین پریس الٰہ آباد سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو تسامح ہوا ہے کہ شاید پریم چند شروع سے ہندی اور اردو میں لکھنا جانتے تھے اور دونوں زبانوں میں ادبی کاوش کرتے تھے [۵۱] امرت رائے کا بیان ملاحظہ ہو: "جس آدمی کو ۱۹۱۴ء میں ایک مختصر سا قصہ لکھنے بھر کی بھی ہندی نہیں آتی اس نے ۱۹۰۷ء میں پورا ناول ہندی میں کیسے لکھا؟ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ منشی جی نے اپنے اردو قصے 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ہندی ترجمہ اپنے کسی دوست سے کروا لیا ہوگا۔ اور شاید خود بھی ایک نظر ڈال لی ہو۔" [۵۲] اس بیان کا آخری جزو محل نظر ہے۔ جب پریم چند ۱۹۱۴ء تک ہندی نہ جانتے تھے اور اگر جانتے تھے تو اسی حد تک کہ مختصر سی کہانی بھی ہندی میں نہیں لکھ سکتے تھے تو پھر کس طرح 'پریما' پر نظر ثانی کی۔

'ہم خرما و ہم ثواب' کا اسلوبِ بیان 'اسرارِ معابد' سے مختلف نہیں ہے لیکن یہ اس کے مقابلے میں فنی اعتبار سے زیادہ چست اور فطری ہے۔ دونوں ناولوں میں واقعات کی ترتیب یکساں طور پر کی گئی ہے۔ وہی سماجی زاویہ نظر ہے۔ لیکن اس بار بیوہ کی شادی سے متعلق مسائل و مباحث کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس کی بیوہ دولھن رام کلی 'اسرارِ معابد' سے آئی ہے۔ 'ہم خرما و ہم ثواب' پر رتن ناتھ سرشار کے زبان و بیان کا عکس ہے جس میں فارسی و عربی کے الفاظ و تراکیب، تشبیہات و استعارات اور صنائع و بدائع کی چاشنی متوجہ کرتی ہے اس ناول کو گذشتہ ناول پر وجہ ترجیح بھی حاصل ہے کیوں کہ اس میں پریم چند کے جذبہ حب الوطنی میں نکھار پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہندو ماضی پرستی کی توسیع ہے اس دور کے پریم چند میں جذباتی ہیجان کے آثار ملتے ہیں۔ اپنے شدت جذبات میں انھوں نے الٰہ آباد سے چلتے چلاتے خان بہادر شمس العلماء مولانا مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کی باز پرس کر ڈالی جو ان دنوں الٰہ آباد کے میور سنٹرل کالج میں ریاضی کے استاد تھے۔ منشی پریم چند ان کی کسی تالیف

---

[۵۱] مسعود حسین خاں "گئودان تصنیف یا ترجمہ" فکر و نظر ج ۱۱ شمارہ ۲ ۱۹۷۱ء

[۵۲] امرت رائے: منگلا چرن ص

کو پڑھ کر تڑپ اٹھے تھے۔ کانگریس کے جلسوں کے بحث و مباحثہ کو طالب علمانہ قرار دینا اور خود بخود تحریک کے مردہ پڑ جانے کی پیشین گوئی کلیجے میں تیر کی طرح چبھ گئی تھی۔ انھوں نے زمانہ کے اپریل ۱۹۰۵ء کے شمارے میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ پھر تخلیقی معیاروں پر امرت رائے کا مثالی کردار تیار کیا جو عوامی بیداری اور خدمت خلق کو معیار زندگی قرار دیتا ہے۔

زیر نظر ناول کے تقابلی مطالعے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں اختلافات کی نشان دہی کر دی جائے:

۱۔ اردو اشاعت میں ایک جگہ لالہ جی کے انکار کرنے کا بیان ہے اور ہندی میں پریما کی ماں امرت رائے پر فدا نظر آتی ہے۔ قصے کا انجام دونوں صورتوں میں یکساں ہوتا ہے۔ لیکن واقعات کی ترتیب میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ اردو میں پورنا کا ذکر ہے اور ہندی میں اس کے ساتھ رام کلی اور لکشمی بھی شامل کری گئی ہیں۔

۲۔ مترجم نے بلا کسی سبب کے کئی جگہوں پر اردو کی عام فہم اور پر اثر زبان تبدیل کر دی ہے جس سے تخلیق مجروح ہو گئی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

"خط پڑھتے ہی پورنا کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کو خط کی مختصر عبارت نہیں معلوم کیوں کھٹکنے لگی فوراً بلّو کو بلوایا اور پریما کے خط کا جواب دے کر اُدھر روانہ کیا اور اس کے پاس آنے میں آدھ گھنٹہ جو لگا وہ پورنا نے نہایت بے چینی سے کاٹا۔ نو بجتے بجتے بلّو واپس آئی۔" [۱]

اس کا ہندی ترجمہ یہ ہے:

"خط پڑھتے ہی پورنا کا چتر ویاکُل ہو گیا۔ چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ اور انیک پرکار کی شنکائیں ہونے لگیں۔ یا نارائن اب کیا ہونے لگا۔ لکھتی ہے دیکھو دیر مت کرنا۔ نہیں تو انرتھ ہو جائے گا۔ کیا بات ہے۔" [۲]

یہاں 'یا نارائن' کی ترکیب توجہ طلب ہے جو سراسر اردو کی تقلید میں ہے۔ ہندی میں 'یا' کی جگہ "ہے" کا استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح کی مثالیں ناول میں بکھری پڑی ہیں۔ مترجم نے

---

[۱] پریم چند: ہم خرما و ہم ثواب ص ۲۱۲

[۲] ایضاً: پریما ص ۳۳۹

بسا اوقات اردو نژاد الفاظ کی جگہ پر ہندی الفاظ چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے جس سے عبارت غیر فطری ہوگئی ہے مثلاً 'معزز رؤسا' کی جگہ 'پڑ پر تھسبڑھت رئیسوں'، 'آبائی پیشہ' کے لیے 'کئی پشتوں سے'، 'سرنیاز خم کرنے' کے بجائے 'داب ماننے'، وغیرہ وغیرہ

۳۔ مترجم نے ایک موقع پر عمداً اردو زبان کا ذکر ترک کیا ہے، ایک جگہ انگریزی زود نویسی اور اردو رسم الخط کا ذکر ہے۔ مترجم نے اردو کو ترک کرکے ترجمہ کردیا ہے، اردو الفاظ کے ترک کرنے کی کوشش میں انگریزی الفاظ قبول کرلیے ہیں۔

اسی طرح زیر نظر ناول میں متعدد مقامات پر فرق پیدا ہوگیا ہے اگر اردو میں اختصار ہے تو مترجم نے اپنے طور پر ترمیم و اضافے کردیے ہیں۔ اس سلسلہ میں ذیل کے حقائق پر توجہ دینے کی ضرورت ہے:

۱۔ ہندی ترجمے کا نواں باب اردو کے مقابلے میں غیر معمولی طور پر طولانی ہے۔

۲۔ اردو میں ایک جگہ امرت رائے کا مختصر سا خط ہے جس کے آخر میں لکھا ہے: 'تمھارا شیدائی امرت رائے'، ہندی میں یہ 'شیدائی'، 'تمہاری سیوا کا ابھیلاشی ہوگیا'، اور خط بھی طولانی ہوگیا۔

۳۔ ہندی اور اردو کے پلاٹ میں فرق نہیں ہے لیکن مکالموں اور بیانات میں جا بجا سے ترمیم کی گئی ہے۔

۴۔ ہندی ترجمے میں بعض مکالموں کے درمیان ہندی شعرا کا کلام ہے، جو اردو میں نہیں تھا۔

۵۔ آٹھویں اور بارہویں ابواب کے عنوانات اردو اشعار پر ہیں جنھیں ترجمے میں ترک کردیا گیا ہے۔

۶۔ تیرہویں باب میں 'پریما' کے خط کے بعد سے ہندی اور اردو اشاعتوں میں نمایاں فرق ہوگیا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ مترجم نے ترجمے کے بجائے تخلیق شروع کردی ہے۔

مترجم اور ناشرین نے 'پریما' میں اردو الفاظ و محاورات خصوصاً عربی و فارسی نژاد الفاظ و تراکیب کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے اردو کی مخصوص صوتیات کے پیش نظر ناگری حرف میں نقطوں کا استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح قواعد، انشا، اور استعمال میں اردو کے اثرات واضح ہیں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن کا ہندی ترجمہ نامانوس

اور غیر فطری ہے :

۱۔ "پریما گھنٹوں تک صندوق کو دیکھ دیکھ کر رویا کی۔" ۵۱

۲۔ "پریما ایک ہی ماس میں گل کر کانٹا ہوگئی۔" ۵۲

۳۔ "ہم کو انگریز ممبروں سے کوئی آشا نہیں رکھنا چاہیئے۔" ۵۳

۴۔ "بلّو نے آکر سکھیئی سے حکم لگایا۔" ۵۴

۵۔ "اگر ابھی ساس نے کہنے سننے سے کچھ سجاوٹ کرتی بھی ہے تو اس پر نہیں کھلتا۔" ۵۵

ان حقائق کی روشنی میں ثابت ہوجاتا ہے کہ 'ہم خرما و ہم ثواب'، کے مصنف نے نہ تو خود ترجمہ کیا ہے اور نہ اس وقت تک اس میں ہندی ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہوسکی تھی اس لیے 'پریما' کو ہندی ادبیات کی تاریخ میں مترجمہ ناول کی حیثیت حاصل ہے۔ اسے ہندی کے تخلیقی ناولوں کی صف میں نہیں رکھنا چاہیئے۔

کشنا

پریم چند کے ناولوں میں 'کشنا'، واحد ایسی تخلیق ہے جو ہنوز نایاب ہے لیکن اس کا ذکر تواتر سے ہوتا رہتا ہے۔ 'کشنا'، کا اردو نسخہ بھی ناپید ہے پھر ہندی ترجمہ کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

پنڈت جناردن پرساد جھا دوج نے محض اتنا کہنے پر اکتفا کی ہے کہ پریم چند نے 'پریما' کے قبل ایک ناولٹ 'کرشنا' لکھا تھا۔[۵۶] موصوف اس کے علاوہ کوئی اطلاع فراہم نہیں کرتے۔ منشی پیارے لال شاکر نے 'کشنا'، کو پریم چند کا دوسرا ناول قرار دیا ہے[۵۷]

---

۵۱ پریم چند : پریما ص ۲۴۶

۵۲ ایضاً ص ۲۴۶

۵۳ ایضاً ص ۲۷۵

۵۴ ایضاً ص ۳۲۵

۵۵ ایضاً ص ۳۳۳

۵۶ جناردن پرساد جھا دوج : پریم چند کی اپنیاس کلا ص ۱۴۱

۵۷ پیارے لال شاکر : پریم چند کی یادیں، زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر لکھتے ہیں: ''پرورتی اپنیاسوں میں 'غبن' سے پہلے 'کرشنا' (۱۹۰۵ء) نام سے انڈین پریس الہ آباد میں اردو میں پرکاشت ہوا تھا۔''[۵۱] پنڈت دوبے اور ڈاکٹر بھٹناگر سے ناول کے نام کے سلسلے میں غلطی ہوئی ہے۔ ناول کا نام 'کرشنا' نہیں 'کشنا' ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر کے قول کا دوسرا جُز بھی غیر صحیح ہے۔ انھوں نے اپنی اطلاعات کے مآخذ بھی بیان نہیں کیے ہیں۔ شیورانی دیوی نے 'کشنا' کو پریم چند کا اولین ناول قرار دیا ہے۔[۵۲] پریم چند نے ۲۹ر جنوری ۱۹۲۱ کے مکتوب میں 'کشنا' کو ابتدائی تخلیق بتایا ہے۔ انھوں نے مزید اطلاعیں فراہم نہیں کی ہیں جس سے اس ناول کے بارے میں روشنی پڑتی۔ ہمارے نزدیک 'کشنا' ان کا تیسرا ناول ہے، جو ۱۹۰۷ء میں بنارس کے میڈل ہال پریس میں طبع ہوا۔ 'کشنا' کا پہلا اشتہار اگست ۱۹۰۷ء کے زمانہ میں شائع ہوا، جس سے واضح ہے کہ اس سے قبل ناول شائع ہو چکا تھا۔ پریم چند کے ابتدائی ناولوں کے ذکر میں امرت رائے لکھتے ہیں: ''اب بس ایک ناول بچ رہا ہے، 'کشنا'، جو بہت تلاش کرنے پر بھی آج تک کہیں نہیں ملا۔ بہرحال تلاش جاری ہے ..... امید ہے کہ اگلے دو ایک ورشوں میں وہ بھی کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔''[۵۳] 'منگلا چرن'، وغیرہ کی اشاعت کے بعد سے امرت رائے کی پریم چند ادبیات کی تلاش و جستجو کے عمل میں جمود سا پیدا ہو گیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی توجہ نہیں کی اور اگر کی تو ان کی کوششوں کا کوئی نتیجہ خیز پہلو سامنے نہیں آسکا ہے۔

'کشنا' کے بارے میں تمام تر معلومات کی بنیاد منشی نوبت رائے نظر کا تبصرہ ہے جو اکتوبر ۱۹۰۷ء کے 'زمانہ' میں شائع ہوا۔ موصوف لکھتے ہیں: ''یہ ایک ناول ہے اور سوشل ریفارم سے تعلق رکھتا ہے .... انھوں نے عورتوں میں زیور کے فضول شوق کی اچھی چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ گویا یہ ایک ایسی عورت کی لائف ہے جسے زیوروں کا شوق ہی نہیں بلکہ سنک ہے ... شادی بیاہ کی کچھ رسموں کا بھی خاکہ اڑایا گیا ہے۔ خاص کر قرار داد اور اس کا سختی سے وصول کرنا ... کتاب میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ منشی صاحب کی پُر فصاحت طرز تحریر سے

---

۵۱ رام رتن بھٹناگر: کلا کار پریم چند ص۱۷۵

۵۲ شیورانی: پریم چند گھر میں ص۵۰

۵۳ امرت رائے: منگلا چرن ص۱۰

بہت کم میل کھاتی ہے۔ غالباً یہ زبان اس لیے استعمال کی گئی ہے کہ جن لوگوں کی اصلاح مقصود ہے ان کے لیے دلچسپ ہو .... یہ ایک ایسا ناول ہے جس میں کوئی ہیرو یا ہیروئن نہیں ہے اور اسے ناول کہنا دشوار ہے۔ دراصل یہ ناول ہے بھی نہیں بلکہ عورتوں کی ایک مذموم ذہنیت کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ جسے انگریزی میں کیری کیچر کہتے ہیں'' ۵ل

موجودہ صورت حال میں اس سے زیادہ تحریر کرنا ممکن نہیں ہے۔ 'کشنا' پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں ہے اور بس!

روٹھی رانی

پریم چند نے کانپور کے دوران 'کشنا' کے ساتھ ہی ساتھ اپنا ناولٹ 'روٹھی رانی' لکھا جو 'زمانہ' میں اپریل ۱۹۰۷ء سے اگست ۱۹۰۷ء تک قسط وار شائع ہوا۔ ان دنوں پریم چند مستقل طور پر 'زمانہ' کے لیے لکھ رہے تھے جس میں کہانی، ناول، مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ اسی درمیان انھوں نے حکیم برہم کے ناول 'کشنا کنور' پر مشہور و معروف تبصرہ لکھا، جو ناول کے فن کے متعلق ان کے زاویۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں: ''ناول انگریزی ادب میں تنقید نگاروں کی رائے میں صدیوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے .... ناول کا میدان بہت وسیع ہو گیا ہے۔ کہیں تو اس میں زندگی کے کسی اہم مسئلے پر بحث کی جاتی ہے جس کی محمد علی صاحب نے بڑی کامیابی سے کوشش کی ہے۔ کہیں اس میں انسانی نفسیات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ دل کے جذبات امیدوں اور ناکامیابیوں کے نقشے اتارے جاتے ہیں کہیں اخلاقی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ناول نگار کبھی دوست کا کام کرتا ہے اور کبھی ناصح کا اور کبھی علم و حکمت کا ماہر'' ۵۲

'روٹھی رانی' میں پریم چند نے متذکرہ بالا ذمہ داریوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ ناول کا محور ایک راجپوت رانی کی اپنے شوہر سے خفگی ہے۔ جو پوری زندگی اس سے متنفر رہتی ہے لیکن شوہر کی موت کے بعد اُس پر نفسیاتی ردعمل ہوتا ہے اور شوہر کے ساتھ چتا میں جل کر خاکستر ہو جاتی ہے۔

۵ل نوبت رائے نظر: زمانہ اکتوبر ۱۹۰۷ء

۵۲ پریم چند: زمانہ فروری ۱۹۰۵ء

'روٹھی رانی' کا ہندی ترجمہ پریم چند کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ پروفیسر فراق گورکھپوری نے راقم السطور کو بتایا کہ پریم چند اس کا انگریزی ترجمہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے فراق صاحب سے ترجمہ کرنے کی خواہش کی تھی، جسے انھوں نے قبول کر لیا تھا۔ لیکن بعض وجوہ سے ترجمہ نہ ہو سکا اور وعدہ' وعدہ رہا۔ روٹھی رانی کا ہندی ترجمہ پہلی بار 'منگلا چرن' میں شائع ہوا۔ امرت رائے لکھتے ہیں: " روٹھی رانی نام کا قصہ بھی جو اپریل سے لے کر اگست ۱۹۰۷ تک 'زمانہ' میں نکلا تھا۔ ہندی کے لیے بالکل نیا ہے۔ لہٰذا وہ بھی پیش کیا جا رہا ہے بہت کچھ جوں کا توں۔" [۱] اس "جوں کا توں پیش" کرنے میں نہ صرف یہ کہ متعدد موقعوں پر اردو روایات سے انحراف کیا گیا ہے اور اردو الفاظ ترک کر دئے گئے ہیں بلکہ بسا اوقات محاوروں کا بھی ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ اردو نسخے میں بعض جگہوں پر اردو مصرعے اور اشعار ہیں، جن کا ہندی میں خلاصہ لکھ دیا گیا ہے۔ متعدد جگہوں پر ترجمہ پن نمایاں ہے، مثلاً:

۱۔" ۱۵۸۶ء میں فرماں روائے کی گدی پر جلوہ افروز تھا۔" [۲] اردو میں یائے اضافت کے بعد اسم صفت نہ ہونا سہو کاتب معلوم ہوتا۔ ہندی کا ترجمہ یوں ہے: " ۱۵۸۶ء میں راج گدھی پر سوشوبھت تھا۔" [۳]

۲۔" اور صرف اوصاف ظاہری پر اُسے ناز نہ تھا۔" [۴] ہندی میں 'اوصاف ظاہری' کا ترجمہ " باہری گنوں" [۵] کیا گیا ہے۔

۳۔" کتنی ہی حور وش مہ پارہ نازنین سہاگ کے گیت الاپ رہی تھیں" [۶] ہندی میں" حور وش مہ پارہ نازنین" کے بجائے " چندر وندنی سندریاں" [۷] لکھا گیا ہے۔

۴۔" اس گانے بجانے اور زاہد فریب عورتوں کو لبھانے رجھانے میں راؤ جی کا

---

[۱] امرت رائے: منگلا چرن ص۱۰

[۲] پریم چند: روٹھی رانی ص۵

[۳] " روٹھی رانی (منگلا چرن) ص۳۵۱

[۴] " روٹھی رانی ص۷

[۵] " روٹھی رانی (منگلا چرن) ص۳۵۱

[۶] " روٹھی رانی ص۲۱

[۷] " روٹھی رانی (منگلا چرن) ص۳۵۹

دل چھین لیا۔"[51] اس کا ہندی ترجمہ ملاحظہ ہو: " اس گانے بجانے اور تپسیوں کا ورت چھین بھنگ کرنے والی استریوں کے لبھانے رجھانے نے راؤجی کا دل چھین لیا۔"[52]

اسی طرح 'حسن و جمال' کی جگہ پر 'سوندریہ'، 'نازنین کے بجائے' یووتی'، 'حسنِ جہاں سوز' 'سنسار دایک سوندریہ'، آغوشِ ناز'، 'باہیں'، وغیرہ۔ 'روٹھی رانی' کے اردو اور ہندی متن کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضیافتِ طبع کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ امرت رائے نے اردو زبان و ادب کی روایات اور مزاج سے باخبر ہونے کے باوجود اس طرح کے ترجمے کو کیسے گوارہ کیا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ موصوف نے اس پر نظرِ ثانی کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی ہے۔ خاص پریم چند کے انداز میں کہ وہ ہندی ترجمے کو دوبارہ پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے تھے!

'رنگ میں بھنگ' عنوان کے ذیل میں گانے والیوں کے مختلف بول اردو اور ہندی میں دیے گئے ہیں۔ اردو میں ان بولوں کا خلاصہ متن میں اور بول فٹ نوٹ میں دیے گئے ہیں۔ ہندی میں صرف بول دیے گئے ہیں، ان پر فٹ نوٹ نہیں ہے۔ اردو میں متعدد مقامات پر قارئین کی سہولت کے پیشِ نظر نامانوس الفاظ، روایات اور رسم و رواج پر فٹ نوٹ دیے گئے ہیں۔ ہندی میں چند جگہوں پر مترجم نے فٹ نوٹ رہنے دئے ہیں لیکن زیادہ تر چھوڑ دیے ہیں چند فٹ نوٹ جو ہندی میں نہیں ہیں لیکن اردو میں ہیں، ان کے اشارے درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ راجا مال دیو کے بارے میں اطلاع دینا۔
۲۔ چاندی کے ناریل کے بھیجنے کی رسم کا تعارف۔
۳۔ تورن باندھنے کی رسم کی وضاحت۔
۴۔ چنوری کا مطلب۔
۵۔ ایثار و قربانی کے واقعات کا ذکر۔
۶۔ علم نجوم کی اصطلاحیں۔ چوتھے چندرماں اور آٹھویں سورج کی وضاحت۔
۷۔ رانی سنجوگتا اور پرتھوی راج کے سویمبر کا ذکر۔
۸۔ روٹھی رانی کے برج کی شہرت کا بیان

---

[51] پریم چند: روٹھی رانی ص۲۵

[52] ایضاً: روٹھی رانی (منگلا چرن) ص۳۶۱

۹۔ بیرم جی راؤ کا تعارف

۱۰۔ جتیا اور کونپا کا تعارف

۱۱۔ راجستھان کی خاص پیداوار کا بیان

۱۲۔ غم میں جاجم بچھا کر بیٹھنے کے رواج کا ذکر

اردو میں یہ ناولٹ 'زمانہ' میں قسط وار شائع ہونے کے بعد زمانہ پریس کان پور کے 'سلسلۂ زمانہ' دلپذیر نمبر ۲' میں شائع ہوا۔ اس کے مصنف کا نام نواب رائے، طبع ہے۔ جو پریم چند کا اولین قلمی نام ہے۔ کتاب پر جملہ حقوق محفوظ ہیں' بھی طبع ہے۔ نہیں معلوم کہ 'روٹھی رانی' کا حق اشاعت پریم چند نے منشی دیا نرائن نگم کو دے دیا تھا یا اپنے نام محفوظ رکھا تھا۔ اردو میں 'روٹھی رانی' کے اچھے برے متعدد ایڈیشن چھوٹے بڑے ناشروں نے شائع کیے ہیں اور شائع کر رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں 'روٹھی رانی' کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ اردو ناول ہے۔ ہندی میں اسے مترجمہ ناولوں کی صف میں رکھا جانا چاہیے۔

جلوۂ ایثار: وَردان

زیر نظر ناول کے زمانہ تصنیف و اشاعت کے بارے میں مختلف و متضاد آرا پیش کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر نے اسے 'پریما' کے ساتھ کی ۱۹۰۲ء کی تخلیق بیان کیا ہے [۵۱] اور ہنس راج رہبر کا خیال ہے: "جلوۂ ایثار (۱۹۰۵-۶ء) کے بیچ لکھا گیا ہے۔" [۵۲] شری جناردن پرساد جھا دوِج نے 'وردان'، کو ہندی تخلیق ثابت کرنے کی مہم میں ایک بے بنیاد کہانی گڑھی ہے، جو دلچسپ اور تفریحی ہے: "سیوا سدن کے پہلے ہی اردو میں انھوں نے ایک بہت بڑا پری ہاس پردھان اپنیاس لکھا تھا جو کہیں چھپ نہ سکا اور اب جس کی پانڈولپی کا بھی پتہ نہیں ہے۔ اُسی کی کتھا وستو لے کر انھوں نے اس اپنیاس کی رچنا کی ہے۔" [۵۳]

---

[۵۱] رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص ۱۲۱

[۵۲] ہنس راج رہبر: پریم چند جیون کلا اور کرتتوا ص ۱۶۶

[۵۳] جناردن پرساد جھا دوِج: پریم چند اپنیاس کلا ص ۱۱

اس بے بنیاد بیان کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ ایک دوسری دلچسپ صورتِ حال ڈاکٹر اندر ناتھ مدان نے پیدا کی ہے جنھوں نے 'جلوہ ایثار' اور 'وردان'، کو الگ الگ ناول قرار دیا ہے۔[۵۱] انھوں نے 'وردان'، کا سن اشاعت ۱۹۲۳ء قرار دیا ہے۔[۵۲] ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن اس کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرتے۔ لیکن اس کی ۱۹۲۰ء میں ہندی میں اشاعت قرار دے کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔[۵۳]

متذکرہ بالا بیانات کا تضاد واضح ہے۔ ایسی مشکوک صورتِ حال میں پریم چند ادبیات کا قاری گم کردۂ منزل ہو سکتا ہے!

پریم چند نے منشی دیا نرائن نگم کے نام ۷ جولائی ۱۹۲۶ء کے مکتوب میں 'جلوہ ایثار' کا ذکر کیا ہے لیکن بس اتنا: "سن ۱۲ء میں جلوہ ایثار ... لکھا۔"[۵۴] یہ بیان درست نہیں ہے۔ یہ ناول پہلی بار اردو میں ۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الٰہ آباد سے اس وقت شائع ہوا جب پریم چند ہمیرپور میں تھے۔ اس کا ہندی ترجمہ تقریباً نو سال بعد ۱۹۲۱ء میں گرنتھ بھنڈار بمبئی سے شائع ہو سکا۔

'جلوہ ایثار'، میں پریم چند پر بنکم چندر کے اثرات واضح ہیں۔ لیکن ان کے اسلوب بیان کی بے لوث انفرادیت بھی برقرار رہتی ہے۔ پریم چند نے بنکم چندر سے متاثر ہونے کا ذکر خود بھی کیا ہے۔ ۱۴ مارچ ۱۹۱۴ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کون سا طرز تحریر اختیار کروں، کبھی تو بنکم کی نقل کرتا ہوں کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں۔ آج کل کاؤنٹ طالسطائے کے قصے پڑھ چکا ہوں، تب سے کچھ اُسی رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے یہ اپنی کمزوری ہے اور کیا!"[۵۵]

بنکم، آزاد یا طالسطائے ان کی کمزوری نہیں بنے۔ انھوں نے ان عظیم تخلیق کاروں سے فنی بصیرت، تخلیقی جوہر اور سماجی زاویہ نظر حاصل کیا، جسے بعد میں اپنے ذاتی تخلیقی تجربات کی روشنی

---

۵۱ اندر ناتھ مدان: پریم چند ایک ددیچن ص ۱۸۰

۵۲ ایضاً ص ۴۷

۵۳ پرتاب نرائن ٹنڈن: ہندی اپنیاس ادبھو اور وکاس ص ۱۷۷

۵۴ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۶۲

۵۵ ایضاً ص ۲۹

میں پیش کیا۔ بنگلا اور روسی ادبیات کے اثرات قصے کے انتخاب اور اس کی بناوٹ میں مؤید و معین ثابت ہوئے۔ البتہ اردو کے مشہور و معروف قصہ گو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے اثرات کئی طرح سے اس وقت کے پریم چند پر حاوی تھے۔ ایک تو ان کا اپنا ذاتی رجحان جس نے سرشار کے 'فسانۂ آزاد' کو ہندی میں 'آزاد کتھا' کے نام سے ترجمہ و تلخیص پر آمادہ کیا۔ دوسرے اس وقت ان پر آریہ سماج اور ہندو قومیت کے اثرات تھے۔ اگر ایک حلقے میں مسلمانوں کی جانب سے مولانا عبدالحلیم شرر کو بلند ترین تخلیق کار ثابت کرنے کی کوشش ہوتی تو دوسری طرف ہندوؤں کا ایک حلقہ سرشار کو افضلیت عطا کرنے پر جذباتیت کے ساتھ زور دیتا تھا۔ پریم چند سرشار کے طرفداروں میں تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء میں اپنے ایک مضمون 'شرر و سرشار' کے ذریعہ سرشار کے اسلوب میں طنز و مزاح کے عناصر کی مدح و ثنا کی۔ اگر وہ سرشار کو شرر سے بہتر فن کار ثابت کرنے تک محدود رہتے تو غالباً تعلیم یافتہ طبقے میں ان کے زاویہ نظر کی زیادہ مخالفت نہ ہوتی لیکن ستم تو یہ ہوا کہ وہ سرشار کی محبت میں مخمور ہو کر انھیں سب سے بلند مرتبت ناول نگار ثابت کرنے لگے اور اس میں تمام حدود کو تجاوز کر گئے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ سرشار تو ڈکنس سے بھی کوسوں آگے ہیں۔ حالانکہ صحیح صورت برعکس تھی۔ جہاں تک فنی گہرائی اور گیرائی انسانی نفسیات کا عمیق ادراک اور معاشرہ کی متحرک تصویریں پیش کرنے کا سوال ہے، سرشار ڈکنس سے بہت پیچھے ہیں۔ سرشار اپنے دور کے نمائندہ اور نقیب ہیں۔ ڈکنس اپنے دور کا حکیم مصور، مفسر اور نقاد ہے۔ عصر حاضر کا نقاد سرشار کو، اودھ تہذیب، زبان، تمدن اور روایتوں کی علامت قرار دیتا ہے۔ پریم چند نے 'جلوہ ایثار' میں متعدد موقعوں پر 'فسانۂ آزاد' کی تقلید میں اسی طرح کی سماجی زندگی کی تصویر کشی کی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مقام پر "شہزادہ صف شکن کی جنگ کا منظر بھی پیش کر دیا ہے۔ 'فسانۂ آزاد' کے بٹیر کی طرح ان کا بٹیر بھی بٹیر نہیں، شیر نر ہے۔ اسی طرح دوسرا اثر قومیت کا ہے۔ اس دور میں پریم چند پر ملکی تحریک کی پیدا کردہ قومیت کے تصورات بھی حاوی تھے۔ انھوں نے اپنی کہانی 'دنیا کا سب سے انمول رتن' کی طرح 'جلوہ ایثار' میں دیش کے اپکار کرنے والے کو سپوت بیٹا قرار دیا ہے:

"پھر سپوت بیٹا کسے کہتے ہیں۔
جو اپنے دیش کا اپکار کرے۔
تیری بڑھی دھلینہ ہے۔ جا تیری اچھا پوری ہوگی" [۱]

---

[۱] پریم چند: جلوہ ایثار صفحہ ۵

اس قومی نظریے کے تجزیے ہیں 'دنیا کا سب سے انمول رتن' اور 'جلوۂ ایثار' کے درمیان کی ہندوستانی تاریخ کے پیچ وخم پر نظر رکھنا ہوگا کیونکہ اس درمیان علاحدگی پسند رجحانات تقویت حاصل کرتے جارہے تھے۔ منٹو مارلے اصلاحات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ خیموں میں تقسیم کردیا تھا۔ کانگریس نرم دل اور گرم دل کے درمیان منقسم ہوگئی تھی تلک کو ۱۹۰۸ء میں قید کرکے رنگون بھیج دیا گیا تھا جس کا پریم چند کو صدمہ تھا۔ اس دور میں پریم چند پر آریہ سماجی اثرات کی کارفرمائی رہی ہے۔ امرت رائے لکھتے ہیں: "۱۹۱۲ء میں 'جلوۂ ایثار' آیا۔ جب کہ منشی جی ہمیرپور میں تھے اور باقاعدہ آریہ سماج کے سدسیہ تھے۔ راشٹریتا کی بھاؤنا ان میں بھی لہریں مار رہی تھی۔ پر وہ ہندو راشٹریتا ہے۔ تب تک کے وکاس کی شاید وہی سیما ریکھا ہے۔ بہت سے لوگ انت تک اُس ریکھا کو نہیں لانگھ سکے۔ منشی جی نے لانگھا اور اچھی طرح سے لانگھا۔ لیکن آگے چل کر۔ ابھی تو 'جلوۂ ایثار' کے بالاجی کی پوری کلپنا ایک ہندو سنیاسی کی ہے۔ جس کا سمست سنسار، آچار، وچار ہندو ہے۔ یہاں تک کہ گورکشا بھی موجود ہے ــــ ویسے ہی جیسے تلک بھی گو ہتیا نرودھنی سبھا بنانا نہیں بھولے۔" [۵۱]

برجن کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوتی ہے۔ وید، پران، مہاتم اور سدھانت کو مودی کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے۔ اسی طرح بالاجی کے روپ میں پریم چند نے مہاتما گاندھی، تلک، گوکھلے، سب کا ایک ساتھ تصور کیا ہے۔ لیکن ملکی تحریک کے ان عظیم رہنماؤں کے برعکس پریم چند کے بالاجی زندگی کی سرگرمیوں میں عملی طور پر شامل ہونے کے بجائے راہ فرار کے مسافر ہیں۔

'جلوۂ ایثار' کا ہندی ترجمہ کس نے کیا؟ پریم چند نے ابتدا سے انتہا تک ہندی پر نظر ثانی کی تھی یا نہیں اس کے بارے میں واضح طور پر معلوم نہیں ہوتا۔ موجودہ صورت میں ہندی اور اردو اشاعتوں کی زبان و بیان میں متعدد مقامات پر شدید اختلاف نظر آتا ہے، جس کے تناسب میں نصف ناول کے بعد اضافہ ہوتا گیا اور بعد میں باب کے باب ترک کردیے گئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ پریم چند نے اس ناول کے ہندی ترجمے پر طائرانہ نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ ذیل میں بعض اختلافات کی نشان دہی کی جاتی ہے:

(۱) بسا اوقات اردو متن میں تفصیل اور ہندی میں اختصار ہے، لیکن شاذ و نادر ہی

---

۵۱ امرت رائے: قلم کا سپاہی ص۱۵۲

سہی اس کے برعکس بھی مثالیں مل جائیں گی۔

۲۔ اردو میں زبان و بیان دلچسپ اور پُرتاثیر ہے جسے ہندی میں منتقل کرنے میں غرابت اور نامانوسیت پیدا ہوگئی ہے۔

۳۔ بعض مقامات پر ترجمہ اصل تخلیق سے زیادہ زندہ اور پُرتاثیر ہوگیا ہے۔ مثلاً:

"علاوہ اس کے چونکہ مذہبیت کی طرف زیادہ مائل تھا کملا کی موت نے یہ خیال پیدا کیا کہ ایشور نے میری محبت کی قدر کی اور کملا چرن کو میرے راستے سے ہٹا دیا۔" [۱]

اس کا ہندی ترجمہ یہ کیا گیا:

"اس کے علاوہ اس کی دھارمک پرورتی نے وکرت روپ دھارن کر کے اس کے من میں یہ متھیا وچار اتپن کیا کہ ایشور نے میرے پریم کی پرتشٹھا کی اور کملا چرن کو میرے مارگ سے ہٹا دیا۔" [۲]

۴۔ اردو اور ہندی کی بول چال کی زبان میں زیادہ فرق نہیں ہے پریم چند عام طور پر مروجہ فارسی و عربی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ان عربی و فارسی الفاظ کا ترجمہ کرنے میں سنسکرت الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے۔

۵۔ اردو میں ایک جگہ کملا کے خفا ہونے پر برجن کے خط لکھنے کا ذکر ہے جس میں یہ شعر بھی ہے:

خطا میں نے کی ہے خطاوار ہوں   سزا دیجیے جو سزاوار ہوں [۳]

ہندی میں شعر کا مفہوم درج کر دیا گیا ہے۔

۶۔ مترجم کی ایک اور دشواری اردو روایات اور اصطلاحات سے ناواقفیت ہے جو ترجمے میں نمایاں ہے۔ مثلاً اردو شعر و ادب میں فصاحت و بلاغت کے لیے 'واکیہ چاتریہ' [۴] استعمال کیا گیا ہے۔

---

[۱] پریم چند: جلوۂ ایثار ص ۱۵۶

[۲] ایضاً: وردان ص ۹۳

[۳] ایضاً: جلوۂ ایثار ص ۵۴

[۴] ایضاً: وردان ص ۲۲

طوالت کے پیشِ نظر اب یہاں ان ابواب کا ذکر کیا جاتا ہے جو ہندی اشاعت میں نہیں ہیں:

(۱) پرتاپ چند کا سنیاس لے کر ہردوار کے قریب رہنا اور وہاں کی زندگی۔

(۲) پرتاپ چند کا بالاجی کا روپ دھارن کرنا اور گیان یوگ حاصل کرنا۔

اردو اشاعت میں اس باب کا عنوان 'تیاری' ہے۔

(۳) ہندی اشاعت میں 'مانو کا پرابیہ' کے بعد 'ودشی برج رانی' ہے۔ اس طرح اردو اشاعت کے متذکرہ بالا دونوں ابواب ترک کر دیے گئے ہیں۔ اس باب کا عنوان اردو میں 'برجن شاعرہ ہو گئی' ہے۔

(۴) ہندی میں اردو اشاعت کے 'امتحان' عنوان کا باب نہیں ہے جس میں پرتاپ چند اور منشی سنجیون لال سوامی برہمانند سے ملاقات کرتے ہیں۔

(۵) ہندی اشاعت میں مادھوی باب کا اردو 'گنگا جمنا کا ملاپ' میں ذیل کی سطریں نہیں ہیں:

"ہمارے ناظرین مادھوی کے نام سے غیر مانوس نہ ہوں گے۔۔۔۔اس نے مجگاؤں کے کملا چرن مرحوم کے نام لکھے تھے۔"[۵۱]

(۶) اردو اشاعت کا باب 'تاریخ کا ایک ورق' ہندی میں نہیں ہے جس میں مصنف بالاجی کی خدمات پر تہنیت پیش کرتا ہے۔

(۷) اس ناول میں کرداروں کے نام اردو اور ہندی میں عام طور پر یکساں ہیں لیکن چند ناموں میں اختلاف بھی ہے۔ مثلاً اردو میں سباما، سرجو دئی اور سعید کو ہندی میں سماما، سرجو دیوی اور سید لکھا گیا ہے۔

(۸) مترجم نے بعض مقامات پر اردو الفاظ و محاورات کا غلط استعمال کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح مفہوم سے واقف نہیں ہے ایک جگہ پر عورتوں کے زیادہ بولنے پر طنز ہے:

"دونوں عورتوں میں شکوہ شکایت ہونے لگی۔"[۵۲]

---

۵۱ پریم چند: جلوۂ ایثار ص ۱۸۹

۵۲ ایضاً ص ۲۱

جس میں طنز کو نظر انداز کر کے ہندی میں 'شُشٹا چار' کر دیا گیا:

"دونوں استریوں میں شُشٹا چار کی باتیں ہونے لگیں۔"[۵۱]

اردو میں ابھی حال تک "آپ کی خیریت خداوند کریم سے ہمیشہ نیک چاہتا ہوں"، کا حاشیہ خطوں میں لگا رہتا تھا، اس ناول میں اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

"آپ کا کشل شری وشوناتھ جی سے سدا منایا کرتی ہوں"[۵۲]

اسی طرح محاوروں کا غلط ترجمہ بھی ملاحظہ ہو:

۱۔ چراغ جلنا ـــــ شام ہونا

'باتوں باتوں میں چراغ جل گیا'[۵۳]

ـــ باتوں باتوں میں دیپک جل اٹھا۔"[۵۴]

۲۔ قسم کھانا ـــ یقین دلانا، مستحکم ہونا

"ڈپٹی صاحب نے گھر چھوڑ کر ہلنے کی قسم کھالی"[۵۵]

ـــ "ڈپٹی صاحب نے گھر چھوڑ کر ہلنے کی شپتھ کرلی"[۵۶]

(۳) قیامت ڈھانا ـــ ستم ڈھانا، ظلم کرنا

"میری ذرا سی غلطی نے یہ قیامت ڈھادی۔"[۵۷]

"میری تنک سی چوک نے پرلے کر لیا"[۵۸]

(۴) صورت آنکھوں میں پھرنا۔ ہر وقت یاد آنا

---

۵۱ پریم چند: وردان ص۱۵

۵۲ ایضاً ص۱۸

۵۳ پریم چند: جلوۂ ایثار ص۲۱

۵۴ ایضاً: وردان ص۱۵

۵۵ ایضاً: جلوۂ ایثار ص۳۰

۵۶ ایضاً: وردان ص۲۱

۵۷ ایضاً: جلوہ ایثار ص۱۰۵

۵۸ ایضاً: وردان ص۶۳

'ہردم مرنے والے کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرا کرتی تھی' [۵۱]

"پرتی چھن مرت کملا چرن کا چتر نیتروں کے سمن کرتا رہا" [۵۲]

ان مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ مترجم نے محض ترجمے کے لیے ترجمہ کیا ہے جس سے پریم چند کا طرز بیان، اسلوب اور زبان کی لطافت مجروح ہوگئی ہے اس میں تکلف اور غیر فطری عناصر پیدا ہو گئے ہیں۔ مثلاً 'محویت کا غلبہ' کے بجائے 'انوراگ کا اکرمن'، 'صفایا'، کا ترجمہ: 'اتی شرن'، وغیرہ وغیرہ

اردو میں متعدد موقعوں پر خالص ہندی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً 'ودیا'، 'بدھی'، 'اپکار'، 'ایشور کی مہما اپرن پار'، وغیرہ جنھیں مترجم نے ہندی میں قبول کرلیا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا غیر صحیح نہ ہوگا کہ 'وردان' پریم چند کی ہندی تخلیق نہیں ہے بلکہ ان کے اردو ناول 'جلوۂ ایثار' کا ہندی ترجمہ ہے۔

•

اب یہ بات تحقیقی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ پریم چند نے ۱۹۱۵ء تک صرف اردو میں لکھا۔ اس دور کے پریم چند کو ہندی سے نہ صرف تخلیقی عمل کی بنیادوں پر کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ انھوں نے ہندی ترجموں پر نظر ثانی بھی نہیں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان ترجموں کی زبان میں بعد کے دور میں ناشرین نے مزید ترمیم و اضافے کیے ہیں۔ اس طرح یہ

---

۵۱ پریم چند: جلوۂ ایثار ص ۱۴۷

۵۲ ایضاً: وردان ص ۸۷

یہ مسئلہ مزید اہمیت حاصل کرلیتا ہے کہ پریم چند کے ہندی ترجموں کی ذمہ داری کس پر عاید کی جائے۔

ہمارے خیال میں اس دور کے پریم چند کو ہندی ادبیات کی تاریخ میں اسی حد تک اہمیت دی جاسکتی ہے کہ اس دور کی نگارشات کے کے پس منظر میں آئندہ ادوار کی نگارشات کا خاکہ تیار ہوتا ہے ـــــ وہ خاکہ جس کا منظر و پس منظر اردو مزاج و کردار کے اعتبار سے تیار ہوتا ہے۔ اس دور کی تخلیقات میں اردو آب و رنگ واضح ہے، جس میں فن کار کا سوز دروں، اردو کی نفاست و لطافت کا رہین منت ہے۔ اس کی گہرائی وگیرائی اور حسن و توانائی میں اردو کا شفقی رنگ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ▲▲▲

باب ۴
دور تعمیر

دورِ تعمیر

پریم چند کے تخلیقی عمل کا دوسرا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک محیط ہے سن ۱۹۱۶ء کو اس بنا پر خصوصیت حاصل ہے کہ اس کے بعد سے پریم چند ہندی میں لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی کہانیوں میں ہندی میں دوسری کہانی 'پنچ پرمیشور' جون ۱۹۱۶ء کی 'سرسوتی' میں شائع ہوئی۔ حالانکہ یہ کہانی اسی درمیان مئی جون ۱۹۱۶ کے 'زمانہ' میں شائع ہو چکی تھی لیکن اس کہانی کے شائع ہونے کے بعد سے ان کی ہندی کے حلقوں میں ہمت افزائی ہونے لگی اور انھوں نے ہندی کہانی کار کی حیثیت سے رفتہ رفتہ اپنا مقام بنانا شروع کردیا۔

یہ دور سیاسی زاویۂ نظر سے انتہائی اہم ہے۔ اس زمانے میں رسالہ 'زمانہ' ایک ایسا رخ اختیار کرتا ہے جس سے پریم چند کو شدید اختلاف تھا۔ انھوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھا: ”میں نے ابھی تک کرنٹ پالیٹکس پر کچھ نہیں لکھا۔ مجھے 'زمانہ' کی پالیسی پر نظر ڈالتے ہوئے، کچھ لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ میں بیس ڈکلریشن کا عمداً ذکر نہ کروں گا لیکن رفارم اسکیم کا ذکر نہ کرنا غیر ممکن ہے اور اسکیم یا ایکٹ کے متعلق میں مسٹر چنتامنی وغیرہم سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ آسانیاں زیادہ مل جائیں گی اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے اُسی طرح آئندہ یہ حاکم ہو کر رعایا کا گلا کاٹے گی“ [۵۱]

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۹۳

۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۷ء کے درمیان کانگریس سوراجیہ کی تحریک کو اپنا مطمح نظر بناتی ہے۔ اس کے پس منظر میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ کا جلیان والا باغ کا قتل عام ہے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کا تاریخی اجلاس ہے جس نے ملکی تحریک آزادی کا نصب العین مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ پریم چند کی تخلیقات پر ان سب کے واضح اثرات نظر آتے ہیں

اسی دور میں پریم چند ہندی صحافی اور مدیر کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔ ہندی میں پریم چند کو سب سے پہلے ادارت کا موقع اس وقت ملتا ہے، جب وہ گیان منڈل بنارس کے ادبی جریدہ 'مریادا' میں ۱۹۲۲ میں مختصر سے وقفے کے لیے قائم مقام مدیر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے۔ اس رسالہ کے مدیر ڈاکٹر سمپورنانند تھے جو قومی تحریک کے سلسلے میں گرفتار کر لیے گئے تھے۔ یہ رسالہ ملکی تحریک آزادی کا نقیب تھا اور اس کی پالیسی پریم چند کے اپنے تصورات و خیالات سے ہم آہنگ تھی۔ لیکن اس رسالہ سے ان کا تعلق زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۵ر فروری ۱۹۲۷ سے ۹ر اکتوبر ۱۹۳۱ء تک نول کشور پریس لکھنؤ کے ہندی جریدہ 'مادھوری' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

پریم چند کے صحافیانہ و مدیرانہ کارناموں کا اصلی رنگ و آہنگ 'ہنس' اور 'جاگرن' سے کھلتا ہے، جو عرصہ دراز تک ان کی ملکیت اور ادارت میں شائع ہوتے رہے اور اپنے دور کی سیاسی، سماجی اور ادبی شعور کی علامت بنے رہے۔ 'ہنس' کی اشاعت کا مقصد ہندی کے حلقوں میں ادبی و سیاسی سرگرمیوں میں اضافہ کرنا تھا کیونکہ پریم چند کافی مدت سے محسوس کر رہے تھے کہ انھیں بحیثیت ادیب و دانشور جس انہماک و مستعدی کے ساتھ تحریک آزادی میں عملی تعاون کرنا چاہیے تھا، اس سے اصولی و فکری معیاروں پر مکمل مشروطیت کے باوجود شامل نہیں ہوسکے تھے[۱۵]۔ اس لیے انھوں نے 'ہنس' کے

۱۵۔ پریم چند نے شیورانی دیوی کے گرفتار ہونے پر راجیشور بابو کو ایک مکتوب میں لکھا: "تمھاری موسی نو تاریخ* کو ایک ودیشی کپڑے کی دوکان پر پکیٹنگ کرتے ہوئے پکڑ لی گئیں میں اُن سے جیل میں ملا اور ہمیشہ کی طرح خوش پایا۔ انھوں نے ہم لوگوں کو پچھاڑ دیا اور میں اپنی آنکھوں میں چھوٹا لگ رہا ہوں۔"

—— پریم چند: مکتوب بحوالہ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۴۶۲

*۔ لیکن شیورانی دیوی نے گرفتاری کی تاریخ ۱۱ر نومبر ۱۹۲۱ء بیان کی ہے۔ (شیورانی دیوی: پریم چند گھر میں ص ۱۲۷) چونکہ پریم چند کا متذکرہ بالا مکتوب ۱۱ نومبر ۱۹۳۱ء کا ہے اور شیورانی دیوی نے یادداشت کی بنیاد پر بعد میں لکھا ہے اس لیے پریم چند کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے۔

پہلے اداریہ میں ملکی تحریک آزادی کے بارے میں اپنے خیالات پُرتاثیر الفاظ میں پیش کیے اور
'ہنس' کو ترقی و آزادی کی علامت اور محرک بنائے رکھا۔ 'ہنس' کے اشاعتی منصوبے کے بارے
میں منشی دیانرائن نگم کو ۱۲ فروری ۱۹۳۰ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں: "میں پھاگن یعنی نئے سال سے ایک
ہندی رسالہ 'ہنس' نکالنے جارہا ہوں یہ ۱۰۳ صفحات کا ہوگا اور زیادہ تر افسانوں سے تعلق رکھے
گا۔ ہے تو حماقت ہی۔ درد سر بہت اور نفع کچھ نہیں۔ لیکن حماقت کرنے کو جی چاہتا ہے زندگی
حماقتوں میں گذر گئی ایک اور سہی۔"[۵۱] 'ہنس' کی اشاعت نے ہندی صحافت کی تاریخ میں
نئے باب کا اضافہ کیا اور کئی نئی ادبی تحریکات کو جنم دیا۔ پھر انھوں نے ایک اور ہندی ہفتہ وار
'جاگرن' کی اشاعت شروع کی، جس کی پالیسی بھی وہی تھی جو 'ہنس' کی تھی۔

اس دور کی تخلیقات میں پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں کا طویل سلسلہ ہے جن میں
زیادہ تر نگارشات ہندی اور اردو دونوں میں شائع ہوئیں۔ جس سے انھیں غیر معمولی شہرت و مقبولیت
حاصل ہوئی۔ پریم چند نے ایک مکتوب میں منشی دیانرائن نگم کو معنی خیز انداز میں لکھا: "سرسوتی زبان پر
نہیں کھوپڑی پر سوار ہے۔ لکشمی دروازہ پر نہیں بالائے بام بیٹھی ہے۔ دانہ دکھاتا ہوں، بلاتا ہوں
پر اترنے کا نام نہیں لیتی ــــ۔ قصے میں شاید لکھوں یا نہ لکھوں آج کل بازار حسن کی صفائی اور
نئے ناول کی تصنیف میں بے حد مصروف ہوں"[۵۲]، اس درمیان کی کہانیوں میں ۱۶۳ (ایک سو تریسٹھ)
حاصل ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ۶ (چھ) ناول بازار حسن، گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، پردۂ مجاز،
نرملا اور بیوہ شائع ہوئے۔ ان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

کہانیاں

پریم چند کی تخلیقات میں ایک سو کہانیاں ان کی حیات میں اردو اور ہندی دونوں
میں شائع ہو گئی تھیں۔

(۱) دو بھائی (۲) نیکی کی سزا (۳) پنچایت (۴) سرپُرغرور (۵) جگنو کی چمک
(۶) دھوکا (۷) راجپوت کی بیٹی (۸) شعلۂ حسن (۹) مشعل ہدایت (۱۰) ایمان کا فیصلہ

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ص ۱۸۶

۵۲ ایضاً ص ۸۹

(۱۱) حج اکبر (۱۲) درگا مندر (۱۳) قربانی (۱۴) راہِ خدمت (۱۵) بنیک کا دیوالہ
(۱۶) سوتیلی ماں (۱۷) خواب پریشاں (۱۸) خون حرمت (۱۹) دفتری (۲۰) عبرت
(۲۱) بانگِ سحر (۲۲) آتمارام (۲۳) انسان کا مقدم فرض (۲۴) اصلاح (۲۵)
بوڑھی کاکی (۲۶) بازیافت (۲۷) بعد از مرگ (۲۸) نوک جھونک (۲۹) معمہ
(۳۰) عجیب ہولی (۳۱) دستِ غیب (۳۲) لال فیتہ (۳۳) فلسفی کی محبت (۳۴)
موٹھ (۳۵) شکست کی فتح (۳۶) فکرِ دنیا (۳۷) مجبوری (۳۸) چکمہ (۳۹) ستیاگرہ
(۴۰) نزولِ برق (۴۱) راہِ نجات (۴۲) عفو (۴۳) ابھاگن (۴۴) بھوت (۴۵) توبہ
(۴۶) شطرنج کی بازی (۴۷) مایہ تفریح (۴۸) سوا سیر گیہوں (۴۹) ڈگری کے روپیے (۵۰) تہذیب کا راز
(۵۱) حسرت (۵۲) دیوی (۵۳) بھاڑے کا ٹٹو (۵۴) چوری (۵۵) جنت کی دیوی (۵۶) لاٹری
(۵۷) سزا (۵۸) پنچ ذات کی لڑکی (۵۹) امتحان (۶۰) لیلیٰ (۶۱) تالیف (۶۲) منتر
(۶۳) الزام (۶۴) رام لیلا (۶۵) دعوت (۶۶) دین داری (۶۷) جہر بدر (۶۸) نغمۂ روح
(۶۹) مستی (۷۰) نخل امید (۷۱) مندر (۷۲) مستعار گھڑی (۷۳) دعوتِ شیراز
(۷۴) مزارِ آتشیں (۷۵) قزاقی (۷۶) تحریک (۷۷) دو سکھیاں (۷۸) سہاگ کا جنازہ
(۷۹) داروغہ کی سرگزشت (۸۰) خانہ برباد (۸۱) استعفیٰ (۸۲) نیک بختی کے تازیانے (۸۳)
مریدی (۸۴) جہاد (۸۵) آنسوؤں کی ہولی (۸۶) کفارہ (۸۷) گلی ڈنڈا (۸۸) کشمکش
(۸۹) ماں (۹۰) علاحدگی (۹۱) خانہ داماد (۹۲) گھاس والی (۹۳) مزارِ الفت (۹۴) جلوس
(۹۵) بیوی سے شوہر (۹۶) پوس کی رات (۹۷) شراب کی دوکان (۹۸) جیل
(۹۹) سانپ کی معشوقہ (۱۰۰) تالیفِ قلب ۔

ان کے علاوہ امرت رائے نے ہندی میں شائع شدہ (۷) سات کہانیاں
'گپت دھن'، میں شامل کردی ہیں، جو ہندی مجموعوں میں شامل نہیں تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں:
(۱) سیلانی بندر (۲) بنی کی نیتی نرواہ (۳) دیر و حرم (۴) پریم سوتر (۵) ٹھپنی
(۶) موٹے رام شاستری (۷) پربت یاترا

ان کے علاوہ اردو میں شائع شدہ حسب ذیل (بارہ) کہانیاں بھی 'گپت دھن'،
میں شامل کرلی گئی ہیں:
(۱) کرموں کا پھل (۲) فتح (۳) زنجیرِ ہوس (۴) خنجرِ وفا (۵) انتقام (۶)

(۶) بڑے بابو (۷) نادان دوست (۸) خودی (۹) قوم کا خادم (۱۰) بند دروازہ (۱۱) ترسول (۱۲) دیوی۔

متذکرہ بالا کے علاوہ ۶ (چھ) کہانیاں ہنوز ہندی میں شائع نہیں ہو سکی ہیں، جن کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) بانسری (۲) آب حیات (۳) اشک ندامت (۴) روئے سیاہ (۵) روح حیات (۶) تندھی

پھر بھی مندرجہ ذیل ۳ (تین) کہانیاں ہندی اخبار و رسائل میں پڑی ہیں جو ابھی تک کسی ہندی مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکی ہیں:

(۱) سمپادک موٹے رام شاستری (۲) سوپن (۳) غمی

مندرجہ ذیل ۱۴ (چودہ) کہانیاں اردو رسائل میں شائع ہوئیں لیکن اردو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں:

(۱) شعلہ حسن (۲) بانسری (۳) اشک ندامت (۴) آب حیات (۵) بعد از مرگ (۶) روئے سیاہ (۷) روح حیات (۸) معمہ (۹) بزم پریشاں (۱۰) سانپ کی معشوقہ (۱۱) حسن ظن (۱۲) پنچ ذات کی لڑکی (۱۳) تالیف قلب (۱۴) دیر و حرم

اسی طرح ہندی میں شائع شدہ مندرجہ ذیل ۳۹ (انتالیس) کہانیاں اردو میں شائع نہیں ہوئیں:

(۱) لاگ ڈانٹ (۲) سوتو رکشا (۳) چکمہ (۴) پورو سنسکار (۵) تگادا (۶) بوڑم (۷) راج بھگت (۸) ویر کا انت (۹) گرہ داہ (۱۰) آپ بیتی (۱۱) آبھوشن (۱۲) سیلانی بندر (۱۳) بنی کی نیتی نرواہ (۱۴) کتی دھن (۱۵) نیراش (۱۶) اُڈھلر (۱۷) نیتر (۱۸) وشواس (۱۹) سوپن (۲۰) ماتا کا ہردے (۲۱) آدھار (۲۲) پریم سوتر (۲۳) سمپادک موٹے رام شاستری (۲۴) بہشکار (۲۵) سجان بھگت (۲۶) ایکٹرس (۲۷) موٹے رام شاستری (۲۸) پیسن ہاری کا کنواں (۲۹) ابھیلاشا (۳۰) کھڑیچ (۳۱) فاتحہ (۳۲) پروت یاترا (۳۳) قانونی کمار (۳۴) غمی (۳۵) دھکار (۳۶) سبھاگی (۳۸) سہاگ کی ساڑی (۳۹) میکو۔

متذکرہ بالا تمام کہانیوں کی ہندی اور اردو اشاعتوں کا تقابلی مطالعہ پیش کرنا تفصیل طلب ہے۔ جو سردست نہ ممکن ہے، نہ مناسب۔ نمونے کے طور پر اردو اخبار و رسائل میں

پہلے شائع شدہ اور پریم چند کی زندگی میں ہندی میں شائع شدہ دو کہانیوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

کپتان : کپتان صاحب

یہ کہانی ٹیگور کی کہانی 'ماسٹر مشائے' سے مستعار ہے۔ اس کی پہلی اشاعت اردو میں 'زمانہ' میں دسمبر ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ کہانی کا بنیادی پلاٹ یہ ہے کہ جگت سنگھ گھمکڑ، سیلانی اور آوارہ گرد نوجوان ہے۔ اس کے باپ ٹھاکر بھگت سنگھ ڈاک خانہ کے منشی ہیں۔ ان کی جیب سے جگت سنگھ نے دو سو روپے کے بیمہ کی رجسٹری نکال لی اور بمبئی روانہ ہوگیا، جہاں اسے فوج میں ملازمت مل گئی اور اپنی جفاکشی و محنت سے ترقی کرکے کپتان ہوگیا۔ بھگت سنگھ کو غبن کے جرم میں سزا ہوگئی اور جب وہ اپنی سزا کی میعاد پوری کرکے باہر آیا تو اس کے بیٹے سے ملاقات ہوئی۔ دونوں ہنسی خوشی اپنے گھر کو واپس آئے۔ انھوں نے گھر پہنچنے پر دیکھا کہ سب کچھ تباہ و برباد ہوچکا ہے لیکن بوڑھا باپ خوش تھا کہ اس کا بیٹا فوج میں کپتان ہے۔ یہی کہانی اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہوئی لیکن واقعات کی ترتیب میں فرق ہے۔ جابجا سے ہندی ترجمے میں اضافے نظر آتے ہیں۔

کہانی کا ابتدائی فقرہ ہے: "جگت سنگھ کو کتابوں سے نفرت تھی۔" جس کو ہندی میں "جگت سنگھ کا اسکول جانا، کنین کھانے یا مچھلی کا تیل پینے سے کم اپریہ نہ تھا" لکھا گیا ہے۔ اس کے بچپن کے مزاج کے بارے میں ہندی میں اضافہ ہے: "سوار کے گھوڑے کے پیچھے تالی بجانا، یکّوں کو پیچھے سے پکڑ کر اپنی اور کھینچنا، بوڑھوں کی چال کی نقل کرنا، اس کے منورنجن کے وشئے تھے۔" اسی طرح بھگت سنگھ کے دیہات میں تقرر ہونے کے بیان میں بھی ہندی میں اضافہ ہے: "الٹی ہانی یہ ہوئی کہ دیہاتوں میں جو بھاجی ساگ، اُپلے ایندھن مفت میں مل جاتے تھے، وے سب یہاں بند ہوگئے۔" جگت سنگھ کے بچپن سے ہی توانا و تندرست ہونے کے متعلق ہندی عبارت میں اضافہ ہے: "اگر وہ اپنے پتا کے ہاتھ پکڑ لیتا تو وہ ہل بھی نہ سکتے، پر جگت سنگھ اتنا سینہ زور نہ تھا۔"

جگت سنگھ کا اپنے باپ کی جیب سے روپے اڑانا، جس نے اس کی زندگی کو دوسری راہ پر ڈال دیا، اردو میں مختصراً درج ہے، ہندی میں اضافہ کے ساتھ ہے۔ اسی طرح جگت سنگھ کے فوج میں ملازم ہونے کے بیان میں تفصیلی عبارت ہندی میں ملتی ہے، جو اردو میں نہیں ہے۔ اردو میں رخصت لینے کی خواہش اتفاقیہ بیان کی گئی ہے۔ باوجود جزئیات کے اختلاف کے انجام دونوں میں یکساں ہے۔ ہندی کی طرح اردو میں بھی اضافے نظر آتے ہیں۔ رہائی کی شب کے متعلق اردو میں یہ

عبارت ملتی ہے جو ہندی میں نہیں ہے :

"آج قیدیوں کی شب عید تھی۔ محافظ جیل نے انھیں آزاد کردیا تھا۔ وہ چاروں طرف خوش فعلیاں کرتے پھرتے تھے۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بغلیں بجاتا تھا، کوئی بیوی کے ملنے سے بیتاب، کوئی لڑکوں کو دیکھنے کے لیے بے قرار۔ سب اپنے اپنے منصوبے باندھ رہے تھے۔ سب کے سر پر ایک مست آمیز اضطراب کا جنوں سوار تھا۔ آپس میں دھول دھپا بھی ہو جاتا تھا۔ آج ایام مصیبت کا خاتمہ ہے۔ کل اس کال کوٹھری سے نکلیں گے۔ آتشِ شوق دہک رہی تھی۔ لیکن بھگت سنگھ زمین پر پڑے اپنی تقدیر کو رو رہے تھے۔ اپنی حرماں نصیبی کا انھیں آج تک ایسا جاں شکن صدمہ نہ ہوا تھا۔ گھر کی تباہی کانوں سے تو سن لی لیکن آنکھوں سے کیوں کر دیکھا جائے گا۔ کسی کی موت اور اسے جانکنی کی حالت میں دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ ہائے اب کوئی نام کو رونے والا بھی باقی نہیں۔ کیا کرنے گھر جاؤں، یہیں کہیں ڈوب مروں، قصہ تمام ہو جائے۔"

اس طرح ہندی میں کہانی جس منزل پر ختم ہو جاتی ہے، اردو میں اس کے بعد کے واقعات بھی تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

جنت کی دیوی : سورگ کی دیوی

یہ کئی اعتبار سے تقابلی مطالعے کے لئے اہم ہے، جو ستمبر ۱۹۲۵ میں شائع ہوئی غالباً پہلی بار ہندی میں شائع ہوئی۔ کہانی کے اردو اور ہندی متن میں متعدد مقامات پر اختلافات اور اضافے نظر آتے ہیں، جن کی تفصیل پیش کرنا ممکن نہیں۔ اردو میں کہانی مختصراً شائع کی گئی ہے اردو متن میں بھی بعض ایسے ٹکڑے ہیں، جو ہندی میں نہیں ہیں۔ سیتا سرن کا اپنی والدہ کے متعلق یہ تبصرہ ہندی میں نہیں ملتا:

"سیتا سرن مسکرایا، شاید اماں کا بس ہوتا تو وہ مرنے کے بعد بھی بہو کو مالکن نہ ہونے دیتیں۔ مرتیں ہی کیوں ؟"

اور لیلا کی خفگی کے سلسلہ کا یہ ٹکڑا بھی ہندی میں نہیں ہے:

"لیلا نے میکے کی تیاری شروع کی۔ ماں باپ کیا ایک ٹکڑا روٹی نہ دیں گے! لیکن ذرا ہی دیر میں اس کا خیال پلٹ گیا۔"

اس کہانی کے ترجمہ میں یہ احتیاط بھی برتی گئی ہے، اردو عبارت کو ہندی میں ڈھالتے ہوئے بعض جزوی اضافے کر دیئے ہیں۔ مثلاً اردو کی عبارت ہے:

"ان کے سر پر راگ رنگ کا بھوت سوار ہے۔ ادھر میں گئی، ادھر یہ گھر مٹی میں ملا۔ مفت خورے پیچھے پڑے ہی ہوئے ہیں۔ دو چار مہینہ میں وارا نیارا ہو جائے گا"

اس کا ترجمہ ہندی میں یوں کیا گیا:

"ان پر ورشے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ میں کیا کروں۔ اگر میں چلی جاتی ہوں تو تھوڑے ہی دنوں میں سارا گھر مٹی میں مل جائے گا اور ان کا وہی حال ہوگا جو سوارتھی متروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے نوجوان رئیسوں کا ہوتا ہے۔ کوئی کلٹا گھر میں آجائے گی اور ان کا سروناش کر دے گی۔"

'بازارِ حسن: سیوا سدن

عورت ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، محبوبہ ہے، خوابوں کی ملکہ ہے اور شریک حیات ہے! اسے ظاہری طور پر انسانی زندگی کو تربیت و شائستگی عطا کرنے کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے لیکن اگر عملی طور پر نظر کی جائے تو عورت کو سماجی زندگی میں پسماندگی و استحصال کی خوبصورت علامت کہا جا سکتا ہے۔ مرد مساوی اختیار عطا کرنے کا زبانی طور پر دعویدار ہوتا ہے مگر اسے محکوم بنانے اور استحصال کرنے میں جذبۂ مسرت و طمانیت حاصل کرتا ہے۔ مرد فسق و فجور میں گرفتار ہو، گناہ میں آلودہ رہے، مکر و فریب کا پشتارہ ہو، ظلم و جبر کی راہ پر گامزن ہو لیکن اسے سماجی زندگی میں آزادی و برتری حاصل رہتی ہے۔ عورت ایک بار بھی کسی غلط فہمی یا مرد کی طاقت کے استعمال یا ظلم و تشدد کا شکار ہو کر عفت و عصمت کھو بیٹھے تو پھر ہندوستانی سماج عورت کو سوختنی و گردن زدنی قرار دے دے گا۔ عین ممکن ہے کہ بنارس میں سکونت کے دوران پریم چند دال منڈی سے گذرے ہوں — جہاں طبلے کی تھاپ اور پائل کی جھنکار کے پیچھے انھوں نے عورت کی بے بسی، سسکیاں اور تڑپنا دیکھا ہو! اس لیے جب وہ 'بازارِ حسن' لکھنے لگے تو سماج کے پرفریب چہرے کو بے نقاب کرنے کی تمنا ابھر کر سامنے آگئی۔ حالانکہ انھوں نے سماجی زندگی و مسائل پر مبنی ناول اس کے قبل بھی لکھے تھے لیکن اس ناول میں فنی بصیرت، تخلیقی عمل اور تجربے کی گہرائی زیادہ پختگی حاصل کرتی ہے۔ شاید انھیں خصوصیت کے پیش نظر پریم چند نے تخلیقی معیاروں پر

اسے اپنا پہلا ناول قرار دیا تھا[51]، جس سے ڈاکٹر رام بلاس شرما کو غلط فہمی ہوئی کہ 'بازارِ حسن' سے پریم چند نے ناول لکھنے کی ابتدا کی۔ 'سیوا سدن' کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر رام بلاس شرما لکھتے ہیں: "سرشار اور مرزا رسوا کو کالے کوسوں چھوڑتے ہوئے پریم چند نے یہ اپنیاس اردو میں لکھا۔"[52]

یہ بیان انتہائی گمراہ کن اور مبالغہ آمیز ہے کہ طوائفوں کی زندگی پر پریم چند کا یہ ناول اردو کے دیگر ناولوں سے زیادہ فنی پختگی اور سماجی بصیرت کا حامل ہے۔ طوائفوں کی زندگی پر قاری سرفراز حسین کے 'شاہد رعنا' اور مرزا ہادی رسوا کے 'امراؤ جان ادا' کو اردو ناولوں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ خصوصاً رسوا نے طوائفوں کی زندگی پر انتہائی فنی گہرائی و گیرائی سے لکھا ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر ناول آج تک نہ لکھا جا سکا۔ رسوا نے نہ صرف امراؤ جان کی آپ بیتی لکھی ہے بلکہ اودھ کے زوال پذیر نظام کی جیتی جاگتی تصویر اتار دی ہے[53]۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے 'امراؤ جان ادا' اور 'بازارِ حسن' کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے: "پریم چند کے یہاں وقت کے گزر جانے کی وجہ سے ہمیں یہ توقع تھی کہ حقیقت نگاری زیادہ کامیاب اور زندگی کی تصویر زیادہ سچی ہوگی لیکن پریم چند کے ذہن پر ان کے اخلاق کا جذبہ اس قدر مسلط تھا اور اصلاح کی قوت اتنی حاوی تھی کہ آخر وہ اپنے کردار کو زندگی سے دور کر دیتے ہیں۔"[54] ڈاکٹر قمر رئیس نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے۔ انھوں نے 'امراؤ جان ادا' اور 'بازارِ حسن' کا تقابل

---

[51] امرت رائے: قلم کا سپاہی ص ۴۸۶

[52] رام بلاس شرما: پریم چند اور اُن کا یگ ص ۲۲۵

[53] "ماضی کی زندہ تصویر بنانے اور اس کا سچا نقش ابھارنے کے لیے انھیں ترتیب دینا، پرانے انداز پر سجانا اور سنوارنا، آئینے میں اپنے خد و خال دیکھنا اور عمرِ رفتہ کو آواز دینا ضروری ہے۔ یہی ہمارا مطالبہ ہے اور رسوا اسے کمال فن کے ساتھ پورا کرتے ہیں، امراؤ جان اس نگار خانے کو ماضی کی آرسی دکھاتی اور اگلے انداز پر سجاتی ہیں وہ آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی اور اپنے چہرے کے ان سوئے ہوئے خطوط کو جگاتی ہے جو ماضی کے جلووں سے نسبت رکھتے تھے، یہ عمل ایک ذہنی ہنگامہ ہے جو یک بیک انھیں حال سے نکال کر ماضی میں پھینک دیتا ہے، اب ماضی زندہ ہے، اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے دکھائی دیتے ہیں، وہ انگڑائی لیتا ہے، امراؤ جان کے رگ و ریشے میں اس کے حسن اور ہیبت کی لہر دوڑ جاتی ہے
خورشید الاسلام: تنقیدیں ص ۱۷۴، ۱۷۵

[54] مسیح الزماں: معیار و میزان ص ۱۷۶

کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے: "پریم چند اپنے ناول میں اس بلندی کو نہ چھو سکے۔"[۵۱] امرت رائے بھی ہم خیال ہیں: "ویشیاؤں کی سمسیا 'سیوا سدن' میں اٹھائی لیکن بالکل باہر سے، روکھے سوکھے، سماج سدھارک کی طرح۔ پھر انھیں ان ابھاگنوں کی دل کی گہرائیوں میں لگا اور منشی جی کا من بھیگ گیا اور بس۔"[۵۲] ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں: "بازار حسن کا موضوع بظاہر طوائف کی زندگی ہے لیکن پریم چند طوائف کی زندگی کو پیش کرنے میں قطعی ناکام ہوئے ہیں۔ 'شاہد رعنا' اور 'امراؤ جان ادا' ایسے ناول ہیں، جن سے 'بازار حسن' کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔"[۵۳]

'بازار حسن' کے پلاٹ کے تجزیے میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ پریم چند نے اس ناول کی تخلیق کے قبل سرشار اور رسوا کے ناولوں کے علاوہ وکٹر ہیوگو کے 'لے مزرابل' کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اس کا ثبوت منشی دیا نرائن نگم کے نام ۲ جنوری ۱۹۱۷ کے مکتوب میں ملتا ہے، لکھتے ہیں: "پہلے یہ بتائیے کہ Victor Hugo کی مشہور کتاب Les miserables کا اردو ترجمہ ہوا ہے یا نہیں۔ اگر ہوا ہے تو کہاں سے مل سکتا ہے۔ اگر نہیں ہوا ہے تو میں اس کام میں جٹنا چاہتا ہوں۔ سال بھر کا کام ہے۔ کسی طرح سے پتہ لگائیے۔"[۵۴]

'بازار حسن' کے زمانۂ تصنیف و اشاعت کے بارے میں پریم چند ادبیات کے ماہرین نے مختلف قیاس آرائیاں کی ہیں۔ پریم چند کے جگری دوست منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں: "جب انھوں نے اپنا دوسرا ناول 'سیوا سدن' لکھا تو کلکتہ پبلشنگ ایجنسی نے اس کے پہلے ایڈیشن کے لیے یک مشت ساڑھے چار سو روپے دیے۔ غالباً یہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ مگر پریم چند صاحب کو اپنی ادبی زندگی میں اتنی رقم اس سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ اس ناول سے ان کو یہ بھی فائدہ ہوا کہ ہندی داں جماعت میں ان کی ڈھاک بیٹھ گئی۔"[۵۵] ڈاکٹر اندر ناتھ مدان نے اسی بیان کی بنیاد پر 'بازار حسن' کا سال اشاعت ایک بار ۱۹۱۴ء لکھ دیا لیکن بعد میں ترمیم کرکے اردو مسودے

---

۵۱ قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۸۳

۵۲ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۱۸۰

۵۳ یوسف سرمست: بیسویں صدی میں اردو ناول ص ۱۷۳

۵۴ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۵۶

۵۵ دیا نرائن نگم: پریم چند صاحب کی بعض تصانیف کا حال: زمانہ پریم چند نمبر، ۱۹۳۷

کا زمانۂ تحریر جنوری ۱۹۱۷ء سے جنوری ۱۹۱۸ء کے درمیان قرار دیا ہے۔[51] آچاریہ نند دلارے باجپئی کے قول کے مطابق 'سیوا سدن' کی اشاعت ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔[52] اسی خیال کا اظہار ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر[53] اور ڈاکٹر قمر رئیس نے کیا ہے۔[54] لیکن ڈاکٹر راجیشور گرو نے 'سیوا سدن' کا زمانۂ اشاعت ۱۹۱۶ اور ۱۹۱۷ء کے درمیان قرار دیا ہے[55] ان کے برخلاف امرت رائے کے خیال میں 'سیوا سدن'، ۱۹۱۹ء کے وسط میں شائع ہوا[56] اور ڈاکٹر شیو نرائن سری واستو نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۸ء کے معمے کی وضاحت کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی سعی نامشکور کی ہے کہ یہ ناول اردو میں 'بازارِ حسن' کے نام سے ۱۹۱۴ء میں لکھا گیا اور اس کا ہندی ترجمہ ۱۹۱۸ء کے گرد و پیش طبع ہوا[57] اسی طرح ڈاکٹر یوسف سرمست کا بیان ہے: "پریم چند نے ۱۹۱۶ء سے 'بازار حسن' لکھنا شروع کیا۔"[58]

امرت رائے نے 'بازار حسن' کی تصنیف کی ابتدا جنوری ۱۹۱۷ء قرار دی ہے، جب پریم چند گورکھپور میں تھے[59] اس کی تائید منشی دیا نرائن نگم کے نام پریم چند کے ۲۴ جنوری ۱۹۱۷ء کے مکتوب سے ہوتی ہے جس میں انھوں نے لکھا تھا: "میں آج کل ایک قصہ لکھتے لکھتے ناول لکھ چلا۔ کوئی سو صفحے پہنچ چکا ہے۔ اسی وجہ سے چھوٹا قصہ نہ لکھ سکا۔ اب اس ناول میں ایسا جی لگ گیا ہے کہ دوسرا کام کرنے کو جی نہیں چاہتا..... قصہ دلچسپ ہے اور مجھے ایسا خیال ہوتا ہے میں اب کی بار ناول نویسی میں بھی کامیاب ہو سکوں گا"[60] اور پھر انھوں نے ۲ مارچ ۱۹۱۷ء

---

[51] اندر ناتھ مدان: پریم چند ایک وویچن ص ۴۰

[52] نند دلارے باجپئی: پریم چند ساہتیک وویچن ص ۱۷

[53] رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص ۸۲

[54] قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۸۱

[55] راجیشور گرو: پریم چند ایک ادھیاین ص ۴۲

[56] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۱۹۲

[57] شیو نرائن سری واستو: ہندی اپنیاس ص ۶۹

[58] یوسف سرمست: بیسویں صدی میں اردو ناول ص ۱۴۲

[59] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۱۴۹

[60] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۵۷

کو الہ آباد سے دوبارہ اطلاع دی: "آج کل اپنا ناول لکھنے میں محو ہوں۔ یہ ختم ہو جائے تو کچھ اور کروں"[۵۱]

اس کے دس دن بعد الہ آباد سے دوبارہ لکھا۔ "ناول غالباً ایک ماہ میں پورا ہوگا اور امید کرتا ہوں کہ مئی میں اسے آپ کے معائنے (ملاحظے!) کے لیے حاضر کر سکوں گا۔"[۵۲] اس کا اعادہ ۲۳ مارچ ۱۹۱۷ کے مکتوب میں ہے: "میرا ناول چل رہا ہے۔ اب ذرا اطمینان ہو جائے تو ختم کروں۔ طول ہو رہا ہے۔ چاہتا ہوں کہ جلد انجام کی طرف چلوں"[۵۳] اور ہوا بھی یہی کہ وہ بہت جلد ناول کے انجام کی منزل تک پہنچ گئے۔ انھوں نے ۸ اگست ۱۹۱۷ کو منشی جی کو ناول کے ختم ہونے کی اطلاع دی: "اپنا ناول ختم کر رہا ہوں اسے پہلے ہندی میں طبع کرانے کا قصد ہے۔ اردو میں تو پبلشر عنقا ہیں"[۵۴]

مذکرہ بالا خطوط سے ثابت ہو جاتا ہے کہ 'بازارِ حسن' کی تصنیف ایک سال میں مکمل ہو گئی تھی۔ اردو مسودہ تیار ہونے کے باوجود ناشر کا انتظام نہ ہو سکا، جس کے نتیجہ میں پریم چند کو فیصلہ کرنا پڑا کہ اسے اردو کے قبل ہندی میں ہی شائع کر دیا جائے جہاں ناشرین آسانی سے دستیاب ہو سکتے تھے اور ان کے ناولوں کے شائع کرنے کے متمنی رہتے تھے۔ امرت رائے لکھتے ہیں:

"پودار اسی دم اپنیاس کی پانڈولپی مانگ رہے تھے، جتنی جلدی ملے وہ چھپائی شروع کریں، یہ ایک جی کو اچھی لگنے والی بات تھی۔ لہذا جس روپ میں کتاب لکھی گئی، اس تیزی سے اس کا ہندی کرن شروع ہوا۔"[۵۵] یہ محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند نے 'بازارِ حسن' کا ہندی ترجمہ کرنے میں بڑی مستعدی دکھائی تھی ۲۹ جنوری ۱۹۱۸ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "مضمون ابھی صاف نہیں ہو سکا۔ اپنا ناول ہندی میں لکھ رہا ہوں، فرصت نہیں ملتی۔"[۵۶] اور پھر بعض خانگی مصروفیات کے باوجود ناول کا ہندی ترجمہ مکمل کر ڈالا ۲ جون ۱۹۱۸ء کو منشی دیا نرائن نگم کو دوبارہ اطلاع

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۵۹
۵۲ ایضاً ص ۶۰
۵۳ ایضاً ص ۶۲
۵۴ ایضاً ص ۶۵
۵۵ امرت رائے: پریم چند قلم سپاہی ص ۱۸۱
۵۶ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۶۷

دی: "۲۹ مئی کو شادی سے فراغت پا گیا ابھی دو ایک روز کی جھنجھٹ اور باقی ہے اس کے بعد کلکتے جانے کا قصد ہے اپنے ہندی ناول کو پریس میں دینا ہے"[۵۱] پھر پریم چند "سیوا سدن" کی اشاعت کا انتظام کرنے کی غرض سے ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کو کلکتہ گئے اور وہاں سے ۳۰ جون ۱۹۱۸ء کو واپس ہوئے۔[۵۲] وہیں سے ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھا: "بازارِ حسن کے متعلق بھی گفتگو ہو رہی ہے، اس کا ہندی ایڈیشن دس فارم چھپ چکا ہے۔"[۵۳]

'سیوا سدن' کی پہلی اشاعت ہندی پستک ایجنسی کلکتہ سے ہوئی اس میں اختلاف نہیں ہے لیکن سال اشاعت کے تعین میں مختلف و متضاد آرا رہیں۔ ہمارے خیال میں 'سیوا سدن' کا سال اشاعت دسمبر ۱۹۱۸ء قرار دینا چاہیے۔ اس کے مندرجہ ذیل شواہد ہیں:

۱۔ ڈاکٹر گوپال رائے کی اطلاع کے مطابق پٹنہ کے چیتنیہ پستکالیہ میں 'سیوا سدن' کا پہلا ایڈیشن موجود ہے، اس پر سمبت ۱۹۷۵ درج ہے۔[۵۴]

۲۔ ڈاکٹر کملا پرساد گپت کے بیان کے مطابق اس کی تاریخ اشاعت ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء ہے، جسے انھوں نے بنگال گزٹ میں شایع شدہ پہلی سہ ماہی فہرست کی بنیاد پر متعین کیا ہے۔

۳۔ 'سیوا سدن' کا ایک تعارف 'سرسوتی' میں ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا جس سے اس ناول کے فروری ۱۹۱۹ء کے قبل شایع ہو جانے کی تصدیق ہوتی ہے۔

۴۔ پریم چند نے ۲۴ر اپریل ۱۹۱۹ء کے مکتوب بنام منشی دیا نراین نگم میں 'سیوا سدن' کے ہندی میں مقبول و ہر دلعزیز ہونے کا ذکر کیا ہے، جس سے واضح ہے کہ اس وقت تک ہندی اخبار و رسائل میں 'سیوا سدن' کے اچھے تبصرے شائع ہو چکے تھے۔ اس مکتوب میں پریم چند لکھتے ہیں: "آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ میرے ہندی ناول نے خوب شہرت حاصل کی اور اکثر نقادوں نے اسے ہندی زبان کا بہترین ناول کہا ہے۔ یہ 'بازارِ حسن' کا ترجمہ ہے۔"[۵۵]

---

۵۱ پریم چند: چھٹی پتری ج ۱ ص ۶۹
۵۲ ایضاً ص ۷۰
۵۳ ایضاً ص ۷۲
۵۴ گوپال رائے: اپنیاس کار پریم چند مرتبہ ستیش چندر گپت وغیرہ ص ۳۸
۵۵ پریم چند: چھٹی پتری ج ۱ ص ۸۳

اردو میں 'بازارِ حسن'، لکھا گیا، لیکن اردو میں اس کی اشاعت کی نوبت بہت بعد میں آسکی اور وہ بھی شدید دشواریوں کے بعد اردو میں ناشر 'عنقا' تھے اس لیے پریم چند نے اپنے نئے دوست امتیاز علی تاج سے استدعا کی، جو کہکشاں کے مدیر تھے اور قومی خیالات کے حامل تھے۔ پریم چند نے لکھا کہ اگر کتابی صورت میں اشاعت دشوار ہے تو وہ رسالے میں قسط وار شائع کردیں کسی طرح قارئین کی نظروں سے گزرے اور مصنف کی محنتوں کا ثمرہ ملے! ۲۷ر جولائی ۱۹۱۸ء کو تاج کو لکھتے ہیں: "کب یہ ممکن ہو کہ کہکشاں میں میرا ناول 'بازارِ حسن' بالترتیب نکل سکے، ممکن ہے کہ اس کے نکلنے سے پرچے کی اشاعت پر کچھ اثر پڑے یہ ناول کوئی تین سو صفحات کا ہے۔ اس کے لکھنے میں میں نے اپنی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، کتاب کی صورت میں اب تک اس لیے نہیں نکال سکا کہ مجھے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ تمام و کمال ایک بار صاف کرسکوں ماہوار دس بیس صفحے تو ممکن ہیں مگر یکبارگی ۳۰۰ صفحات کا خیال کرکے حوصلہ چھوٹ جاتا ہے مگر جب تک 'کہکشاں' کی اشاعت معقول نہ ہو جائے ناول نکالنے کا خیال قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔"[۵۱] قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاج نے پریم چند کی تجویز قبول کرلی تھی کیوں کہ ۲۰ر مارچ کے مکتوب میں وہ دوبارہ لکھتے ہیں: "سخت نادم ہوں کہ اب تک 'بازارِ حسن' کے متعلق ایفائے وعدہ نہ کرسکا بار بار کوشش کی کہ مستقل طور پر صاف کرڈالوں لیکن ایک نہ ایک رکاوٹ آجاتی ہے۔ کتاب ایک چوتھائی صاف کرکے پڑی ہوئی ہے اب تو ۱۵ر اپریل تک مجھے مرنے کی، فرصت نہیں ہے۔ انشاء اللہ یکم مئی تک۔"[۵۲] اور ۲ر اپریل ۱۹۱۹ء کو بازارِ حسن کی پہلی قسط "مرنے کی فرصت" نہ ہونے کے باوجود بھیجدی: "کل کی ڈاک سے 'بازارِ حسن' بذریعہ رجسٹر پیکٹ خدمت میں پہونچے گا ختم ہوگیا، پیکٹ باندھا ہوا تیار ہے۔ آج ڈاک خانہ بند ہے۔ آپ اسے ایک بار سرسری طور پر دیکھ جائیں اور اس کے متعلق اپنی رائے سے مطلع فرمادیں"[۵۳] اور پہلی قسط بھیجنے کے بعد پریم چند اس کے مسودات نقل و صاف کرنے میں دل و جان سے مصروف ہوگئے۔ ۱۹ر اپریل ۱۹۱۹ء کو اطلاع دیتے ہیں: "اب مضامین اور 'بازارِ حسن'، میں لپٹا ہوں خدا کرے لاہور میں امن ہو۔"[۵۴]

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۹۷

۵۲ ایضاً ص ۹۸

۵۳ ایضاً ص ۹۹

۵۴ ایضاً ص ۹۹

اسی کو کہتے ہیں کہ قاضی جی دبلے کیوں شہر کے اندیشے سے! لاہور میں امن و امان کی تمنا کے اظہار میں اس افسوس ناک صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے جس میں ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ انسانیت کو جھلس رہی تھی اس پر پریم چند نے 'بازارِ حسن' میں اظہار خیال کیا ہے، اُن کی دلی تمنا ہے کہ یہ اردو میں شائع ہو جائے تاکہ اردو قارئین کو ان کے زاویۂ نظر کا علم ہو سکے۔ تاج نے اشاعت کی جو شرطیں رکھی ہیں، سب کی سب قابل قبول ہیں۔ ۲۷ رمئی ۱۹۱۹ کو لکھتے ہیں: "بازارِ حسن کے متعلق: آپ اسے اگر ہمیشہ کے لیے چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے میں اردو پبلک سے واقف ہوں یہاں ہمیشہ کے معنی ہیں زیادہ سے زیادہ تین ایڈیشن اور وہ بھی دس سالوں میں یا اس سے زیادہ اس لیے میں ایسی شرطیں ہرگز پیش نہیں کر سکتا، جو نامعقول ہوں میرے خیال میں پہلے ایڈیشن کے لیے آپ بیس فیصدی رکھیں اور بقیہ دو ایڈیشنوں کے لیے دس فیصدی یعنی کل رقم تین سو پچاس روپے ہوتی ہے۔ یہ حساب میں نے کل امور کو مدنظر رکھ کر پیش کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو ناگوار نہ ہوگا۔"[۵۱] لیکن ۳۰ رجولائی ۱۹۱۹ء کے خط میں ایک اشارہ ملتا ہے کہ شاید تاج نے پریم چند کی تمام شرطیں قبول نہ کیں حالانکہ اس میں پریم چند نے بہ لطائف الحیل 'بازارِ حسن' کے بارے میں تاخیر کا ذکر کیا ہے لیکن اس میں معذرت کرنے کی کیفیت نظر آتی ہے۔ لکھتے ہیں: "'بازارِ حسن' کا ذکر کرتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے اس لیے اب وعدے نہ کروں گا"[۵۲] یہ رجحان ۱۱ اگست ۱۹۱۹ء کے خط میں زیادہ واضح ہو جاتا ہے: "'بازارِ حسن'، تو معلوم نہیں کب تیار ہو، اس اثنا میں اگر تبلیسی حصہ دوم آپ شائع کر سکیں تو خوب ہو۔"[۵۳] اس کے جواب میں تاج نے کیا لکھا، اس کا علم نہیں۔ غالباً انھوں نے اردو مسودہ ایک نظر دیکھ لینے کی خواہش ظاہر کی تھی کیوں کہ ۲۰ رستمبر ۱۹۱۹ء کو پریم چند لکھتے ہیں: "اب بازارِ حسن کے متعلق، یہ ناول تقریباً تین سو صفحات کا ہوگا، لکھا ہوا تیار ہے مگر محض عدیم الفرصتی کے باعث صاف نہ کر سکا اگر آپ اتنی بڑی کتاب چھاپ سکیں تو میں صاف کرنا شروع کروں ورنہ ابھی گرمی کی تعطیل تک ملتوی رکھوں آپ کو صاف کرنے کی تکلیف نہ

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۰۱

۵۲ ایضاً ص ۱۰۳

۵۳ ایضاً ص ۱۰۴

دوں گا کیوں کہ صاف کرتے ہیں قصے کے سین کے سین پلٹ جاتے ہیں۔ اس قصے میں میں نے ایک اخلاقی بے شرمی یعنی بازار عصمت فروشی پر چوٹ کی ہے اگر آپ یونہی دیکھنا چاہیں تو اس کے متفرق اجزا آپ کے پاس بھیجدوں۔ معاوضے کے متعلق، قصہ جب آپ دیکھ لیں گے تب۔ 'کہکشاں' کے متعلق میں نے پہلے عرض کی تھا کہ میں آئندہ کئی ماہ تک بہت کم لکھ سکوں گا مگر انشاء اللہ کوئی موقع نکال کر آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔"[1] مگر شاید تاج نے پھر کوئی تقاضہ کیا کیونکہ ۲۵ ستمبر ۱۹۱۹ کو لکھتے ہیں: 'بازار حسن' میں تاخیر ہوئی، یہ خیال ہوا کہ دس دن کی تعطیل ہو رہی ہے ممکن ہے صفحات اور نقل ہو جائیں تو اکٹھے بھیجوں اس لیے روک لیا ہے۔"[2] لیکن اس ناول کا صاف کرنا جوئے شیر لانا ہو گیا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں: "بازار حسن' رفتہ رفتہ صاف ہو رہا ہے ارادہ ہے کہ محرر رکھ کر کام جلدی سے ختم کر ڈالوں۔"[3] پھر ۱۹ دسمبر ۱۹۱۹ کو لکھا: "تبیسی کا کام جاری رکھیے گا تا کہ حصہ اول اور دوم ساتھ ساتھ نکلیں 'بازار حسن' کی کاپی بھی قصۂ موعودہ کے ساتھ روانۂ خدمت ہو گی۔"[4] اور پھر ۱۱ فروری ۱۹۲۰ کو لکھا: "بازار حسن' کا گجراتی ایڈیشن نکل رہا ہے خوب خوب تصویریں نکل رہی ہیں۔ آپ چاہیں گے تو بلاک دلوا دوں گا مصور ایڈیشن نکل جائے گا اور اردو ان۔"[5] ابھی طرح کسی نہ کسی شکل میں بازار حسن کا مسودہ اردو میں دوبارہ صاف ہوا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۲۰ کو اطلاع دیتے ہیں: "'بازار حسن' کے اب کل اڑتالیس صفحات باقی ہیں۔ پہلی اپریل کو آپ کے پاس رجسٹرڈ پہنچ جائے گی۔"[6] اور پھر ۲۴ اپریل ۱۹۲۰ کو لکھا: "مفصل خط ملا لیکن مفصل جواب اس وقت دوں گا جب آپ 'بازار حسن' تمام و کمال پڑھ چکے ہوں گے اس کے متعلق آپ نے جو کچھ فرمایا، وہ سب آپ کی قدر افزائی ہے میں بہت ممنون ہوں گا، اگر جناب اپنی مفصل تبصرانہ رائے سے مجھے مطلع فرمائیں،

---

[1] پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۰۵

[2] ایضاً ص ۱۰۱

[3] ایضاً ص ۱۰۸

[4] ایضاً ص ۱۱۰

[5] ایضاً ص ۱۱۱

[6] ایضاً ص ۱۱۲

اس میں ناراض ہونے کی کون بات ہے؟ نقاد ہیں کہاں؟ مجھے تو اس کی آرزو رہتی ہے کہ کوئی مجھے خوب نیک و بد سمجھائے۔ اس کی طباعت، حق التحدمت وغیرہ کے متعلق آپ مجھ سے کہیں بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔"[۱] پھر تاج کو اردو کا تمام مسودہ فرمائش کے مطابق بھیج دیا۔ جسے تاج نے دیکھا اور پسند کیا تو پریم چند نے صاف صاف رائلٹی کا مسئلہ چھیڑا۔ ۲۲ اپریل ۱۹۲۰ کے مکتوب میں لکھتے ہیں: "بازار حسن آپ شایع کریں تو شرائط کے لیے یہ عرض ہے کہ آپ پہلے ایڈیشن کے لیے مجھے بیس فیصدی رائلٹی عطا فرمادیں۔ پہلا ایڈیشن بارہ سو نسخوں کا ہو۔ غالباً سوا روپے قیمت رکھی جائے۔ مجھے دو سو چالیس جلدیں ملیں گی یہ جلدیں خواہ مجھے جلدوں کی صورت میں دیدیں یا روپے کی صورت میں۔ روپے کی صورت میں دینے سے وہی کمیشن جو میں کسی دوسرے بک سیلر مثلاً میں رسالہ 'زمانہ' کو دوں گا، آپ کو وضع کر دوں گا۔ اگر آپ اسے پسند نہ فرمادیں تو آپ مجھے جلدیں ہی دیدیں۔ میں کسی طرح بیچ یا بکوا لوں گا۔ اگر ان صورتوں میں کوئی پسند نہ ہو تو مجھے پہلے ایڈیشن کے لیے دو سو پچاس روپے عطا فرمادیں۔ ہندی میں مجھے پانچ سو روپے ملے تھے۔ گجراتی ایڈیشن میں مجھے سو روپے ملے۔ آپ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ دو سو پچاس روپے غالباً ضرورت سے زیادہ مطالبہ نہیں ہے۔ میری ڈیڑھ سال کی محنت اور خامہ فرسائی کا نتیجہ یہ کتاب ہے۔ اگر یہ سب شرطیں آپ کو ناگوار معلوم ہوں تو اپنی مرضی کے مطابق کتاب شائع کر کے مجھے جو چاہیں بھیج دیں۔ میں آپ کا مشکور ہوں گا۔ مجھے یہ سخت ذلت معلوم ہوتی ہے کہ اپنی کتاب کے لیے پبلشروں کی خوشامد کرتا پھروں۔"[۲] اور پھر ۱۵ جون ۱۹۲۰ء کو لکھا: "بازار حسن کے متعلق اگر آپ کو میری شرطیں منظور ہوں تو روپے کے لیے فکر نہ کیجیے۔ مجھے فی الحال اشد ضرورت نہیں آخیر اگست تک بھیجدیں تب بھی کوئی حرج نہیں"[۳] علاوہ برایں مسودے کی ضخامت پر نظر رکھتے ہوئے ۲۵ جون ۱۹۲۰ء کے مکتوب میں تاج کے دو حصوں میں شائع کرنے کی تجویز قبول کرتے ہوئے لکھا: "بہتر ہے 'بازار حسن' دو حصوں میں شائع ہو۔ میرے خیال میں بھی یہی تجویز تھی۔"[۴] لیکن شاید کسی بنا پر 'بازار حسن' کی اشاعت میں

۱۔ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۱۲

۲۔ ایضاً ص ۱۱۲

۳۔ ایضاً ص ۱۱۴

۴۔ ایضاً ص ۱۱۵

تاج اور پریم چند کے معاہدے کے برخلاف تاخیر ہوگئی کیوں کہ ۲۸ اگست ۱۹۲۰ کے مکتوب میں پریم چند کے یہ فقرے ملتے ہیں: "معلوم نہیں 'پریم بتیسی' اس زندگی میں شائع ہوگی یا نہیں۔ 'بازار حسن' کا اللہ ہی حافظ ہے اور 'ناکام' کا تو ابھی ذکر ہی کیا۔ نہ زمانہ پریس کو فرصت، نہ دارالاشاعت کو مہلت"[۵۱] جس کے جواب میں غالباً تاج نے تسلی و تشفی کا خط لکھا اور اشاعتی کام شروع کرنے کی اطلاع دی کیوں کہ پریم چند ۲۶ اگست ۱۹۲۰ کو مسرور ہو کر لکھتے ہیں: "بازار حسن، کی کتابت ہونے لگی بڑی خوشی کی بات ہے۔ حصہ اول ابھی تک منشی دیا نرائن صاحب کی بے توجہی کے سبب معرض التوا میں پڑا ہوا ہے مگر امید ہے کہ حصہ دوم کا شائع ہونا تازیانے کا کام دے گا اور یہی میری غرض تھی"[۵۲] اور اس خبر سے کہ 'بازار حسن' کی کتابت ہو رہی ہے پریم چند کی امنگ بڑھتی جاتی تھی۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ کو مسودے میں شامل کے خط کے ایک حصے کا مسودہ ارسال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ایشور مریض کو جلد شفا اور آپ کو تیمارداری کی مصیبت سے نجات۔ بہت خوش ہوں کہ 'بازار حسن' کی کتابت قریب ختم ہے"[۵۳] پریم چند کی دلی خواہش تھی کہ 'بازار حسن' شائع ہو اور بہت اچھا مصور ایڈیشن شائع ہو لیکن کہیں سے کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی، جس کی نشان دہی ۱۰ نومبر ۱۹۲۰ کے مکتوب سے ہوتی ہے: "ناول کے متعلق تصویروں کی رائے منسخ ہوگئی۔ ہندی کا پبلشر اسے جلد نکالنا چاہتا ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں تصویریں دے دی جائیں گی۔ اس لیے فی الحال ان کا ذکر فضول۔ رہا معاوضہ، وہ قصہ پڑھ لینے کے بعد آپ خود طے کرلیں گے۔ ہندی والوں نے مجھے چار سو روپے دئے ہیں۔ اردو میں اتنی امید نہیں ہے۔ مگر مگر ۲۱ سطری صفحے کے بارہ آنے کے حساب سے قبول کر لینے میں مجھے تامل نہ ہوگا...... مجھے اس کی اشاعت کی فکر ہے"[۵۴]

متذکرہ بالا مکتوب میں ہندی ناشروں سے 'سیوا سدن' کے معاوضے کے طور پر چار سو روپے ملنے کا ذکر ہے لیکن اس کے قبل ۲۲ اپریل ۱۹۲۰ء کے خط میں پانسو روپے کے

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۱۷

۵۲ ایضاً ص ۱۱۹

۵۳ ایضاً ص ۱۲۴

۵۴ ایضاً ص ۱۲۶

ملنے کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان دونوں بیانات میں کون سا صحیح ہے اور کون سا غلط، اب اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ یہ ممکن ہے کہ پریم چند نے اردو ناشر سے سودے بازی کرنے میں رقم بڑھا کر بیان کر دی ہو اور حقیقتاً انھیں ہندی ناشرین سے چار سو روپے سے بھی کم حاصل ہوئے ہوں۔

اردو میں آج بھی کسی کتاب کا چھپوانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے اس وقت مزید دشواریاں حائل تھیں۔ موجودہ صورت حال میں پہلے کاتب صاحب سے خوشامد برآمد کرکے کتابت کرایئے۔ پھر پریس والوں کے پاس دوڑیئے۔ اس وقت صرف لیتھو کے ذریعے طباعت ہوتی تھی۔ اس وقت کتابت و طباعت میں دشواریاں زیادہ تھیں۔ کتابت کرایئے، کاپیاں پتھر پر جموایئے، اگر کاپیاں جمانے میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو سنگ ساز کے نخرے اٹھایئے۔ اس کے بعد خدا ہی حافظ و ناصر ہے جو کتاب صحیح طور پر شائع ہو جائے! ان دشواریوں کو مصنف کیا جانے۔ اسے بہر صورت ناشروں کی لاپروائی نظر آتی ہے! پریم چند کے تقاضوں سے تاج کے قلب و جگر پر کیا گزرتی رہی ہوگی، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہمارے سامنے ان کا کوئی بیان نہیں، پریم چند کے تقاضے ہی تقاضے ہیں۔ ۲۶ جون ۱۹۲۱ء کو لکھتے ہیں: "مجھے مطلق خبر نہیں کہ 'بازار حسن' کی اشاعت کا کام کتنا ہوا اور اس میں کتنی دیر ہے... لیکن آپ کے کسی رسالے میں اس کا اشتہار تک نظر نہیں آتا۔ کچھ راز سمجھ میں نہیں آتا۔ براہ کرم مفصل حالات سے سرفراز فرمایئں"۔[۵۱] پھر ۱۹ دسمبر ۱۹۲۱ کو انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ یاد دہانی کی: "بازار حسن کی باقی کتابت ابھی ختم ہوئی یا نہیں۔ کتاب کے شائع ہونے کا کب تک انتظار کروں"۔[۵۲] لیکن تمام تر ترش روئی کے باوجود ان کے رویے میں مصلحت کوشی رہتی ہے۔ وہ ایسا رویہ اختیار نہیں کرتے کہ تاج ناراض ہو کر کتاب کی اشاعت سے دست بردار ہو جائیں۔ اس لیے ہلکے سے ان کی پیٹھ بھی سہلاتے ہیں۔ ۱۴ فروری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں: "میرا ہندی ناول ختم ہو گیا۔ اب اردو کام جلد ہوگا جب تک 'بازار حسن' پریس سے نکلے گا۔ شاید نئے ناول کا حصہ اول آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے"۔[۵۳] اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ فروری ۱۹۲۲ء تک 'بازار حسن' اردو میں شائع نہیں ہو سکا تھا، پھر اس کے پہلے ایڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا کی تحقیق جدید کہ

---

[۵۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۳۱

[۵۲] ایضاً ص ۱۳۵

[۵۳] ایضاً ایضاً

'سیوا سدن' کا اردو روپ 'بازارِ حسن' لاہور سے ۱۹۱۱ء کے وسط میں شائع ہوا ہے کتنی بے بنیاد اور گمراہ کن ہے، اس پر مزید اظہار کی ضرورت نہیں رہتی۔

راقم السطور کو 'بازارِ حسن' کا پہلا ایڈیشن دستیاب ہوگیا ہے جس کا حصہ اول سلسلۂ کہکشاں[۷۵] میں ادیبِ فطرت نگار منشی پریم چند کے نام سے دارالاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا۔ اس پر سن اشاعت ۱۹۲۱ء طبع ہے۔ جس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ بازارِ حسن کا پہلا حصہ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوگیا تھا اور ۱۶ر فروری ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں حصہ دوم کی اشاعت کا ذکر ہے۔ اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس خط میں ناول کی اشاعت اور نئے ناول کی ابتدا کا ذکر ہے، جو بلاشبہ 'گوشۂ عافیت' ہوگا۔

'بازارِ حسن' اور 'سیوا سدن' کے تقابلی مطالعے میں کئی معنی خیز مباحث سامنے آتے ہیں۔ حالاں کہ 'سیوا سدن'، 'بازارِ حسن' کا ترجمہ ہے لیکن اس میں متعدد اہم ترمیمات اور اضافے کیے گئے ہیں کہ اب اسے الگ ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر 'سیوا سدن' کے نصف اول اور 'بازارِ حسن' کے حصہ اول کے ابواب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں:

(۱) اردو کے چوتھے باب میں ہندی کا چوتھا اور پانچواں باب شامل ہے۔

(۲) ہندی کے پانچویں باب میں اردو کے چار اور پانچ ابواب کے اجزا شامل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ہندی کے دسویں باب میں اردو کے ابواب دس اور گیارہ

(۳) ہندی اور اردو ایڈیشنوں کے ابواب میں گیارھویں باب سے ایک باب کا فرق ہوگیا ہے۔ ہندی میں گیارھواں باب اردو میں بارھواں ہے۔ یہ سلسلہ انیسویں باب تک رہتا ہے۔

(۴) ہندی کے اٹھارہویں باب میں اردو کے انیسویں اور بیسویں باب شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد سے اردو اور ہندی میں دو ابواب کا فرق آ گیا ہے۔ ہندی کا انیسواں باب، اردو کا اکیسواں باب ہے۔

(۵) ہندی کے انیسویں باب کے بعد بیسویں باب کے بجائے بائیسواں باب طبع ہے

---

۷۵ کمل کشور گوئینکا: پریم چند کے اپنیاسوں کی شلپ دودھان ص ۶۱

جو اردو ایڈیشن میں بائیسواں باب ہے۔ اس باب کے نمبر شمار میں اردو ہندی میں یکسانیت ہے۔

(۶) ہندی میں بائیسویں باب کے بعد پچیسواں باب ہے۔ جو اردو میں تیئیسواں باب ہے۔

(۷) ہندی میں چھبیسویں باب کی جگہ پر بائیس ہے۔ اس باب میں اردو کے چوبیسویں اور پچیسویں ابواب کے اجزا شامل کیے گئے ہیں۔

'بازارِ حسن' کے بعض اجزا ہندی ایڈیشن میں نہیں ہیں، جنھیں مترجم نے بلا ضرورت ترک کر دئے ہیں۔ یہ کیوں ہوا ہے، اس کے علل و اسباب بیان کرنا دشوار ہے۔ 'بازارِ حسن' کو 'سیوا سدن' کرنے میں پریم چند کے دوسرے ناولوں کی طرح ترجماتی تجربات کیے گئے ہیں جس سے مختلف مقامات پر دونوں ایڈیشنوں میں بنیادی فرق آگیا ہے۔ یہاں تجزیاتی مطالعے کی نظر سے یکساں مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہیں:

۱۔ 'سیوا سدن' کا اسلوب بیان متعدد موقعوں پر اصل سے زیادہ پر معنی، فطری اور رواں ہے جس سے اس میں اصل تخلیق کی طرح کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ بسا اوقات ترجمے میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے لیکن اس سے تخلیقی رویے پر ضرب نہیں پڑتی بلکہ ترجمے میں اصل سے زیادہ تخلیقی قوت نظر آتی ہے۔ مثلاً:

" رات ہو رہی تھی، چولھے کی صورت دیکھ کر سمن کی روح کانپ رہی تھی
پر طوعاً و کرہاً اُٹھی۔" [۱]

اس کا ہندی ترجمہ یہ ہے:

" رات ہو رہی تھی۔ سُمن کا چولھے کے پاس جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔
بدن میں یوں ہی آگ لگی ہوئی ہے۔ آنچ کیسے سہی جائے گی۔ پر
سوچ بچار کر اُٹھی۔" [۲]

۳۔ اردو میں ایک جگہ پر مہنت جی کے گزرے کاروبار کو طنزیہ انداز میں پیش کیا

---

[۱] پریم چند: بازارِ حسن ج ۱ ص ۲۷

[۲] ایضاً: سیوا سدن ص ۲۴

کیا گیا ہے لیکن ہندی میں اُسے" بانکے بہاری جی کی کرپا" بیان کر کے اس کے طنزیہ اسلوب کو مجروح کر دیا گیا ہے۔

۴۔ زیادہ تر مقامات پر اردو ہندی اشاعتوں کی زبان میں نمایاں ترمیم نہیں کی گئی ہے۔ لیکن بعض الفاظ کے بیجا استعمال کی بنا پر مفہوم تبدیل ہو گیا ہے۔ مثلاً

"آخر حاکم پرگنہ نے دونوں مقدمات سشن سپرد کر دیے"۔ ۵۱

اس کا ہندی ترجمہ کیا گیا:

" حاکم نے انھیں دورے سپرد کر دیا"۔ ۵۲

اردو ایڈیشن میں ایک جگہ 'تیراکی'[۵۳] کا ذکر ہے جسے ہندی میں 'مدرا سیون'[۵۴] کر دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ 'دل کی رانی' اور 'حماقت' کا ترجمہ 'سروگن سمپنا' اور 'انیائے' لکھا گیا ہے۔

'سیوا سدن' پر اردو اسلوب بیان کے اثرات بہت واضح ہیں۔ پریم چند کی زندگی میں شائع شدہ ہندی ایڈیشن میں، عربی فارسی کے مخصوص تلفظات کے پیش نظر صوتیاتی اشارے کیے گئے ہیں اور ناگری حروف پہ نقطوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ بعض جگہوں پر اردو اور ہندی کے مخلوط الفاظ و تراکیب پیش کیے گئے ہیں جو قارئین کو گراں گذرتے ہیں مثلاً نکاح بندھن، پرپھل بدن، نیر زنھک بکواس، وغیرہ بعض مقامات پر اردو محاورات کا غلط استعمال ہوا ہے مثلاً:

" یہ سب فیشن کے غلام ہیں جن کی شکچھا نے انھیں انگریزی کا منہ چڑھانا سکھا دیا ہے"۔ ۵۵

" انتم لیکھ کو پڑھ کر اس کا دھیریہ ہاتھ سے جاتا رہا"۔ ۵۶

اسی طرح "اس کا خون کھولنے لگا" کو" اس کا رکت کھولنے لگا"۔ ۵۷ لکھا گیا ہے۔

---

۵۱ پریم چند: بازار حسن ج ۱ ص۵

۵۲ ایضاً ص۱۷

۵۳ ایضاً ص۱۲۵

۵۴ ایضاً: سیوا سدن ص۵

۵۵ ایضاً ص۲۳۷

۵۶ ایضاً ص۲۳۱

۵۷ ایضاً ص۲۳۷

'بازارِ حسن' میں ایک جگہ قومی زبان کے مسئلے پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پریم چند نے انگریزی زبان و تہذیب کے سامراجی تسلط پر حملے کیے ہیں۔ انھوں نے انگریزی پڑھنے اور بولنے کو غلامی کی علامت قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"جب تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی زبان کا شیدا بنا رہے گا کسی قومی زبان کا ایجاد ہونا محال ہے" ۵۱

مجموعی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ 'سیوا سدن' پریم چند کے اردو ناول 'بازارِ حسن' کا ترجمہ ہے اور بس۔ اسے ہندی افسانوی ادب میں ہندی تخلیقی ناول کی حیثیت سے جگہ دینا زیادتی ہوگی۔

گوشۂ عافیت : پریم آشرم

پریم چند نے 'بازارِ حسن' کا تخلیقی کام ختم کرنے کے تین مہینے کے بعد '۲۲ مئی ۱۹۱۸ء سے گوشۂ عافیت کی ابتدا کی ۵۲ ۲۸ نومبر ۱۹۱۹ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں : "اب کچھ دنوں کے لیے چھوٹے قصے بند کر کے علمی مضامین لکھنے کی کوشش کروں گا۔ دماغ ایک ساتھ دو مختلف پلاٹ نہیں سنبھال سکتا۔ تجربہ کر چکا ہوں کہ ایک ہی کام ایک وقت میں ہو سکتا ہے یا تو ناول لکھوں یا کہانیاں، ناول کے لیے ایک پلاٹ کافی ہے اور اس کا لکھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا ہر ماہ میں دو تین کہانیوں کا۔" ۵۳ اس درمیان انھوں نے کہانیاں کم لکھیں اور اگر لکھیں تو ان پر 'گوشۂ عافیت' کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ کہکشاں کے اپریل ۱۹۲۰ء میں شائع شدہ کہانی 'اصلاح' 'گوشۂ عافیت' کا ایک جزو معلوم ہوتی ہے۔

'گوشۂ عافیت' کے زمانۂ تصنیف و اشاعت کے متعلق پریم چند ادبیات کے ماہرین نے حسبِ دستور مختلف و متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے جن پر بھروسہ کر کے صحیح نتیجے تک رسائی ناممکن ہے۔

---

۵۱ پریم چند : بازارِ حسن ج ۲ ص ۱۳۲

۵۲ امرت رائے : پریم چند قلم کا سپاہی ص ۲۰۳

۵۳ پریم چند : چٹھی پتری ج ۱ ص ۹۱

ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر[۵۱]، ڈاکٹر اندر ناتھ مدان[۵۲]، ڈاکٹر شیو نرائن سریواستوا[۵۳] اور ہنس راج رہبر[۵۴] کے خیال میں 'پریم آشرم' کی اشاعت ۱۹۲۲ء میں ہوئی لیکن ڈاکٹر پریم نرائن ٹنڈن[۵۵] نے اس کی اشاعت ۱۹۲۱ء میں قرار دی ہے۔ اچاریہ نند دلارے باجپئی[۵۶] کے خیال میں 'پریم آشرم' کا سنہ اشاعت ۲۳-۱۹۲۲ء کے درمیان ہے مگر پروفیسر فراق گورکھپوری لکھتے ہیں: "۱۹۱۹ء میں جب وہ اپنا حوصلہ خیز ناول 'پریم آشرم' کے لکھنے میں مشغول تھے تو مدرسی اور سپرنٹنڈنٹ بورڈنگ ہاؤس کی خدمتیں انجام دیتے تھے۔"[۵۷] لیکن امرت رائے کا بیان ہے کہ 'پریم آشرم' کی اشاعت ۱۹۲۱ء کے اواخر میں ہوئی[۵۸] ہندی میں پریم چند ادبیات کے جدید محقق ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے ۱۹۲۱ء اواخر یا جنوری ۱۹۲۲ء میں اشاعت قرار دی ہے۔[۵۹] اردو میں ناولوں کے جدید محقق ڈاکٹر یوسف سرمست نے اپنی معلومات کی بنیادوں کا انکشاف کیے بغیر امرت رائے کے خیالات کا اعادہ کرنے تک اکتفا کرلی ہے۔[۶۰]

متذکرہ بالا مختلف و متضاد حقائق کی روشنی میں فیصلہ کرنا دشوار ہوتا لیکن حسن اتفاق سے 'گوشۂ عافیت' کا اصل مسودہ دست برد ایام سے محفوظ رہ گیا جس پر ۲ مئی ۱۹۱۸ء کو 'گوشۂ عافیت' کی تصنیف کی ابتدا کرنے اور ۲۵ فروری ۱۹۲۰ء کو تمام کرنے کی اطلاع خود پریم چند کے قلم سے درج ہے۔ پریم چند کے مختلف خطوط میں بھی اس کے اشارے ملتے ہیں۔

---

۵۱ رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص۸۲

۵۲ اندر ناتھ مدان: پریم چند ایک وویچن ص۶۳

۵۳ شیو نرائن سریواستوا: ہندی اوپنیاس ص۴۷

۵۴ ہنس راج رہبر: پریم چند جیون کلا اور کرتتو ص۱۰۸

۵۵ پرتاپ نرائن ٹنڈن: ہندی اوپنیاس کا ادبھو اور وکاس ص۱۷۱

۵۶ نند دولارے باجپئی: پریم چند ساہتک وویچن ص۳۷

۵۷ فراق گورکھپوری: پریم چند ایک انسان اور مصنف کی حیثیت سے، 'زمانہ' پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۵۸ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص۲۵۴

۵۹ کمل کشور گوئنکا: پریم چند کے اوپنیاسوں کا شلپ ودھان ص۶۴

۶۰ یوسف سرمست: بیسویں صدی میں اردو ناول ص۱۷۵

۲۹ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "ناول شروع کر رکھا ہے۔ جو شاید مہینے میں چار پانچ صفحات سے زیادہ نہیں چلتا"[۵۱] امر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں اس ناول کی تخلیقی رفتار سست و کمزور تھی لیکن ۲۵ فروری ۱۹۱۹ء کے خط سے واضح ہوتا ہے کہ بعد میں پریم چند اس ناول کی تصنیف میں انتہائی مصروف ہو گئے تھے منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "نئے ناول کی تصنیف میں بے حد مصروف ہوں۔"[۵۲] اسی طرح کی ایک اطلاع ۵ ستمبر ۱۹۱۹ء کے مکتوب میں بھی ہے۔ "نیا ناول خوب طویل ہو رہا ہے۔ اس کا نام ابھی 'نیک نام'، رکھا ہے غالباً دسمبر تک ختم ہو جائے گا۔"[۵۳] ۱۸ فروری ۱۹۲۰ء کو لکھتے ہیں: "میرا دوسرا ناول 'ناکام'، عن قریب اختتام ہے۔ وہ پورا ہو جاوے تو نوبت رائے کی طرف متوجہ ہوں اور قصے بھی لکھوں۔ ہندی کا آج کل بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ ناول بھی ہندی میں چھپے گا۔ اردو میں اس کا کیا حشر ہو گا معلوم نہیں۔"[۵۴] پھر ۱۱ مارچ ۱۹۲۰ء کو لکھتے ہیں: "ابھی تک 'ناکام' میں مصروف تھا"[۵۵] اسی طرح ۸ اگست ۱۹۲۰ء کو امتیاز علی تاج کو لکھتے ہیں: "کئی کام چھیڑ رکھے تھے۔ سب ہی ادھورے پڑے ہوئے ہیں۔ 'ناکام'، نامکمل ہے اس کا ہندی ترجمہ نامکمل ہے۔"[۵۶] پھر ۱۶ فروری ۱۹۲۲ء کو امتیاز علی تاج کو اطلاع دی: "میرا ہندی ناول ختم ہو گیا۔ اب اردو کام جلد ہو گا۔"[۵۷]

متذکرہ بالا خطوط کی روشنی میں ناول کے شروع کرنے اور تمام کرنے کی تاریخیں جو اردو مسودہ پر درج ہیں، صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ ان خطوط میں ناول کے دو ناموں 'نیک نام' اور 'ناکام' کا ذکر ہے۔ شاید پریم چند نے پہلے اس کا نام "نیک نام، رکھنے کا ارادہ کیا ہو جسے بعد میں 'ناکام'، کر دیا ہو لیکن اشاعت کے وقت دونوں نام مسترد ہو گئے۔ اردو میں اس ناول کی اشاعت

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۷۶

۵۲ ایضاً ص ۸۹

۵۳ ایضاً ص ۸۷

۵۴ ایضاً ص ۹۷

۵۵ ایضاً ص ۹۸

۵۶ ایضاً ج۔۲ ص ۱۱۷

۵۷ ایضاً ص ۱۳۵

ہندی اشاعت کے چھ برسوں کے بعد ہوسکی۔ ہندی اشاعت کے بارے میں منشی دیا نرائن نگم کو ۲۳ مئی ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں: "میرا نیا ناول بھی شائع ہوگیا۔ بڑے اچھے ریویو ہورہے ہیں۔" [۵۱] اس سے توثیق ہوتی ہے کہ ۱۹۲۲ء تک 'پریم آشرم' کی اشاعت ہو چکی تھی جس کی تائید رام داس گوڑ کی تحریر کردہ 'انوبچن' سے ہوتی ہے جو 'پریم آشرم' کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر گوپال رائے نے اسی تاریخ کی توثیق کی ہے [۵۲] ہندی میں پریم آشرم کی اشاعت پریم چند کے لیے ہمت افزا ثابت ہوئی۔ انھوں نے ۱۴ر جولائی ۱۹۲۲ء میں منشی دیا نرائن نگم کو اطلاع دی: "نیا ناول ایک ہزار نکل گیا۔" [۵۳]

ہندی میں پہلے ایڈیشن کی اشاعت ہندی پستک ایجنسی کلکتہ سے ۱۹۲۲ء میں ہوئی جس سے پریم چند کو تین ہزار روپے معاوضے میں ملے لیکن اردو میں اشاعت کا مسئلہ ناگفتہ بہ رہا۔ پریم چند کو سلیقے کا ناشر دستیاب نہ ہوسکا جو اردو کے اس ناول کو شائع کرتا۔ ۲۲ر اپریل ۱۹۲۳ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "میری کئی کتابیں نکلنے کو تیار ہوگئیں۔ پریم پچیسی ختم ہوگئی، 'گوشۂ عافیت' محض اس لیے ناتمام ہے کہ کوئی پبلشر نہیں" [۵۴] آخر کسی نہ کسی طرح انتہائی دشواریوں کے بعد گوشۂ عافیت کا پہلا اردو ایڈیشن لاہور کے دارالاشاعت پنجاب سے ۱۹۲۸ء میں ہوا یعنی ہندی ایڈیشن کے ۶ (چھ) برس بعد۔ جب ہندی میں پریم آشرم انتہائی شہرت و مقبولیت حاصل کرچکا تھا۔ اس وقت ہندی کے پریمیوں کو کیسے معلوم ہوتا کہ جس ناول پر انھیں فخر و مباہات ہے، وہ ایک اردو ناول کا ترجمہ ہے!

پریم آشرم کا گوشۂ عافیت، سے تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ہندی میں ترجمے کی بوُ شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"مجھے اس دردِ سر کی فرصت نہیں۔" [۵۵]

---

[۵۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۲۱

[۵۲] گوپال رائے: ساپتاہک ہندوستان، ۱۷ر فروری ۱۹۶۳ء ص ۱۳

[۵۳] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۲۶

[۵۴] ایضاً ص ۱۳۱

[۵۵] ایضاً پریم آشرم ص ۶۳

"اب تو ہمارا گذر ہو چکا۔" [۱]

"ان کی آنکھیں امریکا کی گگن سپرشی اٹالیکاؤں کے دیکھنے کی عادی ہوگئیں تھیں"۔ [۲]

"لوگوں کی آنکھوں سے گورو کی کرنیں نکل رہی تھیں" [۳]

"گھر میں بیٹھنا شانت دُرودھ تھا۔" [۴]

"دونوں نے کئی دنوں تک منتر کو کنٹھ کیا اُس کے سکھا گر ہو جانے پہ صلاح ہونے لگی۔" [۵]

"میری آتما ونیوکت کی بھنڈار ہو گئی۔" [۶]

'پریم آشرم' میں عربی و فارسی نژاد الفاظ فراوانی سے استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً معاذاللہ، مجروح، اتحادی، الوہیت، مساوات، مردم شناس، مظلومہ، لسّان، تشبیہہ، لقب، برعکس وغیرہ

پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح زیر نظر ناول کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا ہندی مسودہ کس نے تیار کیا پریم چند نے یا کسی مترجم نے۔ اس کی صحیح اطلاع فراہم نہیں ہوتی۔ حالانکہ پریم چند نے ۱۷ر جولائی ۱۹۲۶ء کو منشی دیا نرائن نگم کے نام مکتوب میں 'پریم آشرم' کے ہندی میں لکھنے اور اردو میں ترجمہ کا ذکر کیا ہے لیکن جیسا کہ گذشتہ صفحوں میں واضح کیا جا چکا' ان کی اطلاع صحیح نہیں ہے۔

'پریم آشرم' کی ہندی اشاعت ابتدا سے اختلافات کا نشانہ رہی ہے۔ پنڈت اودھ نرائن اپادھیائے نے اسے "رزرکشن" (Resurrection) کا ہندی ترجمہ قرار دیا ہے اپادھیائے جی ریاضی کے استاد تھے انھوں نے 'علم الحساب' کے میار پر تبصرہ و تنقید کر کے اپنا فیصلہ صادر کردیا، جو انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ قارئین کرام کے ضیافت طبع کے لیے درج ذیل کیا جاتا ہے:

---

[۱] پریم چند: پریم آشرم ص۹
[۲] ایضاً ص۱۱۱
[۳] ایضاً ص۲۵۹
[۴] ایضاً ص۱۱۷
[۵] ایضاً ص۳۷
[۶] ایضاً ص۳۴۹

"نہلوڈف = (گیان شنکر + پریم شنکر + مایا شنکر) × ۱/۳

پرنتو ادھکتر = نہلوڈف کا کچھ حصہ = گیان شنکر

گیان شنکر = (نہلوڈف + کی زو ویٹر + شون ٹیک

نوووورووف + سمسن) × ۱/۲

پریم شنکر = (نہلوڈف + کرٹاف + نو اتھف) × ۱/۲

مایا شنکر = (نہلوڈف + ایک ودیارتھی) × ۱/۳ "۱

اس طرح کی تنقیص و تضحیک سے پریم چند کو نقصان کے بجائے فائدہ ہوا۔ 'پریم آشرم' کے لیے قارئین کا اشتیاق بڑھ گیا۔ نتیجہ میں ہندی ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ منشی دیا نرائن نگم کو اطلاع دیتے ہیں: "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایک ناول اور اچھا لکھ کر میں خانہ نشین ہوسکتا ہوں حسب ضرورت گھر بیٹھے مل جائے گا۔"۲ اور چند دنوں کے بعد دوبارہ اپنے جگری دوست منشی دیا نرائن نگم کو خوش خبری دی: "آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ 'پریم آشرم' کی بارہ سو جلدیں نکل گئیں، اب دوسرے ایڈیشن کی تیاری ہے۔"۳

'گوشۂ عافیت' کا اردو دنیا نے کس طرح استقبال کیا اور اس کا پہلا ایڈیشن کتنے دنوں میں ختم ہوا، اس کے بارے میں صحیح طور پر معلوم نہیں ہوتا۔ شاید صورت حال زیادہ امید افزا نہ رہی ہوگی۔ کیوں کہ اگر اردو ایڈیشن حوصلہ افزا ہوتا تو پریم چند اتنی بڑی خوش خبری کسی اور کو نہ سہی تو منشی دیا نرائن نگم کو ضرور دیتے۔!

'گوشۂ عافیت' اور 'پریم آشرم' کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے امرت رائے لکھتے ہیں: "پہلے اردو مسودہ سے انواد کرتے سمے اور سب کچھ تو جیوں کا تیوں رہنے دیا۔ لیکن جب انیہ کے ٹکڑے پر آئے تو وہ بات غلط معلوم ہوئی کیوں کہ انگریزوں نے بہتوں کی زمینداریاں چھین لی تھیں اور پھر اپنے نئے زمیندار پیدا کیے تھے ـــــ اپنے پٹھووں میں سے جنھوں نے غدر میں اور اس کے پہلے بھی اُن کی مدد کی۔"۴ صحیح صورت اس کے برعکس ہے اس ناول میں ترمیم و اضافہ اول تا آخر نظر آتا ہے

۱۔ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۲۲-۲۲۳

۲۔ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۲۶

۳۔ ایضاً ص ۱۲۷

بلکہ اس کے درمیانی حصے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ یہاں دونوں ایڈیشنوں سے متعلق بعض حقائق کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ متعدد موقعوں پر مترجم نے اصل عبارت کا مفہوم لے کر اپنے طور پر اسے دوبارہ لکھ دیا ہے جس سے اردو اور ہندی ایڈیشنوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں:

۲۔ مترجم نے متعدد موقعوں پر غیر ضروری اختصار کیا ہے جس سے ناول کا تخلیقی حسن مجروح ہوا ہے۔

۳۔ بسا اوقات ترجمے میں اصل تخلیق کا تاثر برقرار رہتا ہے لیکن اُس کے پیش کرنے میں مترجم کی انفرادیت نمایاں ہو گئی ہے، اس سے ترجمہ اور اصل دونوں الگ الگ نظر آتے ہیں۔

۴۔ ایک مقام پر مترجم نے پریم چند کا زاویۂ نظر مجروح کر دیا ہے۔ اردو میں ذات برادری کی پابندیوں پر مجموعی اعتبار سے تبصرہ کیا گیا ہے، اس کے برعکس ہندی میں انھیں ہندو دھرم کا نہ صرف معتقد و پیرو بلکہ مبلغ و مفسر بنا دیا ہے۔

۵۔ بعض مقامات پر ترجمہ اصل سے زیادہ پر تاثیر ہو گیا ہے۔ ایک جگہ اردو میں مختصر خط ہے جس کا ہندی میں نہ صرف پر تاثیر ترجمہ کیا گیا ہے بلکہ اس میں ترمیم و اضافہ کر کے دو آتشہ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض مقامات پر اردو میں اختصار ہے جسے ہندی میں وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اردو میں ایک جگہ 'مینے' کو پنجڑے سے اتارنے کا ذکر ہے۔ ہندی میں 'مینا' کو 'چڑیا' کر دیا گیا ہے حالانکہ اس سے ناول کے تاثر میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی۔

۶۔ بعض تبدیلیاں ناول کے تاثر کو مجروح کرتی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر سادہ انداز میں قادر کے نثر پسند مزاج کا بیان ہے لیکن ہندی ترجمہ میں اختصار کی بنا پر اس کا تاثر کم ہو گیا ہے۔

متذکرہ بالا حقائق کی تائید میں متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو پورے ناول میں اتنی وافر تعداد میں ہیں کہ آسانی سے تلاش کی جا سکتی ہیں اسی لیے انھیں طوالت کے خیال سے ترک کر دیا گیا ہے ان کی روشنی میں آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مترجم نے پریم چند کے خیالات کی ترجمانی سے زیادہ اسے اپنی انفرادیت کے ساتھ ہندی تخلیق بنانے کی کوشش کی ہے۔ اردو میں 'گوشۂ عافیت' دو حصوں میں شائع ہوا ہے لیکن ہندی میں 'پریم آشرم' ایک ہی جلد میں ہے۔

ہندی اور اردو اشاعتوں میں بعض اختلافات طباعت سے متعلق ہیں ہندی میں ۶۵

(پینسٹھ) ابواب ہیں لیکن اردو میں ۶۴ (چونسٹھ)۔ ہندی میں کسی نئے باب کا اضافہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اردو کے سولھویں باب کو دو ابواب میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ ہندی میں پچاسویں اور باونویں باب میں فرق نہیں ہے۔ اُن کے بعد بقیہ ابواب کو جیوں کا تیوں رہنے دیا گیا ہے۔ ساٹھویں باب پر تیسواں طبع ہے جو شاید طباعت کی غلطی ہے۔ ہندی ایڈیشن میں طباعت کی غلطیاں بہت ہیں۔

اردو سے ہندی میں ترجمہ کرنے میں اردو الفاظ کے متبادل تلاش کرنے میں لاپرواہی برتی گئی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

معززین: نیتاگن، شکر رنجیوں: کٹوواکیوں، کم ظرفان کدورت: دھبھہ اور دوش تیرہ و تاریک: جرتر، سعی باطل: کھید، توکل: مانسک دھیریہ، استقلال: سمجھوتا وغیرہ وغیرہ اسی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے۔ متعدد موقعوں پر عام استعمال کے الفاظ کو 'شدھ' بنانے کی کوشش میں زبان غلط اور مضحکہ خیز ہوگئی ہے۔ مثلاً

جرح: ادشواس سوچک پرشن چٹکلوں: لسنخوں سرخ: رکت ورن
قطار: شرینی زندہ دلی: بھگتیا ناگوار: آشردھا افسر: اوپر والے
ماتحت: نیچے والے پونجی پسار: پونجی حاکم پرگنہ: پرگنہ کے حاکم وغیرہ وغیرہ

ہندی 'پریم آشرم'، اردو 'گوشہ عافیت' کا ترجمہ ہے بعض مقامات پر اختلاف ہے جو مترجم کی جودت طبع کا عطیہ ہے۔ ہمارے خیال میں 'پریم آشرم' کو ہندی کا تخلیقی ناول نہیں قرار دیا جاسکتا۔

چوگان ہستی: رنگ بھومی

"پھائدہ، نکسان، جینا مرنا، نیک نامی، بدنامی سب تکدیر کے ہاتھ ہے۔ ہم تو کھالی میدان میں کھیلنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ سبھی چاہتے ہیں کہ ہماری جیت ہو۔ پر جیت تو ایک ہی کی ہوتی ہے۔ تو کیا اس سے ہارنے والے ہمت ہار جاتے ہیں؟ وہ پھر کھیلتے ہیں۔ پھر ہار جاتے ہیں تو پھر کھیلتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی تو ان کی جیت ہوتی ہی ہے آج جو آپ کو بُرا سمجھ رہے ہیں، وہی کل آپ کے سامنے سر جھکا ئیں گے ہاں، نیت ٹھیک رہنی چاہیے ....." [1]

[1] پریم چند: چوگان ہستی ج ۲ صفحہ ۳۷۰

لیکن تمام حالات کی بنیاد بشر کی نیت ہی ہوتی ہے، جو باہمی مناقشات و اختلافات کی بنیاد ہوتی ہے۔ وہ اپنے مفروضہ عقاید و رجحان کے اعتبار سے قول و عمل کے درمیان تضاد پیدا کر لیتا ہے۔ وقتی مفاد کے پیش نظر دیرپا امن و سلامتی کو غارت کرنے لگتا ہے نتیجہ میں عقل و شعور پر جذبات غالب آجاتے ہیں۔ پریم چند کرب و اضطراب کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ طاہر علی اور بجرنگی، بلا وجہ آپس میں ٹکرا گئے ہیں اور مسٹر جان سیوک کی مراد بر آئی ہے۔ وہ جلتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کر رہے ہیں۔ ونے سنگھ تذبذب و اضطراب میں گرفتار ہے، دونوں فریق کو سمجھاتا ہے لیکن کوئی اس کی بات کو سننے کے لیے تیار نہیں سورداس کی ظاہری آنکھیں بے نور ہیں لیکن اس کی چشم باطن روشن و منور ہے۔ وہ تشدد، فساد اور قتل و غارت کی ہنگامہ خیزیوں کو انسانیت کی تباہی و بربادی قرار دیتا ہے مگر غریب کیا کر سکتا ہے! حالات کی ستم ظریفیوں پر دانت پیس پیس کر رہ جاتا ہے یہ دنیا ہی چوگان ہستی ہے۔ اس کھیلنے کے میدان میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ پریم چند اپنے گاؤں لمہی میں بیٹھے ہوئے ملک گیر پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کے شعلوں کی حدت محسوس کر رہے ہیں۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ نہ کوئی کسی کا بھائی ہے، نہ کوئی کسی کا ہم سایہ ہے، بس ایک دوسرے کو کاٹ کھانا چاہتے ہیں۔ پریم چند کی ہندویت عجیب و غریب انداز میں سامنے آئی ہے ہندوؤں پر ہی برس رہے ہیں، دانت پیس رہے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں نے کبھی خلافت کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اس کو شبہہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔۔۔۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہندوؤں میں ایک بھی کچلو، محمد علی یا شوکت علی ہوتا تو ہندو سنگٹھن اور شدھی کی اتنی گرم بازاری نہ ہوتی "[۱]

اس قدر مشتعل لب و لہجے کا مضمون منشی دیا نرائن نگم کس طرح شائع کریں۔ ایک طرف دوست ہے، دوسری طرف پورا سماج ہے مزید برآں نگم صاحب خود بھی آریہ سماجی تھے۔ کسی زمانے میں پریم چند بھی آریہ سماجی تھے لیکن اب وہ اس کے اثرات سے باہر ہیں۔ ۲۲ر اپریل ۱۹۲۳ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "ملکانہ شدھی پر ایک مختصر مضمون لکھ رہا ہوں مجھے اس تحریک سے سخت اختلاف ہے۔۔۔۔۔ آریہ سماج والے بھنائیں گے۔ لیکن مجھے امید ہے آپ زمانہ میں

---

[۱] پریم چند: قحط الرجال، زمانہ فروری ۱۹۲۴ء

اس مضمون کو جگہ دیں گے''۔[۱] لیکن پریم چند کے اصرار کے باوجود مضمون کے شائع ہونے کی نوبت نو مہینے تک نہ آسکی آخر کار انھوں نے جھنجلا کر پیکان طنز نگم صاحب پر خالی کر دئے۔ ۹ر جنوری ۱۹۲۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں: ''آپ نے میرے مضمون کو مسترد کر دیا، خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے لکھ ڈالا، دل کی آرزو نکل گئی''۔[۲] نتیجہ میں منشی دیا نرائن نگم مجبور ہو گئے اور انھیں پریم چند کا مضمون شائع کرنا پڑا اس مضمون کا چھپنا تھا کہ چاروں طرف شور و واویلا کی صدائیں بلند ہو گئیں۔ مسلمانوں میں مسرت و اطمینان سے استقبال ہوا لیکن ہندو سماج تڑپ تڑپ کر رہ گیا۔ پریم چند نے اسی جوش و خروش میں واقعہ کربلا کو بنیاد بنا کر ایک ڈراما 'کربلا' اردو میں لکھا۔ انھیں یقین تھا کہ اس سے انھیں اسلامی برادری میں مزید شہرت و مقبولیت حاصل ہو گی لیکن اس بار ردعمل ناخوش گوار طور پر معکوس ہوا۔ ''ہم تو کھالی میدان میں کھیلنے کے لیے بنائے گئے ہیں!'' ہندو سماج خاموش تماشائی رہا لیکن مسلمانوں کی جانب سے زبردست احتجاج ہوا۔ انکا شدید ردعمل پریم چند نے قبول کیا، جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند نے ('زمانہ' کے مضمون میں) اپنی مثالیت پسندانہ و وسیع النظری میں مسلمانوں کو دودھ کا دھلا ثابت کرنے کی دھن میں ہندوؤں کو مورد الزام قرار دیا تھا۔ حالانکہ فرقہ دارانہ فسادات کرنے میں مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہے ہیں! اگر آریہ سماج نے قومی تحریک کو رضا کار عطا کرنا بند کر کے ہندویت کے پرچار کے فرائض کی انجام دہی شروع کر دی تھی تو مسلم فرقہ پرستی بھی اسی انداز میں تبلیغ کا مورچہ سنبھال رہی تھی۔ فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے میں دونوں طرف کا پلہ برابر تھا۔

متذکرہ بالا پس منظر میں 'چوگان ہستی' کے تخلیقی عمل کے تفہیم و تجزیہ میں صحیح نتائج تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اس دور میں ملکی تحریک آزادی کی رفتار سست پڑنے لگی تھی۔ سیاسی رہنما تحریک آزادی کے مجاہد بننے کے بجائے کونسل کی ممبری کی طرف حریصانہ انداز میں لپک رہے تھے۔ اسی درمیان جواہر لعل نہرو آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوتے ہیں۔ پریم چند کو ولایتی انداز کے تعلیم یافتہ اس نوجوان نے بطور خاص متوجہ کیا تھا کیوں کہ اس نے اپنی خدمات کا دائرہ عمل گاؤں میں گھوم کر کسانوں

---

[۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۳۵

[۲] ایضاً ص ۱۴۰

میں بیداری پیدا کرنا قرار دیا تھا جو پریم چند کی آتما کی پکار تھی 'چوگان ہستی' کا فنی جواہر لعل کی علامت ہے۔

پریم چند ہندی میں 'پریم آشرم' کی مقبولیت سے متاثر تھے منشی دیا نرائن نگم کو یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء کو 'پریم آشرم' کے ہاتھوں ہاتھ نکل جانے کی خوشخبری دینے کے بعد اسی دن سے 'چوگان ہستی' کی تصنیف شروع کردی لیکن پریم چند ادبیات کے ماہرین نے حسب دستور 'چوگان ہستی' اور 'رنگ بھومی' کی تصنیف و اشاعت کے زمانوں کے تعین میں مختلف اور متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ آچاریہ نند دلارے باجپئی[۵۱] کے قول کے مطابق 'رنگ بھومی' کی اشاعت ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان ہوئی لیکن ڈاکٹر شیو نرائن سریواستو[۵۲] نے ۱۹۲۴ء کو فوقیت دی ہے اور رام رتن بھٹناگر[۵۳] نے ۱۹۲۵ء کو ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن[۵۴] کے خیال میں 'رنگ بھومی' کی اشاعت ۱۹۲۲ء میں ہوگئی تھی مگر ہنس راج رہبر[۵۵] اس کی اشاعت ۱۹۲۷ اور ۱۹۲۸ء کے درمیان قرار دیتے ہیں۔ ان بیانات کے تجزیے کے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کے مشہور مصنف اور صحافی بنارسی داس چترویدی کے بیان پر نظر ڈال لی جائے۔ انھوں نے ۱۹۲۴ء میں پہلی بار پریم چند سے ملاقات کی تھی، موصوف لکھتے ہیں: "مجھے سب سے پہلے ۱۹۲۴ء میں پریم چند سے لکھنؤ میں ملنے کا اتفاق ہوا جب میں لیبر فیڈریشن میں شریک ہونے وہاں گیا تھا۔ اس وقت وہ 'رنگ بھومی' نامی ناول لکھ رہے تھے مگر انھوں نے مجھے کافی وقت دیا اور ہم لوگ بہت دیر تک مختلف ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔"[۵۶] اس کی توثیق شیورانی دیوی کے قول سے ہوتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں: "۱۹۲۴ء کا زمانہ تھا آپ لکھنؤ میں تھے۔ 'چوگان ہستی' چھپ رہا تھا۔[۵۷] پریم چند

---

۵۱ نند دلارے باجپئی : پریم چند ساہتک دوچن ص ۶۱

۵۲ شیو نرائن سریواستو : ہندی اوپنیاس ص ۹۲

۵۳ رام رتن بھٹناگر : پریم چند ص ۹۶

۵۴ پرتاپ نرائن ٹنڈن : ہندی اوپنیاس کا اُدبھو اور وکاس ص ۱۷۹

۵۵ ہنس راج رہبر: پریم چند جیون کلا اور کرتتو ص ۱۸۹

۵۶ بنارسی داس چترویدی : پریم چند کی یاد : زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۵۷ شیورانی دیوی : پریم چند گھر میں ص ۹۳

نے ۲ جنوری ۱۹۲۵ء کو شیو پوجن سہائے کو اس کی اشاعت کے بارے میں لکھا تھا: "رنگ بھومی کے چالیس فارم چھپ چکے ہیں" ؎۱ انھیں کو ۲۲ فروری ۱۹۲۵ء کو دوبارہ لکھتے ہیں: "لیجیے جس پستک پر آپ نے کئی مہینے دماغ ریزی کی تھی وہ آپ کا احسان ادا کرتی ہوئی آپ کی خدمت میں جاتی ہے اور آپ سے بنتی کرتی ہے کہ مجھے دو چار گھنٹوں کے لیے ایکانت کا سمے دیجیے اور تب آپ میری نسبت جو رائے قائم کریں وہ اپنی منوہر بھاشا میں کہہ دیجیے.... میں 'رنگ بھومی' پر آپ کی آلوچنا کا بڑی بے صبری سے انتظار کروں گا۔" ؎۲ اس خط کی عبارت میں ہندی اور اردو الفاظ کا ایک ساتھ استعمال غمازی کر رہا ہے کہ پریم چند جس آدمی سے مخاطب ہیں وہ دونوں زبان سے واقف ہے اور وہ ایسا شخص ہے جس نے اس کتاب پر کئی مہینوں دماغ ریزی کی ہے۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید شیو پوجن سہائے کے ذریعہ چوگان ہستی کا ہندی ترجمہ 'رنگ بھومی' کی صورت میں منصۂ شہود پر آیا ہو۔

'رنگ بھومی' کا پہلا اشتہار جنوری ۱۹۲۵ء کے ہندی ماہنامہ 'مادھوری' میں پریم چند کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا جس میں آئندہ ماہ میں اس کے شائع ہونے کا اعلان تھا۔ اس کے پہلے ایڈیشن پر تاریخ اشاعت بسنت پنچمی سمبت ۱۹۸۱ وکرمی درج ہے اس مسئلے کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا لکھتے ہیں: "اس پرشن کا سمادھان یہ کہہ کر کیا جا سکتا ہے کہ سمبھو ہے پستک کے چھپتے سمے یہ انوبھو کیا گیا ہو کہ پستک بسنت پنچمی تک ہی پرکاشت ہو سکے گی اس کارن اس پر بسنت پنچمی ۱۹۸۱ چھاپ دیا ہو لیکن پورو انومان کے پوروہی پستک چھپ کر تتھا جلد بن کر تیار ہو گئی ہو دوسرا سمادھان یہ ہو سکتا ہے کہ سمبھوتہ اس ورش بسنت پنچمی جنوری ماس میں ہی پڑی ہو۔" ؎۳ لیکن سوال پیدا ہوتا کہ جب اس ناول کا مخطوطہ دستیاب ہے اور اس پر پریم چند کی تحریر موجود ہے کہ یہ یکم اکتوبر ۱۹۲۲ء سے یکم اپریل ۱۹۲۴ء تک لکھا گیا ہے اور دیگر قرائن بھی تائید کرتے ہیں کہ پریم چند کا قول صحیح ہے تو اس پر بلا وجہ شک شبہ کیوں کیا جائے۔ اسی مخطوطہ پر منشی جی کی اپنی تحریر میں درج ہے : Hindi Finished dated August 12, 1924 امرت رائے لکھتے ہیں: 'رنگ بھومی کی چھپائی شروع ہو گئی ہے، لکھی پہلے اردو میں گئی، چھپی پہلے ہندی میں، ویسے ہی جیسے سیوا سدن اور پریم آشرم

؎۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۲۱

؎۲ ایضاً ج ۲ ص ۱۲۲

؎۳ کمل کشور گوئنکا: پریم چند کے اپنیاسوں کا شلپ ودھان ص ۶۵

کے سنگ ہوا تھا۔" [۱] اس کی توثیق پریم چند کے اپنے بیان سے ہوتی ہے وہ اردو اشاعت کے دوسرے حصے کے دیباچے میں لکھتے ہیں : " اگرچہ رنگ بھومی پہلے اردو میں ہی لکھی گئی تھی مگر اس کا اردو ایڈیشن ہندی ایڈیشن ہو جانے کے تیسرے سال شائع ہو رہا ہے۔ ہندی ایڈیشن تیار کرتے وقت اردو مسودے میں اتنی ترمیم ہو گئی کہ وہ اس حالت میں پریس کے قابل نہ تھا اس کے علاوہ کئی ابواب ہندی میں اور بڑھا دیے گئے، انھیں دوبارہ مسودے میں شامل کرنا ضروری تھا اس لیے سارا مسودہ ہندی مسودے کے مطابق کر کے دوبارہ لکھنا پڑا۔" [۲] یہاں مزید سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اضافے کس نے کیے، خود پریم چند نے یا کسی دیگر شخص نے گذشتہ سطروں میں شیو پوجن سہائے کی اس ناول پر کئی مہینے دماغ ریزی کا ذکر ہو چکا ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ یہ اضافے شیو پوجن سہائے نے کیے ہوں گے جن کو پریم چند نے اپنایا اور اسے اردو میں بھی شامل کیا۔

زیرِ نظر ناول کی طرح پریم چند کے گذشتہ دو ناولوں 'بازارِ حسن' اور 'گوشۂ عافیت' کی اردو میں اشاعت ان کی ہندی میں اشاعت کے کافی عرصے کے بعد ہو سکی۔ اس لیے یہ تصور کرنا غلط ہوگا کہ پریم چند اپنے ناولوں کو اردو میں اس لیے پہلے لکھتے تھے کہ انھیں اس ناول کے اردو میں پہلے شائع ہونے کی توقع تھی۔ انھیں بخوبی احساس تھا کہ دیگر ناولوں کی طرح اردو میں اشاعت کی نوبت بہت بعد میں آئے گی پھر اردو مسودے کا ہندی ترجمہ تیار کرنے میں وقت اور سرمایے کا صرفہ ہوتا تھا۔ اس کے باوجود پریم چند اپنا اصل مسودہ اردو میں تیار کرتے تھے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ 'چوگانِ ہستی' کی اشاعت تک پریم چند ہندی میں تصنیف و تالیف کرنے کی صلاحیت نہیں پیدا کر سکے تھے انھوں نے اردو والوں کی کساد بازاری سرد مہری اور دشواریوں کے باوجود اصل مسودہ اردو میں تیار کرنا مناسب سمجھا۔ انھوں نے اس ناول کے دوبارہ لکھنے کے سلسلے میں منشی اقبال ورما سحر ہتگامی سے مدد لی تھی، جن کا شکریہ اردو اشاعت کے دوسرے حصے کے دیباچے میں موجود ہے۔ اس ناول کے ترجمہ کی اجرت کے بارے میں دونوں کے درمیان خفیف سا اختلاف بھی پیدا ہوا، اس کی بو منشی

---

[۱] امرت رائے : پریم چند قلم کا سپاہی ص ۳۹۴

[۲] پریم چند : چوگانِ ہستی ج ۲ مقدمہ

دیا نرائن نگم کے نام ۱۲؍اگست ۱۹۲۵ء کے مکتوب میں ملتی ہے: "رنگ بھومی کا تصفیہ دوسو پر کر دیا!" [۱]

بہرحال ان متضاد بیانات سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے جو مصنف کی سہل انکاری و لاپروائی کا سبب قرار دیے جا سکتے ہیں۔ پریم چند کے بیان کے مطابق 'رنگ بھومی' کی پہلی اشاعت ۱۹۲۵ میں قرار دی جا سکتی ہے جو گنگا پستک مالا لکھنؤ سے ہوئی۔ جس سے ان دنوں پریم چند وابستہ تھے، ہندی ایڈیشن کی اشاعت سے منشی دیا نرائن نگم کے قول کے مطابق پریم چند کو دو ہزار روپے اجرت حاصل ہوئی تھی۔ [۲]

ہندی میں اشاعت کے دو برسوں کے بعد اردو ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں لاہور کے دارالاشاعت پنجاب سے شائع ہوا۔ اس اشاعت کے قبل اس کا ہندی ترجمہ 'رنگ بھومی' مشہور و معروف ہو چکا تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اسے غیر معمولی ناول کی حیثیت سے اس سال کا سب سے بڑا انعام پانسو روپے کی شکل میں عطا کیا۔

'رنگ بھومی' پر اردو روایات و اسالیب کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جو اس کے سرسری تقابلی مطالعے سے واضح ہو جاتے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) "ایشور سیوک۔ بہ سر و چشم میرا ٹانگہ منگوا دو۔" [۳]

"ایشور سیوک سر اور آنکھوں سے، میرا تانگہ منگوا دو۔" [۴]

(۲) "اس خیال سے انھیں گونہ تشفی ہوئی حسد کی ہمہ گیری ہی مساوات عامہ کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔" [۵]

"اس وچار سے انھیں کچھ تسلی ہوئی ارشیا رکی دیا پکتا ہی سامیہ واد کی سرو پریتا کا کارن ہے۔" [۶]

۱۔ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۵۷

۲۔ دیا نرائن نگم: پریم چند کی بعض تصانیف کا حال / زمانہ۔ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۳۔ پریم چند: چوگان ہستی ص ۶۷

۴۔ ایضاً رنگ بھومی ص ۴۷

۵۔ ایضاً چوگان ہستی ص ۷۶

۶۔ ایضاً رنگ بھومی ص ۵۲

(۳) "مگر یہ طالع کی نحوست مجھے ہمیشہ زک دیتی ہے۔" ۵۱

"کنتو یہ پرکرت ورودھ مجھے ہمیشہ نیچا دکھاتا ہے۔" ۵۲

اسی طرح 'ہمہ تن' کے بجائے 'ینھا سادھیہ' کا دلچسپ ترجمہ بھی نظر آتا ہے۔ ایک جگہ پر فارسی مقولہ 'کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ' کا ترجمہ 'آپ کی کرپا نے مجھے دھرشٹ بنا دیا ہے' کر دیا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مشہور و معروف مثنوی گلزار نسیم کے ایک مصرع ــــ 'کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں' ۵۳ کا غلط طور پر استعمال کیا گیا ہے، جو ہندی ایڈیشن میں موجود ہے۔ نسیم کا شعر یوں ہے:

دونوں کے رہی نہ جان تن میں کاٹو تو نہیں لہو بدن میں

اردو اثرات کی چند مزید مثالیں 'رنگ بھومی' سے ملاحظہ ہوں:

اردو محاورہ ــ "دم کے دم میں سیکڑوں آدمی جمع ہو گئے" ۵۴

"یہ بیل مونڈھے چڑھنے کی نہیں ہے" ۵۵

اردو فعل ــ "سہسا اسے ایک وشال پرا ساد دیکھ (نظر) پڑا" ۵۶

اردو جلسہ ــ "سورداس چل دیا" ۵۷

لیکن عام طور پر مترجم نے زیادہ تبدیلیاں نہیں کی ہیں، اس لیے دونوں اشاعتوں میں یکسانیت نظر آتی ہے پھر بھی کئی جگہوں پر نقطۂ اختلاف موجود ہے:

۱۔ بعض جگہوں پر اردو میں اختصار اور ہندی میں تفصیل یا ہندی میں اختصار اور اردو میں تفصیل ہے۔

---

۵۱ پریم چند: چوگان ہستی ص ۲۷۱

۵۲ ایضاً: رنگ بھومی ص ۱۸۹

۵۳ ایضاً: چوگان ہستی ص ۱۸۱

۵۴ ایضاً: رنگ بھومی ص ۱۲۶

۵۵ ایضاً ص ۱۳۲

۵۶ ایضاً ص ۵۹

۵۷ ایضاً ص ۲۵

۲۔ مترجم نے عام بول چال کے الفاظ کا ترجمہ کردیا ہے مثلاً دھوم دھام، شہر کے لوگ، شامل، پاکیزہ خیالی، قدرتی حسن، دلفریب وغیرہ۔ اس کی ایک زندہ مثال ملاحظہ ہو: "آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہوں، بھوک سے آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہو" ۵۱ اس کا ہندی میں ترجمہ کیا گیا: "آنتیں سکڑی جاتی ہوں آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہو" ۵۲

۳۔ نثری حصے کے ترجمے کے علاوہ شعری اقتباسات بھی ترجمہ کردیے گئے ہیں۔

۴۔ بعض مقامات پر اردو الفاظ کے متبادل ہندی نہ ملنے کی بنا پر مترجم نے ترک کردیے ہیں یا ان کے ترجمے میں آزاد روی اختیار کی ہے۔ اپنی معذوری کی بنا پر مترجم اردو کے مزاج و کردار روایات علامتوں اور الفاظ کو ہندی میں برقرار رکھتا ہے جو ہندی کے مزاج و آہنگ سے مماثلت نہیں رکھتے۔

بحیثیت مجموعی 'رنگ بھومی' کی زبان پریم چند کے گذشتہ ناولوں کی ہندی سے زیادہ باسلیقہ اور بامحاورہ ہے۔ اس میں سنسکرت نژاد الفاظ و تراکیب ہیں لیکن عام طور پر ان کا استعمال فطری ہے لیکن اردو الفاظ کے ہندی مترادفات کی تلاش کرنے میں بسا اوقات مترجم نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں اور اصل عبارت کا مفہوم اور مقصد فوت ہوگیا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نمک حلال: سوامی بھکتی   لکچرار: اپدیشک گن   سیر: ورکتی
استقلال: سیچوتا   اعلانیہ: بھے وش   برا: خراب
قوم: سماج   لگن: انوراگ   جمہوریت: سامیہ واد
حقوق: سوتتو   خیال: غم وغیرہ وغیرہ

'چوگان ہستی' کا ہندی ترجمہ 'رنگ بھومی' امرت رائے کے قول کے مطابق چار مہینے میں تیار ہوا۔ موصوف لکھتے ہیں: "جنوری آتے آتے 'رنگ بھومی' نکل آئی اور نکلتے ہی چاروں طرف اس کا شور مچ گیا، خط آنے لگے لیکھ چھپنے لگے۔ انھیں خطوں میں ایک خط دہرہ دون سے پنڈت امرناتھ جھا کا تھا کہ میں نے اس کا ایک ایک لفظ پڑھا ہے اور آپ کی دلکش رچنا تمک

---

۵۱ پریم چند: چوگان ہستی: ج ۲ ص ۲۵۵

۵۲ ایضاً: رنگ بھومی ص ۴۶۶

پرتبھا کا، اب پہلے سے بھی زیادہ پرشنسک ہوگیا ہوں۔ سورداس کو آپ نے اپنا نائک بنایا ہے، اتینت ساہس کا کام تھا لیکن اس کا چرتر بھی آپ نے کیسا سندر کھینچا ہے...'رنگ بھومی' آدھنک ہندی کا گورو گرنتھ بنے گی۔"[۵۱] لیکن پنڈت اودھ نرائن اپادھیائے 'رنگ بھومی' کو پرتھا' تو انھیں نقل در نقل معلوم ہوا۔ تھیکرے کے 'وینٹی فیئر' (Vanity Fair) کی نقل رویندر ناتھ ٹیگور کا ناول 'آنکھ کی کرکری'، اور 'رنگ بھومی'، 'وینٹی فیئر'، اور 'آنکھ کی کرکری'، دونوں کی نقل! انھوں نے علم الحساب کے اصولوں پر تنقید و تجزیہ کیا:

"ونے ــ آس برن + ڈاون کا بہت کم بھاگ
صوفیا ــ امیلیا + رے بے کا بہت کم انش
اندو ــ رے بے کا بہت کم انش
سورداس ــ جان سیوک = امیلیا کا پتا
مہیندر کمار ــ راڈن + جوزف
گانگولی ــ سرپٹ
رانی جاہنوی ــ آس برن کے پتا کے جاتیہ اُنچ وچاروں کا سروپ"[۵۲]

وقت انصاف پسند ہوتا ہے اور انصاف کتنا ظالم و سفاک ہوتا ہے! اس نے اپادھیا جی کو تضحیک و تمسخر کی علامت بنا دیا ہے۔ آج ان کی تحریریں خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

ہمارے خیال میں 'رنگ بھومی'، کو پریم چند کے اردو ناول 'چوگان ہستی'، کا ہندی ترجمہ قرار دینا چاہیئے۔ اس کو ہندی ادب کی تاریخ میں تخلیقی ناول کا درجہ عطا کرنا غلط ہوگا۔ اردو میں اس ناول کو تخلیقی معیاروں پر انفرادیت حاصل ہے، جس میں تاریخی بصیرت، تمدنی تغیر اور عوامی زندگی کی کشمکش کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس ناول کے تصورات پر گاندھیائی اثرات حاوی نظر آتے ہیں لیکن انھیں عصری تناسبات یا زمان و مکان کی قید و بند میں اسیر کرکے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ 'چوگان ہستی'، کا مطالعہ تاریخ کے سماجی و تہذیبی عوامل کے تجزیے میں معین و مددگار ہوتا ہے۔

---

۵۱ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۳۵۰

۵۲ ایضاً ص ۳۸۲

پردۂ مجاز: کایا کلپ

"آگرے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر دونوں فرقوں کے شوریدہ سر جمع ہو جاتے اور دو چار جانیں تلف ہو جاتیں۔ کہیں کسی بنیے نے ڈنڈی ماری اور مسلمانوں نے اس کی دوکان پر دھاوا کر دیا۔ کہیں کسی جلاہے نے کسی ہندو کا گھڑا چھو لیا اور محلے میں فوجداری ہو گئی۔ ایک محلے میں موہن نے رحیم کا کنکوا لوٹ لیا اور اسی بات پر کئی ہندوؤں کے گھر لٹ گئے۔ دوسرے محلے میں دو کتوں کی لڑائی پر کئی آدمی زخمی ہوئے کیوں کہ ایک موہن کا تھا، دوسرا سعید کا۔ ذاتی عداوتیں فرقہ وارانہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتی تھیں،

...... اتفاق سے ایک میاں صاحب کے کپڑوں پر دو چار چھینٹے پڑ گئے بس آفت ہی تو آ گئی۔ سیدھے جامع مسجد میں پہونچے اور مینارہ پر چڑھ کر بانگ دی۔ اے امت رسول! آج ایک کافر کے ہاتھوں میرے دین کا خون ہوا ہے یا تو کافروں سے اس خون کا انتقام لو یا میں مینارے سے گر کر نبی کی خدمت میں فریاد کرنے جاؤں!" [۵۱]

اور اس فریاد کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ جشودا نندن قتل کر دئے گئے اور خواجہ صاحب تڑپ اٹھے۔ جشودا نندن کی لاش کے قریب بیٹھ کر انھوں نے روتے ہوئے کہا:

"تم سمجھتے ہوگے یہ میرا دشمن تھا۔ خدا جانتا ہے مجھے اپنا بھائی یا بیٹا بھی اس سے زیادہ عزیز نہ تھا۔ اگر مجھ پر کسی قاتل کا ہاتھ اٹھتا تو جشودا اُس وار کو اپنی گردن پر لے لیتا۔" [۵۲]

اور پھر انھوں نے عزم و استقلال کے ساتھ عہد کیا:

"کلام مجید کی قسم، جب تک اہلیا کو ڈھونڈھ نہ نکالوں گا۔ مجھے دانہ پانی

---

۵۱ پریم چند: پردۂ مجاز ج ۲۔ ص ۳۰-۴

۵۲ ایضاً ص ۶

حرام ہے۔ تم لوگ لاش لے جاؤ۔ میں اہلیا کی تلاش میں جاتا ہوں۔
سارے شہر کی خاک چھان ڈالوں گا۔ ایک ایک گھر میں جاکر دیکھوں گا۔ اگر
کسی بے دین نے قتل کر ڈالا ہے تو اسے ضرور کھوج نکالوں گا۔" ۵۱

اس طرح کے واقعات و حادثات کا ردعمل پریم چند پر شدید ہوتا ہے۔ ملک کی سالمیت کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت و یگانگت ناگزیر ہے لیکن کوئی اسے دل کی گہرائیوں سے قبول کرے تو! جشودانندن کی بیوی باگیشوری (جسے پریم چند پہلے ہندو سنگٹھن میں شامل کرنے کی سوچ رہے تھے، بعد میں ارادہ بدل دیا)، پریم چند کے ذاتی خیالات کی ترجمانی کا ذریعہ بنتی ہے۔ وہ کہتی ہے:

"ہمیشہ سمجھاتی رہی کہ ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ نہ مسلمانوں کے لیے دنیا میں
کہیں ٹھور ٹھکانہ ہے نہ ہندوؤں کے لیے۔ دونوں اسی دیس میں رہیں گے
اور اسی دیس میں مریں گے۔ پھر آپس میں کیوں لڑتے مرتے ہو۔ مگر
میری کون سنتا ہے۔" ۵۲

اس میں شبہ نہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات کے جوش میں کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ تمام لوگ ہندو یا مسلمان ہو جاتے ہیں، انسان کوئی نہیں رہتا! یہی جشودانندن اور خواجہ دونوں ایک دوسرے کے لیے سر و تن قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے جگری دوست تھے، دانت کاٹے کی روٹی تھی۔ گنگا اشنان کے میلے میں دونوں نے مل کر اہلیا کو بچایا تھا۔ دونوں کے مشورے سے جشودانندن کے مکان پر اہلیا کی پرورش و پرداخت ہوئی لیکن پھر وہ بھی ہوا جس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

جشودانندن، سوامی شردھانند کی تصویر ہیں۔ ان سے پریم چند کو دلی عقیدت ہے اُن کی ہمت و اولوالعزمی، حب الوطنی اور ایثار و قربانی نے فریفتہ کر رکھا ہے کیونکہ سوامی شردھانند نے رولٹ ایکٹ کے دور میں انگریزوں کی سنگینوں کے سامنے اپنا سینہ کھول دیا تھا۔ ۱۹۲۶ء میں رشید نامی ایک مسلمان نوجوان نے مذہبی عصبیت کے جنون میں انھیں قتل کر دیا تو

---

۵۱ پریم چند: پردۂ مجاز ج ۲ ص ۱۶۰
۵۲ ایضاً ص ۵

ملک گیر پیمانے پر ردِ عمل ہوا۔ پریم چند نے آریہ سماجی جریدے میں سوامی جی کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا: "میرے وچار میں راشٹریہ شکشا کے پُنر اتھان میں انھوں نے جو کام کیا ہے، اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ایسے یُگ میں جب اننیہ بازاری چیزوں کی طرح ودیا بھی بکتی ہے، یہ سوامی جی ہی کا دماغ تھا، جس نے پراچین گروکل پرتھا میں بھارت کے اُدّھار کا تتو سمجھا۔" [۱]

اس طرح خواجہ کے کردار میں اس دور کے مشہور صحافی و رہنما مولانا منظہرالدین موسس 'وحدت' اور 'الامان'، کی تصویر پیش کی گئی ہے، جو سوامی شردھانند کے حریف و مدمقابل کی حیثیت سے معروف تھے۔ پریم چند کی ہمدردیاں سوامی جی کے ساتھ تھیں۔ وہ مولانا کے جوش و خروش کو وقتی اور جذباتی حالات کا تابع قرار دیتے تھے۔ خواجہ کے کردار میں مولانا کے شعور و عمل کا تجزیہ کیا گیا ہے، جو کبھی اپنے دوست کے لیے دل و جان قربان کرنے کو تیار ہے، اور کبھی اس کا شدید ترین مخالف و حریف۔ اس کی زندگی جذبات میں بہتی رہتی ہے، اس لیے جشودا نندن کی موت کے بعد خواجہ مضطرب ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس طرح اس کو زندگی کے مثبت حقایق کی آگہی ہوتی ہے۔

'پردۂ مجاز'، کے پلاٹ کے متعلق مختلف و متضاد و آرا ظاہر کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر اسے 'چوگان ہستی'، سے بہتر اور 'گؤ دان'، کے بعد بلند ترین ناول قرار دیتے ہیں۔ [۲] ڈاکٹر رام بلاس شرما، [۳] ڈاکٹر ستیندر، [۴] ڈاکٹر اندر ناتھ مدان [۵] اور کالی داس کپور [۶] پردۂ مجاز کو پریم چند کے کامیاب ناولوں میں شمار کرنے کی حد تک تو ڈاکٹر بھٹناگر کے ہم خیال ہیں لیکن اسے اتنا بلند مرتبہ عطا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ جنار دن پرساد جھا دوج، [۷] آچاریہ نند دلارے باجپیی [۸] اور ڈاکٹر

---

۱ پریم چند: سَندھی سماچار، شردھانند بلی دان وشیشانک

۲ رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص ۲۵۴

۳ رام بلاس شرما: پریم چند اور ان کا یگ ص ۸۲

۴ ستیندر: پریم چند اور ان کی کہانی کلا ص ۹۳

۵ اندر ناتھ مدان: پریم چند ایک وویچن ص ۵۶

۶ کالی داس کپور: مادھوری فروری ۱۹۲۷ء

۷ جنار دن پرساد جھا دوج: پریم چند کی اپنیاس کلا ص ۱۲

۸ نند دلارے باجپیی: پریم چند ساہتک وویچن ص ۱۹

گنگا پرساد ومل [۵۱] اس کو پریم چند کی روایتوں سے الگ قرار دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر منمتھ ناتھ گپت [۵۲] اس کو ! " اول جلول، نرتھک، منتشر اور بحر" [۵۳] ناول گردانتے ہیں اور ہنسراج رہبر نے "گورکھ دھندا اور شبد آڈمبر" [۵۳] سے لبریز قرار دیا ہے۔ اس طرح کے بیانات کی بنیاد 'پردہ مجاز' کے پلاٹ کی پیچیدگی ہے جس میں موضوعاتی بیان عدم ترسیل کا شکار ہے اور دور از کار حادثات مقصد کو بار بار مجروح کرتے ہیں۔ پریم چند نے اس ناول میں مہیندر کمار اور رانی دیو پریا کے تین بار جنم لینے کا ذکر کیا ہے اور پلاٹ کو چکردھر، منورما اور راجا بشال سنگھ کی کہانیوں سے جوڑ دیا ہے جس سے قصہ اور بھی الجھ گیا ہے اور عام قاری کے علاوہ صاحب نظر ناقد بھی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر رام بلاس شرما نے 'کایا کلپ' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "وشال سنگھ نے تین بیاہ کیے۔ لیکن سنتان کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ چوتھی بار بیاہ کیا تو ایسی لڑکی سے جو بعد میں سوئم ان کی لڑکی ثابت ہوئی۔" [۵۴] وہ اپنے انھیں خیالات کا اعادہ ایک دوسری جگہ پر بھی کرتے ہیں: "جس سے منورما کا بیاہ ہوتا ہے، وہ آگے چل کر اس کا پتا سدھ ہوتا ہے۔" [۵۵]

یہ عرض کرنا جسارت نہ ہوگی کہ پریم چند کا مثالیت پسند مزاج اس طرح کے خاردار طنز کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بشال سنگھ کی گمشدہ بیٹی منورما نہیں اہلیا ہے۔ منورما راجا بشال سنگھ کی نہیں، ہرسیوک کی بیٹی تھی۔ پریم چند کو مسئلہ تناسخ سے دلچسپی تھی، جو یہاں ناول کے فنی ارتقا کا ذریعہ بنتا ہے۔ امرت رائے نے قبول کیا ہے: "ہو سکتا ہے کہ پنر جنم اتیادی میں منشی جی کا وشواس ہو۔ کیونکہ اس کا پرمان ملتا ہے کہ اپنے گورکھپور کے پرواس کے دنوں میں منشی جی فراق کے بڑے بھائی گنپتی سہائے سے لے کر مادام بلوتسکی، الدر لاج اور لیڈ بیٹر وغیرہ کی کتابیں کافی پڑھا کرتے تھے۔" [۵۶]

---

[۵۱] گنگا پرساد ومل: پریم چند ص ۱۳۹

[۵۲] منمتھ ناتھ گپت: پریم چند ویکتی اور ساہتیہ کار ص ۲۶۰

[۵۳] ہنس راج رہبر: پریم چند جیون کلا اور کرتتو ص ۱۸۸

[۵۴] رام بلاس شرما: پریم چند اور ان کا یگ ص ۸۲

[۵۵] ایضاً ص ۸۳

[۵۶] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۳۷۲

'پردہ مجاز' کے کردار ان کے گذشتہ ناولوں سے مختلف نہیں ہیں ان میں متعدد پہلوؤں سے یکسانیت نظر آتی ہے۔ پریم چند کا مثالی کردار چکر دھر ہے جو ونے کی حیثیت سے 'چوگان ہستی' میں پیش ہو چکا ہے۔

پریم چند نے 'کایا کلپ' کے مخطوطے میں ایک جگہ وبھودا، وشال سنگھ، کلیان سنگھ، چکر دھر، ہر سیوک وغیرہ کرداروں کے بارے میں انگریزی میں یادداشت قلم بند کی ہے جن سے ان کے تخلیقی عمل کے بعض گوشوں کی وضاحت ہوتی ہے اور اس ناول کے متعلق ان کے زاویہ نظر کا تجزیہ کرنے میں روشنی ملتی ہے۔

Bibhuda is Yagyanarain Upadhayaya--crafty, parsimonious, selfish, but servicetul, tactful.

Vishal Singh is Bechan Lal—simple, honest, wanting in moral courage.

Kalyan Singh is Chandrika Prasad—sneaking in the presence of superiors, cannot manage household, suspicious.

Chakradhar is D. Prasad—very shy, learned, principled.

The new Rani's father is Nana—perfectly selfish, dishonest, unscrupulous, drunkard, hopes to build his fortune with his daughter.

Chakradhar's father—flatterer, kind, generous, mild, simplehearted.

The Pandit (Vibhuda Prasad) and his wife both turn Hindu Sangathankar.

Bibhuda is a Persian-read man. Knows very little Sanskrit. His dialogue must be of an educated mussalman.

Chakradhar always seeks God in man.

Trials and troubles mould the human character, they make heroes of men. Power and authority is

the curse of humanity. Even the highest fall a victim to power and lose their character. Chakradhar rose morally while struggling for existence. His fall began when he came in power.

Rani is rejuvenated. She forgets her previous birth, who she was, how she got rejuvenated. Raj Kumar begins to decline from the same day. Rani afraid to approach him. Struggle. In the end Rani loses her balance. Passion overcomes her. She approaches Raj Kumar. A love scene. The next day Raj Kumar, seized by a fatal sickness, dies. Rani again sinks into self-gratification. She builds her Rangshala. She again leads a life of flippancy.

Raj Kumar takes his birth in Kuvar Vishal Singh's house from Ahalya. When the boy grows into a lad, he starts a tour through India. He reaches Telari, sees the Rani, memories begin to revive. Rani making approaches.

[وبھودا، یگیہ نارائن اپادھیائے ہیں ـــــ مکار، بخیل، خودغرض لیکن نیازمند، موقع شناس۔

وشال سنگھ، بے چین لال ہیں ـــــ سیدھے سادے، ایماندار لیکن اخلاقی جرأت سے خالی۔

کلیان سنگھ، چندیکا پرساد ہیں ـــــ اپنے سے بڑے افسروں کی چاپلوسی میں لگا ہوا۔ خانگی انتظامی صلاحیتوں میں معذور، مشتبہ مزاج۔

چکردھر، ڈی پرساد ہیں ـــــ نہایت شرمیلے، صاحب علم، با اصول۔

نئی رانی کے باپ نانا ہیں۔ مکمل خودغرض، بے ایمان، بے شرم، شرابی، بیٹی کے ذریعے اپنی قسمت بہتر کرنے کی تمنا کرتا ہے،

چکردھر کا باپ ـــــ چاپلوس، رحم دل، فیاض، نرم دل، سیدھا سادا۔

پنڈت (دبھودا پرساد) اور ان کی اہلیہ دونوں ہندو سنگٹھن کا ربنتے ہیں۔

وبھودا ۔۔ فارسی داں ہے، سنسکرت بہت معمولی جانتا ہے ۔ اس کے مکالمے تعلیم یافتہ مسلمان کی طرح کے ہونے چاہئیں۔

چکردھر۔ ہمیشہ انسان میں خدا کی تلاش کرتا ہے۔

آزمائشیں، دشواریاں۔ انسانی کردار تعمیر کرتی ہیں۔ یہی انسانوں کو ہیرو (مثالی) بناتی ہیں۔

طاقت، اقتدار ۔۔ انسانیت کے لیے عذاب ہیں۔ بلند خیالات کے حامل لوگ بھی اقتدار کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کے کردار غارت ہو جاتے ہیں۔

زندگی کی جدوجہد میں چکردھر کو اخلاقی عروج حاصل ہوا۔ صاحب اقتدار بننے کے بعد سے اس کا زوال شروع ہو گیا۔

رانی کا تجدید شباب ہوا۔ وہ پچھلے جنم کو بھول جاتی ہے، وہ کون تھی۔ کس طرح تجدید شباب ہوا۔ اسی دن سے راج کمار کے انحطاط کا آغاز ہوا ۔۔ رانی اس تک پہنچنے سے خائف ہے ۔۔ جدوجہد آخر میں رانی توازن کھو بیٹھتی ہے۔ اس پر جنسیت غالب آجاتی ہے۔ وہ راج کمار کے پاس جاتی ہے۔ محبت کا منظر۔ دوسرے دن راج کمار ایک خطرناک بیماری میں گرفتار ہوتا ہے، مرجاتا ہے۔ رانی دوبارہ عیش و عشرت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی رنگ شالا تعمیر کرتی ہے سرخوشی کی زندگی گذارتی ہے۔

وشال سنگھ کے گھر میں اہلیا کے بطن سے راج کمار پیدا ہوتا ہے۔ عالم طفلی سے ملک بھر کا دورہ کرتا ہے۔ وہ تلاری جاتا ہے۔ رانی کو دیکھتا ہے۔ رانی کی پرانی یاد داشتیں تازہ ہونے لگتی ہیں۔ رانی اس سے اظہار محبت کرتی ہے]

امرت رائے نے ان کرداروں کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں[1] جو واضح کردیتی ہیں کہ پریم چند کرداروں کا انتخاب اپنے گرد و پیش کے ماحول سے کرتے تھے جس سے ان میں حقیقت آمیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ امرت رائے کی اطلاعیں حسب ذیل ہیں:

---

[1] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۳۷۰

۱۔ وبھودا یگ نرائن اپادھیا۔ غالباً وہی بزرگ ہیں جن سے پریم چند کا تعارف کاشی ودیا پیٹھ میں ہوا تھا۔

۲۔ بشال سنگھ بیچن لال ـــ غالباً نارمل اسکول گورکھپور کے ہیڈ ماسٹر صاحب۔

۳۔ کلیان سنگھ چندریکا پرشاد ـــ اب اس نام کا کوئی کردار باقی نہیں ہے

۴۔ نئی رانی کے باپ ۔ (یعنی منورما کے باپ ہرسیوک) پریم چند کی سوتیلی ماں کے باپ ہیں جو کافی عرصے تک کسی جائداد کے سلسلے میں جوڑ توڑ میں لگے رہے ـــ اور شاید آخیر میں کامیاب بھی ہوئے۔

پریم چند کے نزدیک ناول کا خاکہ پیش کرنے کا مقصد مکمل طور پر آیندہ ناول کا پیش خیمہ تیار کر دینا نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ان یادداشتوں میں جن کرداروں کے نام درج کیے گئے ہیں، ان کا ناول میں ذکر کیا جائے یا یادداشت کی تحریر کے اعتبار سے اوصاف و خصوصیات پیش کیے جائیں پریم چند اپنے ناولوں میں تخلیقی عمل کے اعتبار سے حسب ضرورت ترمیم واضافہ کرتے رہتے تھے۔ جس کی مثالیں متذکرہ بالا یادداشت اور 'پردہ مجاز' کے تقابلی مطالعہ میں تلاش کی جاسکتی ہیں مثلاً" وبھدا یا وبھدا پرساد نام کا کوئی کردار ناول میں نہیں ہے حالانکہ وبھودا اور اس کی بیوی کو سنگٹھن کا رکن بنانے کا ارادہ تھا۔ شاید وبھودا کا نام تبدیل کر کے جسودا نندن کیا گیا ہے۔ نام کی تبدیلی کے ساتھ کردار کے اوصاف بھی بدل گئے۔ پلاٹ اور کرداروں کے بارے میں یادداشتیں محض اشارے ہونے کی حد تک محدود ہیں۔ ناول کا کینوس وسیع تر ہوتا ہے۔ اس کی تفصیلات حسب ضرورت ترتیب پاتی ہیں۔ پریم چند اپنے ناول میں تخلیقی جوہر کو موضوع و مقصد کا تابع رکھتے تھے، جو انھیں مثالیت پسندی کی طرف مائل کر دیتا ہے۔

'کایا کلپ' کے بارے میں بھی پریم چند کو 'رنگ بھومی' اور 'پریم آشرم' کی طرح سرقے کا الزام برداشت کرنا پڑا۔ پنڈت اودھ نرائن اپادھیائے نے اسے بالکن کے 'ایٹرنل سٹی' کی نقل قرار دیا ہے۔[1] امرت رائے لکھتے ہیں: "چاروں طرف سے بوچھاریں پڑ رہی تھیں۔ 'رنگ بھومی' 'وینٹی فیئر' کی نقل ہے، 'پریم آشرم' 'رزرکشن' کی نقل ہے۔ 'کایا کلپ' 'ایٹرنل سٹی' کی نقل ہے۔

---

[1] اودھ نرائن اپادھیایہ: سرسوتی جولائی ۱۹۲۶ء سے دسمبر ۱۹۲۶ء

'وشواس' نام کی کہانی 'ایٹرنل سٹی' کی چھایا ہے، 'ابھوشن' نام کی کہانی ہارڈی کی ایک کہانی کی نقل ہے۔ 'ہنسی' نام کا لیکھ جو 'زمانہ' میں منشی جی کے نام سے چھپا تھا، مرہٹی کے ایک لیکھ کا انواد ہے!'' [۱] اسی درمیان کسی شیلی مکھ نامی شخص نے بھی بڑے شد و مد سے ثابت کیا کہ پریم چند کی کہانی 'وشواس' 'ایٹرنل سٹی' کی نقل ہے۔ پریم چند نے اس کا جواب دیا جو شیلی مکھ کے مضمون کے آخر میں شائع ہوا: ''ایٹرنل سٹی پرسدھ پستک ہے۔ ہندی میں اس کا انواد ہو چکا ہے۔ انواد ہو چکنے کے بعد میں نے کہانی لکھی ہے۔ شری کرشن دت جی پالی وال نے ہی مجھ سے اس پستک کی پرشنسا کی تھی۔ اپنا انواد بھی سنایا تھا۔ انھیں سے پستک مانگ کر میں لایا تھا۔ ایسی دشا میں موٹی بدھی کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ میں وگیہ سنسار کو دھوکا دینا نہیں چاہتا تھا۔ جس حد تک میں میں رنی ہوں، اُس حد تک میں میں رنی ہوں، اُس حد تک میں لکھ چکا۔ کون ایسا آدمی ہوگا، جو ہندی میں چھپی ہوئی کتاب سے ملتی جلتی کہانی لکھے اور یہ سمجھے کہ وہ مولک سمجھی جائے گی۔ پھر بھی میری کہانی میں بہت کچھ انش میرا ہے۔ چاہے وہ ریشم میں ٹاٹ کا جوڑ ہی کیوں نہ ہو۔'' [۲]

'کایا کلپ' کی اشاعت کے متعلق پریم چند ادبیات کے ماہرین متفق الرائے نہیں ہیں۔ آچاریہ نند دلارے باجپئی [۳]، ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر [۴]، ڈاکٹر اندر ناتھ مدان [۵] اور ڈاکٹر قمر رئیس [۶] کے خیال میں اس کی اشاعت ۱۹۲۸ء میں ہوئی لیکن امرت رائے [۷] اور ڈاکٹر شیو نرائن سریواستو [۸] ۱۹۲۶ء قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر شیودان سنگھ چوہان [۹] اور ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن [۱۰]

---

[۱] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۲۸۴

[۲] پریم چند: شدھا آشونی ۵۔۳ تلسی سنبت

[۳] نند دلارے باجپئی: پریم چند ساہتک ووچن ص ۴۹

[۴] رام رتن بھٹناگر: پریم چند ۲۵۴

[۵] اندر ناتھ مدان: پریم چند ایک وویچن ص ۵۶

[۶] قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص ۳۰۸

[۷] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۳۷۹

[۸] شیو نرائن سریواستو: ہندی اپنیاس ص ۹۷

[۹] شیودان سنگھ چوہان: ہندی ساہتیہ کے اسی ورش ص ۱۴۰

[۱۰] پرتاپ نرائن ٹنڈن: ہندی اپنیاس ادبھو اور وکاس ص ۱۰۱

۱۹۲۴ء کے قائل ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی اشاعت ۱۹۲۶ء قرار دینے میں قباحت نہیں ہونا چاہیے کیونکہ منشی دیانرائن نگم کے نام ۱۷ر جولائی ۱۹۲۶ء کے مکتوب سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس وقت تک 'کاکلپ' کی اشاعت ہوچکی تھی۔ پریم چند لکھتے ہیں: "ہندی میں 'سیواسدن' پریم آشرم رنگ بھومی، کایا کلپ، چاروں ناول دو دو سال کے وقفے بعد نکلے۔" ۵۱

'پردہ مجاز' کی تصنیف کے متعلق مخطوطے کے پہلے صفحے پر درج ہے کہ پریم چند نے 'چوگان ہستی' کو یکم اپریل ۱۹۲۴ء کو تمام کرنے کے بعد ۱۰ر اپریل ۱۹۲۴ء کو 'پردہ مجاز' کی تصنیف کا آغاز کیا۔ اس کے ہندی مسودے پر ناول کے تین ناموں کا ذکر ہے — 'اسادھ سادھنا'، 'مایا سوپن' اور 'امرت ناد'، غالباً یہ تینوں نام بعد میں ناپسند ہوگئے اور پریم چند نے اس کا نام 'کایا کلپ' رکھا۔ اس ناول کے زمانہ تصنیف کے بارے میں امرت رائے نے دو مختلف مقامات پر مختلف خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "بہرحال دن اچھے کٹ رہے تھے یعنی قلم خوب تیزی سے چل رہا تھا اتنی تیزی سے کہ ستمبر ۲۴ء سے ۲۵ء کے ایک سال میں منشی جی نے نہ صرف ادھورے 'کایا کلپ' کو ختم کر لیا تھا، بلکہ رام چند ٹنڈن کے کہنے پر، انھیں کی پرتی لے کر اناتول فرانس کی امر کرتی 'تھائیس' کا ہندی روپانتر بھی کر ڈالا اور جیسے یہ بھی کافی نہ ہو، رتن ناتھ سرشار کے 'فسانہ آزاد' کا سنشپت ہندی روپانتر 'آزاد کتھا' بھی کر ڈالا، جو خود ایک ہزار پنوں کا ہے۔ اور چھوٹی کہانیاں جو لکھیں، سو سب گھلوے میں!" ۵۲ پھر دوسری جگہ لکھتے ہیں: "جولائی اگست آتے آتے 'ڈیڑھ ورش سے کچھ کم سمے میں ہی 'کایا کلپ' سماپت ہوگیا۔" ۵۳ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ پریم چند نے ۱۹۲۵ء کے اواخر تک 'کایا کلپ' کی تخلیق کر ڈالی تھی۔ اس ناول کو کسی دوسرے ناشر کو سپرد کرنے کے بجائے اسے پریم چند نے اپنے سرسوتی پریس سے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا، جس پر انھیں ناگری پرچارنی سبھا نے دو سو روپے کا انعام عطا کیا۔

اردو میں 'پردۂ مجاز' دو حصوں میں لاجپت رائے اینڈ سنس، لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے طبع اول پر سن اشاعت درج نہیں ہے۔ پریم چند نے منشی دیانرائن نگم کے نام ۲۵ر فروری

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۶۲

۵۲ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۲۵۲

۵۳ ایضاً ص ۳۶۵

۱۹۳۲ء کے مکتوب میں ناشر کا نام کرشنا پبلشرس بیان کیا ہے، جو کسی غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ یا شاید کرشنا پبلشرس لاجپت رائے اینڈ سنس کا تقسیم کار رہا ہو۔ اس سے اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت تک 'پردۂ مجاز' شائع ہو چکا تھا۔ پریم چند لکھتے ہیں: "پردۂ مجاز ابھی تک کرشنا پبلشرس نے نہیں بھیجا۔ کئی خطوط لکھ چکا، نہ رائلٹی بھیجتا ہے، نہ کتابیں، نہ جواب دیتا ہے۔ معلوم نہیں بیمار ہے کیا؟"[۱] اور پھر ۱ر اپریل ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں منشی دیا نرائن نگم سے 'پردہ مجاز' کا تبصرہ شائع نہ کرنے پر شکایت کرتے ہیں: "ہاں 'پردہ مجاز' کا ریویو ابھی تک نہیں ہوا۔ اس کا انتظار کرتا رہا۔ اب یاد دلاتا ہوں۔ خان صاحب سے ریویو کروائیں۔ یا آپ اور جس سے مناسب سمجھیں۔ میرے کسی ناول کا 'زمانہ' میں ریویو نہیں ہوا۔ حالاں کہ 'پردۂ مجاز' کو لے کر چھ ہو چکے اور ساتواں بھی عنقریب تیار ہے۔ 'نیرنگ خیال' نے 'بازار حسن' کا ریویو کر دیا تھا اور کتابیں پڑی ہوئی ہیں۔ خیر، اور کتابیں تو پرانی ہو گئیں۔ 'پردۂ مجاز' تو نئی چیز ہے اور اس کا ایک ایک لفظ میرا ہے۔"[۲] اس خط میں خان صاحب سے مشہور و معروف اردو شاعر و ادیب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی مراد ہیں۔ پریم چند نے اس وقت تک کے ناولوں کی تعداد ۶ (چھ) بیان کی ہے، جو صحیح نہیں، اس وقت تک ان کے ۹ (نو) ناول شائع ہو چکے تھے۔ تذکرہ بالا مکتوب کے آخری فقرے انتہائی اہم ہیں، جن سے واضح ہو جاتا ہے 'کاکلپ'، کا اردو ترجمہ خود پریم چند نے 'پردۂ مجاز' کے نام سے کیا تھا۔ اسی بنا پر انھوں نے اس کے ایک ایک لفظ کے اپنے ہونے پر زور دیا ہے۔ اس کی تائید مدن گوپال نے بھی کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ: "یہیں لکھنؤ میں پریم چند نے اپنا ناول شروع کیا۔ وہ اولاً ہندی میں لکھا گیا۔ اس کا نام کایا کلپ' تھا۔ چند برسوں کے بعد یہ اردو میں 'پردۂ مجاز' کے نام سے شایع ہوا۔ اس کا ترجمہ پریم چند نے خود ہندی سے اردو میں کیا۔"[۳]

پریم چند 'پردۂ مجاز' کے اردو میں تبصرے کے لیے دل و جان سے متمنی تھے۔ انھوں نے اپنے کئی خطوط میں منشی دیا نرائن نگم سے گذارش کی ہے کہ اس پر تبصرہ کرا دیں۔ ۷ر جون ۱۹۳۲ء کو لکھتے ہیں: "پردۂ مجاز..... کا ریویو نکلوا دیں۔"[۴] پھر ۲۷ر جون ۱۹۳۲ء کو لکھتے ہیں:

---

[۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۹۲

[۲] ایضاً ص ۱۹۳

[۳] مدن گوپال: منشی پریم چند ص ۲۸۱

[۴] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۹۵

"پردۂ مجاز" کا ریویو تو کرا دیجئے"۔ [51] لیکن جب بار بار لکھنے پر بھی تبصرہ شایع نہ ہو سکا تو ۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں دوستانہ شکوہ کیا: "پردہ مجاز کا بھی یہی حال ہوا۔ آپ کا مجھ میں اتنا کم انٹرسٹ کیوں ہو گیا ہے؟ کیا 'پردۂ مجاز' آپ نے پڑھا؟ آپ کے کسی دوست نے پڑھا؟ یا اس قدر لغو ہے کہ آپ نے پڑھنے کی تکلیف گوارہ نہیں کی؟ لٹریری کام میں سوائے احباب کی قدر دانی کے اور کیا رکھا ہے۔ پبلشر بھی کتاب کیوں شایع کرے۔ جب کوئی اس کا پرسان حال نہ ہو اور جب 'زمانہ' جیسا رسالہ اس قدر بے اعتنائی کرے تو دوسروں پر میرا کیا حق ہے اور کیا دعوا ہے؟" [52] پریم چند کی اس بے چینی میں فن کار کے تخلیقی کرب کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے محنت و مشقت اور حوصلے کے ساتھ 'کایا کلپ' کو خود اردو میں منتقل کیا تھا، اس کے پیش نظر ان کی تمنا کہ اس کا اردو حلقوں میں اچھی طرح تعارف ہو جائے، کسی طرح نازیبا یا غیر فطری نہیں قرار دی جا سکتی۔

مد نظر رہے کہ پریم چند نے 'کایا کلپ' اور 'پردہ مجاز' دونوں کے مسودے بذات خود تیار کیے تھے لیکن ان میں متعدد مقامات پر اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ جو ہندی اور اردو ایڈیشنوں کے تقابلی مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) ہندی کا ۶واں باب اردو میں نہیں ہے۔

(۲) ہندی کا ۷واں باب اردو میں ۶واں ہے۔

(۳) اردو کا ۷واں باب ہندی میں نہیں ہے۔

(۴) ہندی کا ۲۰واں باب اردو میں ۲۱واں ہے اور اسی طرح ایک باب کا فرق ۴۵ویں باب تک قائم ہے۔

(۵) اردو کے ۴۷ویں باب میں ہندی کے ۴۶ویں اور ۴۷ویں ابواب شامل ہیں۔ اس کے بعد اردو اور ہندی ابواب کی ترتیب یکساں ہو جاتی ہے۔

(۶) اردو کا ۲۰واں باب ہندی میں نہیں ہے۔

زیر نظر ناول کے تقابلی مطالعے کے لیے مناسب معلوم ہوگا کہ اردو اور ہندی ایڈیشنوں

---

[51] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۹۵

[52] ایضاً ص ۱۹۹

کے بعض اختلافات کی نشان دہی کر دی جائے۔

(۱) 'کایا کلپ'، اور 'پردۂ مجاز' میں اختلاف کا سبب پریم چند کا ترجمانی رویہ ہو سکتا ہے، کیونکہ انھوں نے لفظی متبادل تلاش کرنے کے بجائے تخلیقی معیاروں پر ترجمے کیے ہوں گے۔

۲۔ بعض مقامات پر اردو ایڈیشنوں میں اختصار و تلخیص کی گئی ہے اس کے برعکس ہندی عبارت میں طوالت اور تفصیل نظر آتی ہے۔

۳۔ بسا اوقات ہندی اور اردو عبارتیں متوازی انداز میں ادبی معیار کی حامل ہیں لیکن پھر بھی کہیں کہیں زبان، اسلوب اور تاثر کے لحاظ سے ہندی ایڈیشن اردو ایڈیشن کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

۴۔ ہندی میں ۱۴ ویں اور اردو میں ۲۴ ویں باب میں ایک مقام پر شنکھ دھر کے سادھو ہو جانے اور اپنی کھنجڑی بجا کر گیت گانے کا بیان ہے۔ لیکن اردو کے قارئین کے لیے ہندی نظم کو ناقابل ترسیل اور ناموزوں قرار دے کر اس کی جگہ پر ایک غزل کے چند اشعار پیش کر دئے گئے ہیں اور قصے کی ضرورت کے پیش نظر ان میں محبت و عقیدت، عرفان اور تصوف کے مضامین منتخب کیے گیے ہیں۔ لیکن اس موقع پر اردو اشعار بے محل نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ سادھو، سنتوں اور فقیروں کے لباس، خورد و نوش اور راگ رنگ میں زیادہ اختلاف نہ ہونے کے باوجود جس ماحول میں شنکھ دھر کی زبان سے مترب، عربی و فارسی الفاظ، ناہموار، نامانوس روایتیں بیان کرائی گئی ہیں۔ وہ حقیقت سے بعید ہیں، جن سے تخلیق کی فنی بصیرت مجروح ہوتی ہے۔

عرض کیا جا چکا کہ ہندی اور اردو میں متعدد مقامات پر زبردست اختلافات ہیں۔ تقابلی مطالعے میں تمام جگہوں سے اقتباسات پیش کرنا ممکن نہیں ہے[۱] تفصیل کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ایک باب سے اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں، جو اردو ایڈیشن میں نہیں ہیں:

"دھرم کا وکٹ سنگرام تھا۔ ایک تو سوریہ گرہن، اس پر اناد ھارن پر کرتک چھٹا!"

"ودیگیا نکوں کی بات جانے دیجئے۔"

"پھر بھگتی کیوں نہ جاگ اٹھے۔ سرورتیاں کیوں نہ آنکھیں کھول دیں۔"

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: پریم چند: کایا کلپ صفحہ: ۸۶، ۸۷، ۱۲۵، ۱۷۳، ۱۷۶، ۱۹۲- ۱۹۴-

"سیوا اور دیا کا کتنا انوپم درشیہ تھا۔"

"روتے روتے اس کی آنکھیں لال ہوگئی تھیں۔"

"یشودھا۔ ابھاگے ذرا ذرا سے بچوں کو لاتے ہیں، اتنا بھی نہیں کرتے کہ انھیں اپنا نام اور پتہ تو یاد کرا دیں۔"

محمود۔ کیوں بیٹا! تمھارے بابوجی کا کیا نام ہے؟

لڑکی نے دھیرے سے کہا۔ بابوجی!

محمود۔ تمھارا گھر اس شہر میں ہے یا کہیں اور؟

لڑکی۔ میں تو بابوجی کے ساتھ ریل پر آئی تھی!

محمود۔ تمھارے بابوجی کیا کرتے ہیں؟

لڑکی۔ کچھ نہیں کرتے۔"

"یشودھا۔ اچھا بیٹی، چلو تمھارے بابوجی کو کھوجیں۔"

"الوپی دیوی کے مندر کی طرف"

ہندی کے ابتدائی ایڈیشن، جو پریم چند کی زندگی میں شائع ہوئے، اگر ان کا موجودہ ہندی ایڈیشنوں سے تقابل کیا جائے تو متعدد مقامات پر اصلاح و ترمیم نظر آتی ہے۔ پریم چند کے ہندی ناشرین، ان کے ہندی اسلوب بیان سے مطمئن نہیں ہیں، انھوں نے ہندی زبان و ادب کے کسی واقف کار سے اصل ایڈیشن پر اصلاح و ترمیم کرائی ہے۔ ان کا یہ فعل بلاشبہ ادبی دیانت داری کے خلاف اور پریم چند سے جسارت کا مرتکب ہے۔ اب موجودہ صورت میں پریم چند ادبیات کے قارئین کی صحیح متن تک رسائی دشوار تر ہوگئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) " اچھا چلو، تمھارے بابوجی کو کھوجیں۔"[۱] یہاں لڑکی کے تتلانے کا انداز پیدا کرنے کی کوشش میں 'بابوجی'، کو 'بابودی'، کر دیا گیا ہے۔

(۲) "بال نیتروں کے سمان دہنستے۔"[۲] زبان کو متسم بنانے کی فکر میں 'دہنستے' کو 'ونہست'، کر دیا گیا ہے۔

---

[۱] پریم چند: کایا کلپ ص۹ (دوسرا ایڈیشن)

[۲] ایضاً ص۱۸

(۳) "ہتھیاروں کو دونی طاقت سے چلائے۔" ۵۱ یہاں 'دونی'، کو 'دوگنی'، کردیا گیا ہے۔

'کایاکلپ'، پر اردو کے لسانی مزاج و آہنگ کے اثرات متعدد موقعوں پر واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو میں سوچ کر ہندی میں لکھا گیا ہے۔ مزید برآں ایسی صورت میں کہ 'کایاکلپ'، کا ہندی مخطوطہ دستیاب ہے اور ہندی اردو کے پریم چند ادبیات کے ماہرین متفق الرائے ہیں کہ یہ ناول پہلی بار ہندی میں لکھا گیا، اردو کے اثرات کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ شاید پریم چند نے ناگری میں لکھنے کے باوجود تخلیقی عمل کی بنیادوں پر اردو کو اولیت دی ہو۔ 'پردہ مجاز'، کا اردو مسودہ نایاب ہے۔ اس لیے اب یہ عرض کرنا دشوار ہے کہ اس کی اصل صورت حال کیا تھی۔ اردو کے اثرات کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) "آپ تو دیونی سے زور آزمانے چلے تھے۔" ۵۲ اردو میں 'دیونی'، کو طنزاً بھاری بھرکم عورت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔، ہندی قواعد کے اعتبار سے 'دیونی'، کی ترکیب غلط ہے۔ اس کا استعمال نہیں ہوتا۔

(۲) "آپ میں آمانوشیہ شکتی ہے۔" ۵۳ یہ آمانوش، فوق البشر'، کا ترجمہ ہے، جو ہندی میں مروج نہیں ہے۔

(۳) "اتنا ڈر تو اسے ہوگا کہ میں نے دغا کی تو قلعی کھول دے گا۔" ۵۴ ، فقروں کی یہ ساخت جو اردو میں مروج ہے لیکن ہندی میں غلط سمجھی جاتی ہے۔

(۴) "چکردھر نے گلانی ہو کر کہا۔" ۵۵ — یہاں 'گلانی'، کو 'رنجیدہ'، کا مترادف بنا لیا گیا ہے۔

(۵) "چاہے مچھر بھلے ہی تو چ کھائیں۔" ۵۶ یہاں اردو کے اعتبار سے فعل کا

---

۵۱ پریم چند: کایاکلپ ص۲۰۲

۵۲ ایضاً ص۱۶۰

۵۳ ایضاً ص۹۷

۵۴ ایضاً ص۱۶۷

۵۵ ایضاً ص۱۳۵

استعمال کیا گیا ہے، جو ہندی میں مستعمل نہیں ہے۔

(۶) "انت کو اس انتر دوند میں ان کی آتمانے وجے پائی"۔ لہ یہاں 'انت' کو 'بالآخر' کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح 'کایا کلپ' میں اردو الفاظ کثرت سے نظر آتے ہیں مثلاً ربط وضبط، جیلے حوالے، شدید، اصحاب، احترام، وقار، دینی امور، مزاحمت، باعث، توحید، توشہ خانہ، کینہ، عداوت، تواضع، عزیز، اتحاد، لخت جگر، عصمت، حکمت، لقب وغیرہ وغیرہ

مدنظر رہے کہ اس ناول کے اصل مسودے ہندی اور اردو میں خود پریم چند نے تیار کیے تھے۔ اردو اور ہندی ایڈیشنوں میں اختلاف کی کثرت کی بنا پر اسے دونوں زبانوں میں تخلیقی ناول کا درجہ ملنا چاہیے۔

نرملا

یہ ناول پہلی بار ہندی ماہنامہ 'چاند' میں نومبر ۱۹۲۵ء سے نومبر ۱۹۲۶ء تک بالاقساط شائع ہوا، پھر چاند پریس سے ۱۹۲۷ء میں کتابی صورت میں منصۂ شہود پر آیا اور خواتین کے حلقوں میں انتہائی مقبول ہوا۔ امرت رائے لکھتے ہیں: "اور اس میں شک نہیں کہ عورت کی زندگی کا درد جس طرح اس کتاب میں نچڑ کر آگیا ہے، ویسا منشی جی کی اور کسی کتاب میں ممکن نہ ہوا نہ آگے، نہ پیچھے۔ سماج کے ظالم ڈھکوسلے، لین دین کی نحوستیں، بیوہ کی بے چارگی اور ننپٹ اکیلاپن، ان میل بیاہ کی گتھیاں درگتھیاں۔ سب کچھ جیسے جاگ، بول اٹھا، اس کتاب میں۔" ۲ہ

'نرملا'، کا زمانہ تصنیف پریم چند کے لکھنؤ میں قیام اور بنارس سے واپسی کے درمیان ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یکم ستمبر ۱۹۲۵ء کو بنارس واپس آنے کے قبل 'نرملا' کی تخلیق ہو چکی تھی۔ قیام لکھنؤ کے درمیان پریم چند کی ایک کہانی 'پنڈت موٹے رام شاستری'، معرض نزاع

لہ پریم چند: کایا کلپ صہ ۱۷

۲ہ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی صہ ۳۹

میں آگئی، جس پر انھیں اور 'مادھوری'، کے مدیران کو ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمے کا سامنا کرنا پڑا۔
وہی پنڈت موٹے رام شاستری زیرِ نظر ناول میں بھی موجود ہیں۔ یہ کردار پریم چند ادبیات میں خصوصی
اہمیت کا مالک ہے۔ پنڈت موٹے رام ان کی ادبی نگارشات میں جا بجا جلوہ فگن ہوتے رہے
ہیں۔ سب سے پہلے ان کے درشن 'جلوۂ ایثار' میں ہوئے تھے، اس کے بعد کسی کہانیوں میں
سوانگ بدل بدل کر ایک بنیادی خصوصیت کے ساتھ برآمد ہوتے ہیں جو پنڈت جی کو مکر و فریب
چال بازی و افترا پردازی اور مذہبی استحصال کی علامت بنا دیتی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں 'انسان کا
فرض مقدم'، ۱۹۲۳ء میں 'ستیاگرہ'، ۱۹۲۶ء میں 'دعوت'، ۱۹۲۷ء میں 'مریدی'، اور پھر اس
سلسلے میں 'نرملا'، میں۔ لیکن پریم چند کو لکھنؤ میں ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمہ میں خاصی دشواریوں
سے دوچار ہونا پڑا، جس سے مجبور ہو کر انھیں پنڈت شالگ رام شاستری (پنڈت موٹے رام شاستری)
سے عدالتی صلح کرنا پڑی لیکن اس میں بھی طنز و تعریض سے باز نہ آئے: "ملزمان قطعی یہ نہیں سمجھتے اور
نہ ان کی یہ خواہش ہے کہ وہ (موٹے رام شاستری) جیسے کچھ ہیں۔ اس کے علاوہ اور کسی صورت
میں ان کا خاکہ کھینچا جائے ... ملزمان ان واقعات کو اچھی طرح مشتہر کرنے کو تیار ہیں جس
سے مستغیث کے دماغ میں اگر کسی طرح کا شک ہو تو وہ رفع ہو جائے۔" [۵۱]

'نرملا'، کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں حتمی طور پر بیان کرنا دشوار ہے۔ البتہ اس کی
اشاعت کے سلسلے میں مختلف و متضاد خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، جو زیادہ تر سراسر غلط اطلاعات
پر مبنی ہیں، یا ادھوری حقیقتوں پر۔

ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر[۵۲] اور ڈاکٹر راجیشور گرو[۵۳] نے 'نرملا'، کا سن اشاعت ۱۹۲۳ء قرار
دیا ہے لیکن ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن[۵۴] کے خیال میں اس کی اشاعت ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔ آچاریہ
نند دلارے باجپئی نے متذکرہ بالا محققوں سے اختلاف کیا ہے اور 'نرملا' کی پہلی اشاعت ۱۹۲۲ء

---

[۵۱] نقل درخواست مورخہ ۱۲-۴-۱۹۲۸ء منجانب بابو پریم چند و پنڈت کرشن بہاری
سر مقدمہ نمبر ۱۹۹، شالگ رام بنام کرشن بہاری سرو پریم چند حسب دفعہ ۱۰۹/۵۰۰ تعزیرات ہند منفصلہ
۱۲-۴-۱۹۲۸ء پولیس اسٹیشن حضرت گنج بعدالت سٹی مجسٹریٹ لکھنؤ۔

[۵۲] رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص ۱۴۲

[۵۳] راجیشور گرو: پریم چند ایک ادھین ص ۱۶۶

[۵۴] پرتاپ نرائن ٹنڈن: ہندی اپنیاس کا ادبھو اور وکاس ص ۱۸۱

اور ۱۹۲۳ء کے درمیان قرار دی ہے۔[۱] اسی خیال کا اعادہ ہنس راج رہبر نے بھی کیا ہے۔[۲] لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں کسی کی اطلاع صحیح نہیں ہے۔ ان کے بیانات کی بنیاد پر کسی صحیح نتیجے تک رسائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا بیان ملاحظہ ہو: "نرملا پریم چند نے اولاً اردو میں ہی لکھا تھا، اس کے بعد اسے ہندی میں منتقل کیا۔ ہندی میں اس کا پہلا ایڈیشن چاند پریس، الہ آباد سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ اردو میں یہ ناول ایک مدت کے بعد ۱۹۲۹ء میں گیلانی الکٹرک پریس بک ڈپو لاہور نے شائع کیا۔"[۳] ہندی ایڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس کی اطلاع صحیح نہیں ہے۔ 'نرملا' کتابی صورت میں چاند پریس سے ۱۹۲۳ء نہیں ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ اس طرح اردو ایڈیشن 'مدت کے بعد' نہیں، صرف دو سال کے بعد ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

اردو سے ترجمہ ہونے کی بنا پر متعدد مقامات پر ہندی ایڈیشن میں اردویت کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً

"آج کے مہینوں دن۔"[۴] "سال آدھ سال۔"[۵]

"برآمدے میں سنار کے ہتھوڑے اور کمرے میں درزی کی سوئیاں چل رہی ہیں۔"[۶]

ہندی میں زبان کی غلطیوں کو ڈاکٹر کمل کشور گوئینکا نے بھی اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے۔[۷] 'نرملا' کی زبان کی غلطیوں کی تصحیح پریم چند کی وفات کے بعد ناشرین بھی کراتے رہے ہیں، مثالیں ملاحظہ ہوں:

"ولاپ کرتا ہے، پچھاڑیں کھاتا ہے۔"[۸] یہاں 'پچھاڑیں' کو 'پچھاڑ' کر دیا گیا۔

---

[۱] نند دلارے باجپئی: پریم چند ساہتک وویچن ص ۱۵۱

[۲] ہنس راج رہبر: پریم جیون کلا اور کرتیتو ص ۱۸۵

[۳] قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص ۲۵۱

[۴] پریم چند: نرملا (ہندی) ص ۲۳۵

[۵] ایضاً ص ۱۳۱

[۶] ایضاً ص ۳۰

[۷] کمل کشور گوئینکا: پریم چند کے اپنیاسوں کا شلپ ودھان ص ۳۳۶

[۸] پریم چند: نرملا (ہندی، دوسرا ایڈیشن) ص ۲۵

"جب مسافر نے رکاب میں پاؤں ڈال لیے تھے۔"[۵۱] یہاں 'لیے' کو 'لیا' بنا دیا گیا۔

"تازہ رکت پڑ جانے سے اس کی جان بچ جاتی۔"[۵۲] یہاں 'رکت' کی مضحکہ خیزی محسوس کرکے 'خون' کر دیا گیا۔

زیر نظر ناول کے اسلوب بیان پر اردو اثرات حاوی ہیں۔ جن مقامات پر قصے کی ضرورت دیسی لفظوں کا مطالبہ کرتی ہیں، وہاں بھی پریم چند فارسی و عربی الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً:

تردد، کفایت، تحفہ، حماقت، غافل، منصوبہ، بزرگ وغیرہ وغیرہ

اسی طرح اردو الفاظ کے ہندی متبادل الفاظ پیش کرنے میں بسا اوقات اردو سنسکرت کی مخلوط ترکیبیں نظر آتی ہیں، جو غیر فطری، مصنوعی اور نامناسب ہیں۔ مثلاً 'ویدھویہ کا مزا'، 'مصیبت کی آکاش وانی'، 'پرانیوں سے سابقہ' وغیرہ وغیرہ

پھر بھی پریم چند کے دیگر ناولوں کے مقابلہ میں 'نرملا' کے اردو اور ہندی ایڈیشنوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ عموماً ترجمہ میں اصل کی عبارت و مفہوم کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے 'نرملا' کو اردو تخلیق قرار دینا مناسب ہوگا جس کا ہندی ترجمہ پریم چند کی نگرانی میں ہوا یا انھوں نے خود ترجمہ کیا۔

بیوہ : پرتگیا

'بیوہ' کے بارے میں حسب دستور ہندی محققین نے غلط اور گمراہ کن اطلاعیں فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر کا بیان ہے کہ 'پرتگیا' کا اصل مسودہ ۱۹۰۶ء میں تیار ہوا[۵۳] لیکن آچاریہ نند دلارے باجپئی نے اس کا زمانہ اشاعت ۶-۱۹۰۵ کے درمیان قرار دیا ہے۔[۵۴] ان کے برعکس پنڈت ودیا نواس مسر نے ۱۹۰۴ء کو اولیت دی ہے[۵۵] اور ڈاکٹر منمتھ ناتھ

---

[۵۱] پریم چند: نرملا (ہندی، دوسرا ایڈیشن) ص ۱۵۸

[۵۲] ایضاً

[۵۳] رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص ۱۶

[۵۴] نند دلارے باجپئی: پریم چند ساہتیہ وویچن ص ۱۵

[۵۵] ودیا نواس مسر: نرملا کی بھومکا ص ۱۸

گپت کے نزدیک ۱۹۰۵ء ہے۔[51] ڈاکٹر راجیشور گرو[52] اور ہنس راج رہبر[53] کے خیال میں یہ ناول ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔

'بیوہ' کے متعلق پریم چند کا ایک اہم مکتوب ملتا ہے جو انھوں نے ۳ ستمبر ۱۹۲۹ کو کیشورام سبروال کو لکھا تھا: "میں نے حال میں دو چھوٹے ناول لکھے ہیں۔ 'نرملا' اور 'پرتگیا'، دونوں میں سے کسی کا دعوا کلا کرتی ہونے کا نہیں ہے۔ ان میں کم و بیش سماج کی برائیوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔"[54]

ڈاکٹر من متھ ناتھ گپت، ڈاکٹر اندر ناتھ مدان، ہنس راج رہبر اور ڈاکٹر ودیا نواس مسر 'پرتگیا'، کو تخلیقی ناول کا مرتبہ عطا کرنے میں تکلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ پریم چند کے گذشتہ ناول 'پریما'، کا ترمیم شدہ ایڈیشن ہے۔ اس تصور کو اس امر سے تقویت حاصل ہوتی ہے کہ 'پریما' اور 'پرتگیا'، کے پلاٹ اور کرداروں کسی حد تک یکسانیت ہے اسی بنیاد پر پنڈت جنارون پرساد جھا 'دوج'، نے 'پریما'، کو 'پرتگیا'، کا ترمیم شدہ ایڈیشن قرار دیا ہے۔ ان دونوں ناولوں کی یکسانیت کے اسباب و مقاصد کا ذکر اپنی جگہ پر آئے گا پریم چند ادبیات میں دونوں ناولوں کو الگ الگ حیثیت حاصل ہے اور ان میں سے کسی کو دوسرے کا ترمیم شدہ ایڈیشن نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن نے 'پرتگیا' کی اشاعت ۱۹۲۹ء میں بیان کی ہے[55] جو صحیح ہے۔ ہندی میں 'نرملا'، کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت نے ہندی ماہنامہ 'چاند'، کے مدیروں کو متوجہ کیا کہ 'نرملا'، کی طرح پریم چند کا کوئی دوسرا ناول بالاقساط شایع کیا جائے۔ انھوں نے پریم چند سے استدعا کی اور وہ تیار ہوگئے۔ نتیجہ میں جنوری ۱۹۲۷ء سے 'پرتگیا'، کی بالاقساط اشاعت ختم ہونے کے ایک سال کے وقفے کے بعد ہوئی۔ امرت رائے لکھتے ہیں: "منشی جی کا بھی دل

---

[51] من متھ ناتھ گپت: پریم چند ویکتی اور ساہتیہ کار صفحہ ۱۴۰
[52] راجیشور گرو: پریم چند ایک ادھین صفحہ ۱۶۶
[53] ہنس راج رہبر: پریم چند جیون کلا اور کرتو صفحہ ۱۲۹
[54] پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ صفحہ ۲۰۷
[55] پرتاپ نرائن ٹنڈن: ہندی اپنیاس کا ادبھو اور وکاس صفحہ ۱۸۱

بڑھا ہوا تھا اور پھر جہاں روز کنواں کھودنے اور پانی پینے کی حالت ہو وہاں آمدنی کی یہ صورت تھی جیسے ہاتھ سے جلنے نہ دیا جا سکتا تھا۔"[۱] ایسی صورت میں کہ صرف مالی مقاصد کے پیش نظر ناول لکھا جا رہا ہو، اس میں تخلیقی و فنی موشگافیوں کی تلاش، وجستجو بے سود نظر آتی ہے۔
اس ناول کے لیے پریم چند نے کسی نئے پلاٹ کی تشکیل کی زحمت بھی نہ کی بلکہ اپنے ایک پرانے ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' کو دوبارہ لکھا۔ اس درمیان کافی وقت گذر چکا تھا اور پریم چند ناول نگاری کے فن کی متعدد باریکیوں اور لطافتوں سے واقف ہو گئے تھے جو فطری طور پہ ناول کا حصہ ہے۔ حالاں کہ 'بیوہ' کا پلاٹ 'ہم خرما و ہم ثواب' پر مشتمل ہے لیکن متعدد مقامات پر دونوں کے درمیان اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ جو غالباً گردش ایام کا عطیہ ہے، مختلف ادوار کا یہی بُعد 'ہم خرما و ہم ثواب' کے پلاٹ کی اساس بنتا ہے۔ اس میں پورنا اور دان ناتھ کی واردات قتل نہیں ہے، کیونکہ اب پریم چند ان دونوں کو راہ سے ہٹا کر امرت رائے اور پریما کی شادی کرانے کی مثالیت پسندی کے احساسات سے آزاد ہو چکے تھے لیکن گاندھیائی اثرات نہ صرف بدستور رہیں بلکہ ان میں اضافہ بھی ہوا ہے۔ حالاں کہ پریما دان ناتھ کے ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی گذارتی ہے لیکن مہاتما گاندھی کی اصلاح پسندی کے اثرات میں پریم چند بدھوا آشرم کی تشکیل کرا دیتے ہیں۔
ہندی میں 'پرتگیا' کو 'نرملا' کی طرح کی شہرت و مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو زبان و بیان اور واقعات و حالات کی تکرار کی بنا پر ہے۔ ہندی قارئین 'پریما' سے متعارف تھے اسی کے پلاٹ کو بعض معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دوبارہ پڑھنے میں دلچسپی نہ لے سکے۔
'پرتگیا' کی اشاعت ہندی ماہنامہ 'چاند' میں ۱۹۲۷ء سے نومبر ۱۹۲۷ء تک بالاقساط ہوئی اس کے دو برسوں کے بعد سرسوتی پریس نے ۱۹۲۹ء میں کتابی صورت میں شایع کیا۔
اردو میں پریم چند ادبیات کے ماہر ڈاکٹر قمر رئیس نے 'بیوہ' کو پریم چند کے ابتدائی ناولوں میں شمار کیا ہے۔ وہ اسے ہندی کے بیش تر محققوں کی طرح 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ترمیم شدہ ایڈیشن قرار نہیں دیتے بلکہ اس کو 'جلوۂ ایثار' کا مماثل قرار دیتے ہیں، موصوف لکھتے ہیں: "'پریما اور کملا پرشاد کے کرداروں کو 'جلوۂ ایثار' کی برجن اور کملا چرن کے کرداروں میں آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ کملا پرشاد کملا چرن کی طرح ولین کے روپ میں

---

[۱] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۳۹۵

تو نہیں آتا لیکن اس کی سیرت کی کمزوریاں ہمیں کملاچرن کی یاد ضرور دلاتی ہیں"۔[۵۱] ڈاکٹر قمر رئیس نے 'بیوہ' کے اردو میں اشاعت کے متعلق کوئی اطلاع فراہم نہیں کی ہے۔ یہ بھی نہیں تحریر کیا ہے کہ ان کے مطالعے میں اس ناول کا کون سا ایڈیشن پیش نظر رہا۔

ہمارا خیال ہے کہ مئی ۱۹۳۲ء کے قبل 'بیوہ' کی اردو میں اشاعت ہو چکی تھی کیوں کہ پریم چند نے ۷ر جون ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں منشی دیا نرائن کو لکھا تھا: "بیوہ بیشک بہت خراب چھپی، کئی پریسوں میں چھپی، کئی پتھر ٹوٹے، کئی کاتبوں نے لکھا پھنس گیا تھا۔ مجبوراً ختم کرنا پڑا۔ غلطی رہ گئی کہ پرنٹ لائن نہ دی جا سکی۔ اب اس کی چٹیں بھیج رہا ہوں، تکلیف تو ہوگی مگر دفتری سے چپکوالیں اور دونوں کتابوں 'پردۂ مجاز' اور 'بیوہ' کا ریویو نکلوا دیں۔ بہت عرصے سے میری کسی کتاب کی تنقید 'زمانہ' میں نہیں نکلی"۔[۵۲] پھر ۲۷ر جون ۱۹۳۲ء کو منشی دیا نرائن نگم کو یاد دہانی کرائی: "پہلے ان دونوں کتابوں 'پردۂ مجاز' اور 'بیوہ' کا ریویو تو کرا دیجیے"۔[۵۳] لیکن پریم چند کی خواہش کے مطابق فوری طور پر تبصرہ شایع نہ ہو سکا۔ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں منشی دیا نرائن نگم سے شکوہ کرتے ہیں: "بیوہ کا کوئی ریویو 'زمانہ' میں نہ چھپا"۔[۵۴] اس طرح کا ایک شکوہ 'بیوہ' کے اشتہار کے شایع نہ ہونے پر بھی ہے۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۳۳ء کو منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "ادھر کئی ہفتوں سے 'بیوہ' کا اشتہار 'آزاد' میں نہیں نکل رہا ہے، نہ 'زمانہ' میں۔ کیا اس کی سب جلدیں ختم ہو گئیں؟ اگر فروخت ہو گئی ہوں تو اور ۱۰۰ جلدیں بھجوا دوں"۔[۵۵] اس کا اعادہ ۱۸ر فروری ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں بھی ملتا ہے۔[۵۶]

'پرتگیا' اور 'بیوہ' کے تقابلی مطالعہ میں ترجمے کے وہی مسائل و مباحث سامنے آتے ہیں جو اس کے قبل کے ناولوں سے متعلق ہیں۔ دونوں ناولوں کا پلاٹ یکساں ہے لیکن بسا اوقات ہندی ایڈیشن کی عبارت میں تفصیل اور اردو میں اختصار ہے مگر بعض مقامات پر برعکس صورت حال نظر آتی ہے یہ ترمیم اور اضافے خود پریم چند نے کیے تھے یا ان کے مترجم نے، اب اس کا معلوم کرنا دشوار ہے۔ ناول میں خال خال فارسی زدہ محاورے اور فقرے نظر آتے ہیں مثلاً "ایک جان دو قالب ہونا" جن سے ناول کے اسلوب کے اردو مزاج و کردار کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ اردو الفاظ کے ہندی مترادف تلاش کرنے میں مترجم نے لاپروائی اور سہل انگاری سے کام لیا ہے۔ مثلاً "گئے گذرے کی جگہ پڑ گئے گھوں"، 'فیصلہ'

---

[۵۱] قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص۲۱۷

[۵۲] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص۱۹۵

[۵۳] ایضاً ص۱۹۶ [۵۴] ایضاً ص۱۹۹

[۵۵] ایضاً ص۲۰۲ [۵۶] ایضاً ص۲۰۳

کے لیے 'وچار'، 'داخل' کی جگہ 'پر'یشے'، وغیرہ وغیرہ

موجودہ معلومات کی روشنی میں واضح ہوجاتا ہے۔ اس کی اشاعت پہلے ہندی میں ہوئی لیکن اسلوب بیان اور مزاج وکردار سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اردو سے ہندی میں منتقل کیا گیا ہے۔

●

اس دور میں پریم چند کی تخلیقات کی تعداد دیگر ادوار کے مقابلے میں زیادہ ہے۔اس دور کے ابتدائی برسوں میں پریم چند اردو ہی میں تخلیق کرتے تھے، جس کے ترجمے کبھی خود اور کبھی کسی دوست کی مدد سے کرتے تھے۔ اس وقت تک انھیں ہندی زبان وادب میں مہارت حاصل نہیں تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے ہندی لکھنے اور پڑھنے کی مشق کرلی۔یہ مشق اس درجے کی نہ تھی کہ اُردو کے پہلو بہ پہلو ہندی میں تخلیق کرنے کی دست رس حاصل ہوجاتی۔ اس طرح زیر نظر زمانہ ان کے ادبیات کے تقابلی مطالعے میں ہندی کے لیے ان کا 'دور تعمیر' کہا جاسکتا ہے دور تعمیر کی خامیاں فطری طور پر ہندی تخلیقات میں نظر آتی ہیں، جن پر مناسب موقع پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

اس دور سے پریم چند کو ہندوستانی ادبیات میں دو لسانی مصنف اور تخلیق کار کی حیثیت سے شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، جو آئندہ دور میں وسیع تر بنیادوں پر استوار ہوئی۔ اس پر آئندہ باب میں روشنی ڈالی جائے گی۔ ▲▲▲
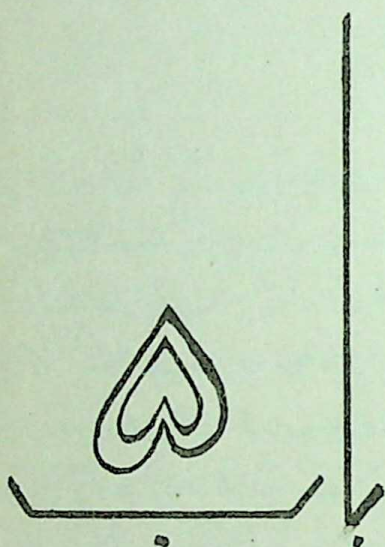
دور عروج

دورِ عروج

پریم چند کی تخلیقات کا آخری دور ۱۹۳۱ء سے ان کی زندگی کے آخری ایام پر مشتمل ہے۔ یہ دور کئی اعتبار سے گذشتہ ادوار سے مختلف ہے۔ اس دور کی ابتدا کے قبل ہی پریم چند کو ادبی شہرت و مقبولیت کی بلندیاں حاصل ہو چکی تھیں لیکن ان کی مالی پریشانیاں اور دشواریاں بدستور قائم تھیں۔ ادبی خدمت خسارے کی تجارت بن گئی تھی! ادبی سفر نے اعضا شکنی شروع کر دی تھی، جسم تھکن سے چور چور ہو گیا تھا۔ صحت جواب دے رہی تھی۔ ۱۵ر اگست ۱۹۳۲ء کو جینندر کمار کو لکھتے ہیں: "ہنس میں کئی ہزار کا گھاٹا اٹھا چکا ہوں لیکن ساہتیہ کے پرلوبھن کو نہ روک سکا۔ کوشش کر رہا ہوں کہ سرو سادھارن کے انکول پتر ہو۔ اس میں ہزاروں کا گھاٹا ہی ہوگا، پر کروں کیا؟ یہاں تو جیون ہی ایک لمبا گھاٹا ہے۔" ؎۱ ایک دوسرے مکتوب میں ۲۸ر جولائی ۱۹۳۶ء کو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کو لکھا: "میں قریب ایک ماہ سے بیمار ہوں۔ معدے میں گیسٹرک السر کی شکایت ہے۔ منہ سے خون آ جاتا ہے۔ اس لیے کام کچھ نہیں کرتا دوا کر رہا ہوں مگر ابھی تک کوئی افاقہ نہیں ہے۔ اگر بچ گیا تو 'بیسویں صدی'، نام کا رسالہ اپنے لوگوں کے خیالات کی اشاعت کے لیے ضرور نکالوں گا۔ 'ہنس' سے تو میرا تعلق ٹوٹ گیا ..... میں بھی خوش ہوں۔ 'ہنس'، جس لٹریچر کی اشاعت کر رہا تھا

؎۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص۲۶

وہ ہمارا لٹریچر نہیں ہے۔ وہ تو وہی بھگتی والا مہاجنی لٹریچر ہے، جو ہندی زبان میں کافی ہے"[۵۱] ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان کا یہ دور پریم چند کی تمناؤں سے عبارت ہے اس نئے اردو جریدے 'بیسویں صدی' کے نکالنے کا ارمان دل ہی میں رہ گیا! اسی درمیان 'ہنس' پر ایک متنازعہ ڈرامے کی اشاعت پر برطانوی سرکار نے ضمانت طلب کی اور اسے ہنس کے مالکان نے ادا کرنے سے انکار کردیا تو پریم چند نے ضمانت دے کر 'ہنس' کو دوبارہ اپنا لیا۔

زیر نظر دور سیاسی اور سماجی واقعات کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کا مالک ہے۔ اس دور کے اوائل میں ملکی تحریک نے مکمل آزادی کا نصب العین اختیار کیا۔ یہ قومی ہفتہ ۱۹۳۲ء میں ۶ اپریل تک منعقد کیا گیا، جس کے درمیان کئی غیر متوقع واقعات پیش آئے۔ پریم چند نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں منشی دیا نرائن نگم کو لکھا: "گورنمنٹ کی زیادتیاں اب ناقابل برداشت ہو رہی ہیں۔ پنڈت جواہر لعل کی ضعیف ماں کے ساتھ بدعتیں کی گئیں۔ اب باہر رہنا مجھے بھی بے حیائی معلوم ہو رہی ہے۔"[۵۲] اس کے بعد مہاتما گاندھی کے یرودا جیل میں 'مرن برت'، کے اعلان نے پریم چند کے جذبات میں تلاطم برپا کردیا۔ انھوں نے اس ریاضت کو عظیم عبادت قرار دیتے ہوئے ۱۹ ردسمبر ۱۹۳۲ء کے جاگرن میں لکھا: "کل یرودا جیل میں وہ مہان تپ آرمبھ ہوگا، جس کی کلپنا سے ہی رومانچ ہو جاتا ہے۔ بھارت کی تپو بھومی میں اس سے پہلے بھی بڑی بڑی کٹھن تپسیائیں کی گئی ہیں۔ ... پر راشٹر کے لیے پرانوں کی آہوتی دینے کا سنکلپ مہاتما گاندھی ہی کی کیرتی ہے ... ایک سمے ددھیچی نے بھی راشٹر کی رکشا کے لیے پرانوں کا بلیدان کیا تھا۔ ہم اپنی اشردھا کے کارن اسے پورانک کتھا سمجھے بیٹھے تھے۔ پر آج تم نے اس پراچین مریادا کو، اس پراچین آدرش کو، اس پراچین آتموتسرگ کو پنر جیوت کردیا۔"[۵۳]

اسی زمانے میں ہندوستانی ادبیات کی تاریخ میں وہ عظیم ادبی تحریک شروع ہوئی

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۲۵۰

۵۲ ایضاً ج ۱ ص ۱۹۴

۵۳ ایضاً: وود پرسنگ ج ۲ ص ۴۳۷

جو ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے موسوم ہے۔ پریم چند اس تحریک میں ۱۹۳۵ء میں اس وقت شامل ہوئے، جب ترقی پسند تحریک اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت کی اور اپنا وہ تاریخی خطبہ صدارت پیش کیا جو ہندوستانی ادبیات کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا۔ اس اجلاس میں انھوں نے اردو میں اپنا تحریری خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا: "ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں فکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی!"[۵۱]

ہندوستان میں اس تحریک کے بانی سید سجاد ظہیر اور پریم چند کی خط و کتابت کا مطالعہ کیا جائے تو اس زمانے کے پریم چند کے متعلق متعدد خیال انگیز نتائج سامنے آتے ہیں[۵۲] سید سجاد ظہیر لکھتے ہیں: "اپریل ۱۹۳۶ سے لے کر اس وقت تک جب تک کہ بیماری سے صاحب فراش نہیں ہوگئے، انھوں نے جو کام کیے، جس ادبی کانفرنس یا مشورے میں وہ شریک ہوئے، وہاں پر انھوں نے ترقی پسند نقطۂ نظر ہی پیش کیا۔"[۵۳]

پریم چند کے تخلیقی عمل کے مطالعے میں زیر نظر دور اس بنا پر مزید اہمیت حاصل کرتا ہے کہ اگر ایک طرف 'اردو ہندی ہندستانی' کا شاخسانہ نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے، جس سے پریم چند کو ذہنی صدمے اٹھانا پڑتے ہیں، تو دوسری طرف وہ لسانی خلیج کو کم کرنے کے لیے اردو ادیبوں، مصنفوں، دانش وروں، اور رہنماؤں سے تعلقات استوار کرتے ہیں، ہندی میں ادیب، صحافی اور قلم کار کی حیثیت سے شہرت و مقبولیت حاصل کرتے ہیں اور اردو میں تخلیقی رفتار کو دوبارہ استقامت عطا کرتے ہیں۔ وہ تخلیقی معیاروں پر ہندی کے بجائے اردو کو فوقیت عطا کرتے ہیں اور اسے اپنے اظہار کا ذریعہ قرار دے کر انھوں نے اس دور میں تمام تخلیقات اردو میں کیں، جن کا سلسلہ 'کفن'، اور 'گئو دان' تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کی

---

۵۱ پریم چند: خطبۂ صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنؤ ۱۹۳۶ء

۵۲ سید سجاد ظہیر: روشنائی ص۱۷۰

۵۳ ایضاً ص۱۷۱

تخلیقات کے ترجمے ایک زبان سے دوسری زبان میں ہوتے رہے، جس سے انھیں دو لسانی مصنف کی حیثیت سے ملک کی دو اہم زبانوں میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔

کہانیاں

پریم چند کی ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان ۷۴ (چوہتر) کہانیاں دستیاب ہیں۔ عین ممکن ہے کہ آئندہ تلاش و تحقیق میں کچھ اور کہانیاں حاصل ہو جائیں جو اردو ہندی رسائل و اخبارات میں پڑی ہوں اور جن کے متعلق سردست معلومات نہ ہوں۔

اس دور کی کہانیوں میں ۳۷ (سینتیس) کہانیاں پریم چند کی حیات میں اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہو گئی تھیں، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) فریب (۲) آشیاں برباد (۳) ڈمانسٹریشن (۴) طلوع محبت (۵) آخری حیلہ (۶) مالکن (۷) دو بیل (۸) نجات (۹) ادیب کی عزت (۱۰) زاد راہ (۱۱) وفا کا دیوتا (۱۲) کسم (۱۳) زیور کا ڈبہ (۱۴) شکوہ شکایت (۱۵) نئی بیوی (۱۶) ڈامل کا قیدی (۱۷) بدنصیب ماں (۱۸) عیدگاہ (۱۹) اکسیر (۲۰) بینور (۲۱) معصوم بچہ (۲۲) ستی (۲۳) سکون قلب (۲۴) ریاست کا دیوان (۲۵) دودھ کی قیمت (۲۶) مفت کرم داشتن (۲۷) قہر خدا کا (۲۸) بڑے بھائی صاحب (۲۹) انصاف کی پولیس (۳۰) لعنت (۳۱) زاویۂ نگاہ (۳۲) کفن (۳۳) مس پدما (۳۴) حقیقت (۳۵) دو بہنیں (۳۶) دفینہ (۳۷) ناگ پوجا۔

مندرجہ ذیل ۵ (پانچ) کہانیاں امرت رائے نے 'گپت دھن' میں یکجا کر دی ہیں جو پریم چند کی زندگی میں ہندی میں شائع ہو چکی تھیں: (۱) آخری تحفہ (۲) دوسری شادی (۳) سوت (۴) وفا کی دیوی (۵) پے بچی۔

امرت رائے نے 'گپت دھن' میں مندرجہ ذیل ۳ (تین) کہانیاں ترجمہ کر کے شائع کیں:

(۱) قاتل (۲) ہولی کی چھٹی (۳) کرکٹ میچ۔

پریم چند کی ۴ (چار) کہانیاں اب تک ہندی میں نہیں شائع ہو سکیں جن کے نام ہیں: (۱) روشنی (۲) برات (۳) وفا کی دیوی (۴) قاتل کی ماں۔

مذکورہ بالا کہانیوں میں 'برات' اور 'قاتل کی ماں' ہندی میں شیورانی دیوی کے نام سے شائع ہوئیں۔ اردو میں انھیں خود پریم چند نے اپنے مجموعوں میں شامل کیا ہے۔ اسی طرح

مندرجہ ذیل ۳۰ (تیس) کہانیاں اردو میں شائع نہیں ہوسکیں:

(۱) اُن ماد (۲) ڈھپور سنکھ (۳) ہولی کا اُپہار (۴) دوسری شادی (۵) تاوان (۶) سوت (۷) کُتسا (۸) ٹھاکر کا کنواں (۹) جھانکی (۱۰) کایر (۱۱) ویشیا (۱۲) رسک سمپادک (۱۳) قیدی (۱۴) دل کی رانی (۱۵) نشہ (۱۶) منوورت (۱۷) جادو (۱۸) موٹے رام کی ڈائری (۱۹) پے بچی (۲۰) رہسیہ (۲۱) کشمیری سیب (۲۲) پریم کی ہولی (۲۳) جرمانہ (۲۴) یہ بھی نشہ وہ بھی نشہ (۲۵) ودھولس (۲۶) انوبھو (۲۷) ایک آنچ کی کسر (۲۸) باباجی کا بھوج (۲۹) سچائی کا اُپہار (۳۰) موٹر کی چھینٹیں۔

پریم چند کی ایک کہانی 'ویراگ'، کا اردو ترجمہ پریم چند کی وفات کے بعد ہوا۔

اس دور کی تمام کہانیوں کے اردو اور ہندی ایڈیشنوں کا تقابلی مطالعہ پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان میں متعدد کہانیوں کے اردو روپ دستیاب بھی نہیں ہیں۔ تفصیل کو نظر انداز کرکے دو منتخب کہانیوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

سکونِ قلب : شانتی

یہ کہانی پہلی بار 'عصمت'، میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی اور پھر 'شانتی'، کے عنوان سے ان کی کہانیوں کے مجموعۂ 'واردات'، میں شامل کی گئی۔ کہانی کی پہلی اشاعت میں گوپا کے شوہر کا نام سری ناتھ اور دوسری اشاعت میں دیوناتھ کردیا گیا ہے۔ ہندی میں دیوناتھ ہے۔ اردو اور ہندی کی اشاعتوں کا مقابلہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو میں دوسری بار شائع کرتے ہوئے ہندی سے ترجمہ کیا گیا ہے اس کی زبان پہلی اشاعت کے مقابلہ میں ناہموار اور نامانوس ہے۔

اس کہانی میں اردو کے متن کی بعض عبارتیں ہندی میں نہیں ہیں، جن میں چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) "مگر اس ایک جملہ میں خدا جانے کیا جادو تھا، معجزہ تھا۔"

(۲) "گوپا نے میری باتوں پہ التفات نہ کیا، بولی۔ مداری لال بہت ہی شریف اور بے لوث آدمی ہیں۔ تم ان سے مل کر خوش ہوگے۔ صبح ان کے پاس جاکر اس معاملہ کو طے کرو۔ میں اب تک ان سے صاف کچھ نہیں کہہ سکی۔ لیکن مجھے امید ہے کہ جہیز کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ میں بیوہ ہوں،

غریب ہوں، بیکس ہوں، مجھ پر رحم کریں گے۔"

(۳) "اس نے بجھی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور بولی - سچ !"

اسی طرح ہندی ترجمے میں بھی بعض اضافے نظر آتے ہیں۔ چند اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

(۱) "یوں تو لڑکپن ان کے سبھاؤ میں ہی تھا، لیکن اس عمر میں پرایہ سبھی لوگ کچھ بے فکر رہتے ہیں۔"

(۲) "نہیں، نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ تمھیں غیر سمجھوں گی، تو اپنا کسے سمجھوں گی۔"

(۳) "اس نرسکار کی آڑ میں گھنشٹ آتمیتا بیٹھی جھانک رہی تھی۔"

(۴) "ہماری مریادا ہمارے بعد بھی جیوت رہتی ہے۔"

(۵) "کون دس پانچ لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ وہ تو دل کھول کر ارمان نکالے گی۔"

(۶) "تم نے سُنا نہیں۔ رانڈ مرے نہ کھنڈہر ڈھہے۔"

(۷) "میری یہ آلوچنا اسے بُری لگی۔ اِن دنوں اُسے بات بات پر کرودھ آجاتا تھا۔"

(۸) "اس کے لیے سُنی کی جگہ مُنی ہے۔ سُنی کے لیے اس کی اُپیکشا ہے اور رُدن ہے۔"

(۹) "وہ جانتی ہے اور چاہے سارا سنسار اس کی نندا کرے، اس کی ماتا اس کی سراہنا کرے گی۔ اس کی آتما سے یہ آنند بھی چھین لوں؟"

اس کہانی میں ترجمے کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور ہندی کی متبادل عبارتیں بھی پیش کردی جائیں، جن سے مترجم کی تحریف کا صحیح اندازہ ہو سکے، مثلاً کہانی میں اُردو عبارت ہے :

"مگر اس کا اثر ہمیشہ توقع کے خلاف ہوا۔ وہ کبیدہ خاطر ہو جاتے اور معلوم ہوتا تھا کہ انھیں مصلحت آمیز خیر اندیشیوں سے روحانی صدمہ ہوتا ہے۔"

اس کا ترجمہ ہندی میں کیا گیا :

"پر اس کا پرنیام آشا کے وِرُدھ ہوا۔ جیون کے سوپنوں کو بھنگ کرتے انھیں ہاردک ویدنا ہوتی تھی۔"

اور سُنی کے مزاج کے مطابق اردو میں ہے۔

"وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی، زمانہ کے نشیب و فراز سے ناواقف رواداری کی حقیقت سے محروم، وہ احتراز سے اسے زیر کرنا چاہتی ہے، یہ بے اعتنائی سے۔ میں تو صاحب اس معاملہ میں بہو کو زیادہ خطاوار سمجھتا ہوں۔ لڑکوں میں بالعموم ذمہ داری کا خیال کم ہوتا ہے۔ لڑکیاں فطرتاً زیادہ ذمہ دار ہوتی ہیں اور اپنی خدمت اور قربانی سے شوہر کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔ بہو میں یہ بات نہیں بس یہی بدمزگی کا سبب ہے۔ بہ ظاہر دونوں بڑے مہذب بڑے نیک بڑے متحمل مزاج، لیکن ایک کے باطن میں خودداری اور تکبر کا جنون ہے، دوسرے کے باطن میں آزاد روی، کج فہمی کا فتور۔ کشتی کیسے پار ہوگی یہ خدا ہی جانے۔"

اس کا ترجمہ ہندی میں کیا گیا:

"وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی، ہٹیلی، اَبودھ، آدرش وادنی، سہشنتا تو اس نے سیکھی ہی نہ تھی۔ سمجھوتے کا جیون میں کیا مولیہ ہے، اس کی اسے خبر ہی نہیں۔ لوہے سے لوہا لڑ گیا۔ وہ ابھیمان سے اسے پراجت کرنا چاہتی ہے، یہ اُپیکشا سے۔ یہی رہسیہ ہے۔ اور صاحب، میں تو بہو کو زیادہ دوشی سمجھتا ہوں، لڑکے پرایہ من چلے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں سوبھاؤ سے ہی کشٹشیل ہوتی ہیں اور اپنی ذمہ داری سمجھتی ہیں! اس کی سیوا، تیاگ اور پریم ہی اُن کا استر ہے، جس سے دے پُرش پر دجے پاتی ہیں۔ اس میں یے گُن ہیں ہی۔ ڈونگا کیسے پار ہوگا، ایشور ہی جانے۔"

اس طرح کی انگنت مثالیں کہانی میں بکھری پڑی ہیں، جن کے مختصر اقتباسات پیش کرنا بھی طول امل ہے۔ لفظوں کے متبادل تلاش کرنے میں 'علوہمتی' کو ایک جگہ 'تنش کپٹتا'، اور دوسری جگہ 'داُکشاہ'، 'پرلطف صحبتیں' کے بجائے 'رنگ رلیاں'، 'عبرت' کے بجائے 'ہوشیار'، 'شکوہ آمیز لہجہ' کے بجائے 'ورکت من'، وغیرہ لکھا گیا ہے۔

کفن

اس کہانی کا اردو ہندی دونوں میں ایک ہی نام ہے۔ اس کہانی کی پہلی اشاعت اردو ماہنامہ 'جامعہ' کے دسمبر ۱۹۳۵ کے شمارے میں ہوئی۔ ہندی میں کب اور کس نے ترجمہ کیا،

اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے۔ موجودہ صورت میں امرت رائے کے مرتبہ کہانیوں کے مجموعہ "کفن" میں شامل ہے۔ اردو اور ہندی ایڈیشنوں کا تقابلی مطالعہ کرنے پر کئی اہم نتائج سامنے آتے ہیں:

(۱) اردو ایڈیشن ہندی کے مقابلے میں متعدد موقعوں پر زیادہ مفصل ہے۔ لیکن اس سے کہانی کے فنی پہلوؤں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً:

"یہاں تو اوجھا ایک روپیہ مانگتا ہے کس کے گھر سے آئے۔"

اس کا ہندی ترجمہ کیا گیا:

"یہاں تو اوجھا ایک روپیہ مانگتا ہے۔"

دوسری مثال ملاحظہ ہو:

"مادھو بھی ہنسا، اس غیر متوقع خوش نصیبی پر۔ قدرت کو اس طرح شکست دینے پر!"

اس کی ہندی صرف یہ ہے:

"مادھو بھی ہنسا، اس ان اپکیشت سوبھاگیہ پر"

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں، سالن اور گوشت چٹنی، کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔"

ہندی ترجمہ یہ ہے:

گھیسو نے دو سیر پوریاں منگوائیں، چٹنی، اچار، کلیجیاں!"

اردو میں اضافے کی دیگر مثالیں ملاحظہ ہوں، جو ہندی میں نہیں ہیں:

"ان کے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے ...."

"لاش گھر میں رکھ کر سڑا"

"اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کفن تیسری بار ملے گا۔"

"یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزا لینے کے لیے۔"

"وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔"

"دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے۔"

(۲) بعض مقامات پر مترجم نے خوب صورت اضافے کیے ہیں۔ جن سے کہانی کے تاثر کی نشتریت بڑھ گئی ہے۔ حالانکہ اس سے پریم چند کی تحریر کی انفرادیت مجروح ہوتی ہے۔ مثلاً:

"گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملال انداز میں دیکھا۔"

اسے ہندی میں اس طرح کیا گیا:

"گھیسو نے اس بھولے بھالے سوال کا کوئی اتر نہ دیا۔ وہ پرلوک کی باتیں سوچ کر اس آنند میں بادھا نہ ڈالنا چاہتا تھا۔"

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا کون دے گا روپے؟ روپے تو تم نے چٹ کر دئے!"

اس کا ہندی میں یہ ترجمہ ہے:

"مادھو کو وشواس نہ آیا، بولا کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔ وہ مجھ سے پوچھے گی، اس کی مانگ میں سیندور تو میں نے ڈالا تھا۔"

ہندی میں اضافے کی دیگر مثالیں ملاحظہ ہوں، جو اردو میں نہیں ہیں:

"کبھی اس بزاز کی دوکان پر گئے، کبھی اس دوکان پر۔ طرح طرح کے کپڑے ریشمی اور سوتی دیکھے مگر کچھ جچا نہیں۔"

"پھر گھیسو نے گدی کے سامنے جا کر کہا۔ ساہو جی، ایک بوتل ہمیں بھی دینا۔ اس کے بعد کچھ چکھونا آیا، تلی ہوئی مچھلیاں آئیں۔ ..."

(۳) اس کہانی کے بیش تر حصے میں اردو اور ہندی میں زیادہ اختلاف نہیں ہے شاذ و نادر ہی ترمیم و اضافہ ہوا ہے۔ زبان اور اسلوب بیان بھی یکساں ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

"مادھو نے ان تکلفات کا مزا لیتے ہوئے کہا۔"

اس کی ہندی تقریباً ویسی ہی ہے:

"مادھو نے ان پدھارتوں کا من ہی من میں مزا لیتے ہوئے کہا۔"

پریم چند کی دیگر تخلیقات کی طرح اس کہانی میں بھی اردو الفاظ کے متبادل کی تلاش میں مترجم نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔ متعدد الفاظ کے نامناسب متبادل پیش کیے گئے ہیں

اور جن موقعوں پر وہ متبادل پیش کرنے سے قاصر رہ گیا ہے، اس نے مفہوم بیان کرنے پر اکتفا کرلی ہے۔ مثلاً:

دل خراش: دل ہلا دینے والی، زاہدانہ انداز: آکاش ورتی، باریک بیں: وچاروان انگشت نمائی: انگلی اٹھاتے تھے، زندہ درگور: نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں وغیرہ وغیرہ

'کفن' کے اسلوب بیان کی خصوصیت دیہی عوامی زندگی کے بعض پہلوؤں کی فنی و تخلیقی پیش کش ہے، جس میں الفاظ و تراکیب کے برجستہ استعمال نے چار چاند لگا دئے ہیں۔ اس سے 'کفن' کا مترجم ناواقف ہے، اس لیے اکثر غلطیاں کرجاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ پر اردو میں 'اسیرواد' لکھا گیا ہے جسے ہندی میں شدھ کرنے کے خیال سے 'آشیرواد' کردیا گیا ہے۔ اسی طرح اردو میں 'صدا' کا ترجمہ بلاوجہ 'آواز' کیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ

غبن

غبن کی تصنیف و اشاعت کے متعلق پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح مختلف و متضاد بیان ملتے ہیں۔ ڈاکٹر اندر ناتھ مدان[۵۱] ڈاکٹر شیو نرائن سری واستو[۵۲] اور ڈاکٹر قمر رئیس[۵۳] کے خیال میں یہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ انھوں نے اس کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ آچاریہ نند دلارے باجپئی کے نزدیک: "اس کا زمان سن ۱۹۳۱ء کے آس پاس ہوا تھا"[۵۴] اس طرح انھیں ۱۹۳۱ء کو سن تصنیف قرار دینے میں تکلف ہے۔ لیکن ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر اسے ۱۹۳۱ء کو قطعیت عطا کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کی اشاعت ۱۹۳۳ء میں ہوئی[۵۵]۔ اُن کے برعکس منشی دیا نرائن نگم[۵۶] اور ڈاکٹر پرتاپ نرائن ٹنڈن[۵۷] نے 'غبن' کی اشاعت '۱۹۲۱ء' میں قرار دی ہے۔ پریم چند کے مشہور سوانح نگار مدن گوپال کے

---

۵۱ اندر ناتھ مدان: پریم چند ایک ودیچن ص۵۲

۵۲ شیو نرائن سری واستو: ہندی اپنیاس ص۱۰۱

۵۳ قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص۲۸۸

۵۴ نند دلارے باجپئی: پریم چند ساہتک ودیچن ص۱۱۴

۵۵ رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص۱۳۸

۵۶ دیا نرائن نگم: پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۵۷ پرتاپ نرائن ٹنڈن: ہندی اپنیاس کا ادبھو اور وکاس ص۱۵۱

کے خیال میں اس کی تشکیل ۲۷-۱۹۲۶ء کے درمیان اور تکمیل ۱۹۲۸ میں ہوئی۔[۵۱] لیکن امرت رائے کا بیان ہے کہ 'پرتگیا'، کی اشاعت کے بعد 'غبن'، کی تصنیف کی تیاری شروع ہوئی[۵۲] اس طرح ۱۹۲۸ء سن تصنیف قرار پائے گا۔ موصوف نے ایک دوسرے مقام پر 'غبن'، کی تخلیق کا زمانہ 'اہنکار'، کے ترجمے کے زمانے کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ 'اہنکار'، کا ترجمہ ۱۹۲۹ء میں ہوا۔[۵۳] اس کے اعتبار سے 'غبن' ۱۹۲۹ء کی تخلیق قرار پائے گی۔ ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے مدن گوپال سے اتفاق کیا ہے۔ ان کا بیان ہے: "پریم چند نے فروری ۱۹۲۹ء سے پہلے 'غبن' سماپت کرنے کے بعد ہی 'کرم بھومی' لکھا ہوگا" [۵۴]

متذکرہ بالا مختلف و متضاد بیانات کی روشنی میں فیصلہ کرنا دشوار ہے پریم چند کے خطوط میں 'غبن'، کی تصنیف کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ اس کی اشاعت کے متعلق پہلی اطلاع جینندر کمار کے نام ۲۵ نومبر ۱۹۳۰ء کے مکتوب میں ملتی ہے:" آج کل میرا 'غبن' چھپ رہا ہے"[۵۵] پھر ۱۷ دسمبر ۱۹۳۰ کو انھیں کو لکھتے ہیں:" غبن ابھی تیار نہیں ہوا۔ تین سو پرشٹھ چھپ چکے ہیں۔ ابھی ایک سو پرشٹھ اور ہوں گے۔ یہ ایک سماجک گھٹنا ہے۔"[۵۶] اس کے بعد ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو پھر اطلاع دی:" غبن کے تین فارم اور باقی ہیں۔"[۵۷] پھر لکھنؤ سے انھیں کو ۱۸ فروری ۱۹۳۱ء کو لکھا:" غبن کی ایک پرتی بھی شیگھر ہی بھیجوں گا۔"[۵۸] اس خط کی بنیاد پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک 'غبن'، شائع ہو چکا تھا۔ اس کی توثیق پریم چند کے ایک اور مکتوب مورخہ ۲۹ فروری ۱۹۳۱ء سے ہوتی ہے۔[۵۹]

---

[۵۱] مدن گوپال: منشی پریم چند ص۲۷۴

[۵۲] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص۴۱۲

[۵۳] ایضاً ص۴۲۱

[۵۴] کمل کشور گوئنکا: پریم چند کے اپنیاسوں کا شلپ ودھان ص۶۹

[۵۵] پریم چند چٹھی پتری ج ۲ ص۱۰

[۵۶] ایضاً ص۱۳

[۵۷] ایضاً ص۱۷

[۵۸] ایضاً ص۲۰

[۵۹] جینندر کمار: پریم چند ایک کرتی وکتتو ص۱۰۲

"غبن" کے زمانہ تصنیف کے تعین میں داخلی شواہد پر نظر کی جائے تو نتیجہ خیز حقائق سامنے آتے ہیں۔ نصف اول اور نصف آخر کے درمیان غیر معمولی فرق ہے۔ ایک حصے کا ماحول دوسرے حصے سے سراسر مختلف ہے۔ پہلے حصے کے سماجی رسمیات میں گرفتار لوگ دوسرے حصے میں اولوالعزم، بہادر اور خود شناس نظر آتے ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ 'غبن' کی تصنیف کے درمیان بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جن سے پریم چند کا ذہنی ردیہ منقلب ہو گیا۔ اگر تاریخ کے صفحات پر اس بے چینی کو تلاش کرنا ہو تو اس کا جواب ملنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ یہ سال ۱۹۲۹ء ہی تھا۔ کیوں کہ اسی سال ۸ اپریل کو بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت نے دلی اسمبلی میں بم پھینکا۔ چونسٹھ دنوں کی بھوک ہڑتال کے نتیجے میں جتیندر داس کی لاہور جیل میں ۱۳ ستمبر کو موت ہوئی ان دنوں پریم چند کا قیام لکھنؤ میں تھا، جہاں ۲۸ ستمبر کی کانگریس کی مجلس عاملہ کراچی میں اجلاس کے نامزد صدر مہاتما گاندھی نے اپنی جگہ پر پنڈت جواہر لال نہرو کا نام تجویز کیا۔ ۳۱ اکتوبر کو لارڈ اروِن نے برطانوی سرکار کی طرف سے سیاسی اصلاحیں پیش کیں۔ ۲۳ دسمبر کو گاندھی اروِن ملاقات ہوئی اور ۳۱ دسمبر کی نصف شب میں کانگریس نے لاہور میں مکمل آزادی کے نصب العین کا اعلان کیا۔ آئندہ ۲۶ جنوری کو یوم آزادی منعقد کرنے کا تعین کیا گیا۔ ایک برس میں ایسے ولولہ خیز واقعات پریم چند کے اصلاح پسند زاویہ نظر کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکے نتیجے میں ایک سماجی مسئلے کو بنیاد بنا کر جس ناول کی ابتدا کی گئی تھی وہ فطری انداز میں دوسری طرف مڑ گیا۔ جالپا کے فکر و عمل میں تبدیلی آگئی۔ دیوی دین ظلم کے خلاف سرگرم جہاد ہو گئے۔ پولس کے رقص ابلیس کا عوامی سطح پر مقابلہ کیا گیا۔

اس پس منظر اور ناول پر اس کے اثرات کے پیش نظر 'غبن' کا زمانہ تصنیف ۱۹۲۸ء کے اواخر اور ۱۹۲۹ء کے درمیان قرار پاتا ہے۔ ہندی میں 'غبن' کی پہلی اشاعت ۱۹۳۱ء میں پریم چند کے اپنے سرسوتی پریس سے ہوئی۔ 'غبن' کا اردو ایڈیشن سب سے پہلے لاجپت رائے اینڈ سنس تاجران کتب لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے پہلے ایڈیشن پر سال اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن منشی دیانرائن نگم کے نام ۱۸ جون ۱۹۳۱ء کے مکتوب میں اس ناول کی ایک کاپی ان کو بھیجنے کا ذکر ہے: میرے نئے ناول 'غبن' کی کوئی جلد آپ کے پاس پہنچی یا نہیں۔"[۵] اس سے

---

[۵] پریم چند چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۸۵

خیال ہوتا ہے کہ اس وقت تک 'غبن' اردو میں شائع ہو چکا تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ انھیں کے نام ۲۵ فروری ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں 'غبن' کے اردو میں ترجمہ کرنے کا ذکر ہے۔ لکھتے ہیں: "ادھر 'غبن' کا ترجمہ بھی شروع کر دیا ہے" [۱] اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ پہلے خط میں ہندی ناول کی کاپی کے بھیجنے کا حوالہ ہے۔ موصوف لکھتے ہیں "غبن کا ترجمہ بھی شروع کر دیا ہے۔ ایک نیا ناول بھی شروع کر دیا ہے۔ مگر سرد بازاری بلائے جان ہو رہی ہے۔"

متذکرہ بالا مکتوب کی روشنی میں ثابت ہو جاتا ہے کہ:

(۱) 'غبن' کا اردو ترجمہ خود پریم چند نے کیا تھا۔

(۲) فروری ۱۹۳۲ تک 'غبن' اردو میں ترجمے کی منزل میں تھا۔ اس کی اشاعت اس وقت تک اردو میں نہیں ہو سکی تھی۔

'غبن' کی اردو میں اشاعت کے متعلق منشی دیا نرائن نگم نے بھی کسی سال کا ذکر نہیں کیا۔ صرف اتنا لکھا ہے۔ "اس کا ترجمہ بھی لاہور میں چھپا ہے۔" [۲]

'غبن' کے اردو اور ہندی ایڈیشنوں کے تقابلی مطالعہ میں بعض حقائق متوجہ کرتے ہیں:

۱۔ متعدد مقامات پر اردو میں اختصار اور ہندی میں تفصیل ہے۔ مترجم نے ترجمے کے بجائے مفہوم کی ادائیگی کو اہمیت دی ہے۔ لیکن کچھ جگہوں پر اس کے برعکس بھی نظر آتا ہے، جہاں ہندی میں اختصار اور اردو میں تفصیل ہے۔ ان جگہوں پر اردو عبارت ہندی کے مقابلے میں زیادہ عام فہم فطری اور دل نشیں ہے۔

۲۔ بعض موقعوں پر مترجم نے اردو کی مخصوص علامتوں کو ہندی کی روایتوں کے اعتبار سے ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً

اردو میں معراج کا خاص تصور ہے:

"محبت اپنے معراج پر پہنچ کر پرستش بن جاتی ہے۔" [۳]

---

[۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۹۲

[۲] دیا نراین نگم: پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات، زمانہ پریم چند نمبر، ۱۹۳۷ء

[۳] پریم چند: غبن (اردو) ص ۳۴۵

اس کا ہندی ترجمہ یہ کیا گیا ہے :

"پریم اپنے اچیتم استھان پر پہنچ کر دیوت سے مل جاتا ہے ۔" ۵۱

۲- بعض اوقات مترجم نے ترجمہ میں اصل سے یکسر انحراف کیا اور اپنے طور پر عبارت لکھ دی ہے مثلاً :

" اس برجستہ جواب نے رما کا وقار قائم کر دیا" ۵۲

اس کا ترجمہ ہندی میں یہ کیا گیا ہے :

"یووکوں کا اوشواس کچھ کم ہوا" ۵۳

اسی طرح ایک جگہ پر اردو میں مظالم کے خلاف احساسات بیدار کیے گئے ہیں۔ ہندی میں 'مظلوموں' کو 'مزدوروں' کر دیا گیا ہے اور 'مزدوروں' کی رعایت سے ایک جوٹ مل کا بھی ذکر شامل کر دیا گیا ہے۔

۳- مترجم نے عملی طور پر ہندی کی روایتوں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ اردو میں اخلاقی زوال کا بیان ہے جسے ہندی میں" ہندو دھرم کے شرو ناش" کر دیا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ عبارت کو ہندی آمیز بنانے کی غرض سے گوسوامی تلسی داس کا قول شامل کر دیا ہے جو اردو میں نہیں ہے :

"گوسائیں جی تو کہہ گئے ہیں ـــــ سوارتھ لائی کرہیں سب پریتی۔" ۵۴

۴- اردو میں دیسی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جنھیں ہندی میں سنسکرت آمیز کر دیا گیا ہے۔ بعض جگہوں پر یہی عمل فارسی الفاظ کے ساتھ ہوا جس نے پوری عبارت کو مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ جیسے تماشائیوں کا ترجمہ گولاکا۔ جمگھٹ وغیرہ

۵- بعض مقامات پر ترجمہ اصل سے زیادہ پُر تاثیر و فطری ہے۔

۶- پریم چند کے کئی ناولوں کی طرح 'غبن' میں بھی ترمیم و اضافے کیے گئے ہیں۔

---

۵۱ پریم چند غبن (ہندی) ص ۳۰۹

۵۲ ایضاً (اردو) ص ۱۹۴

۵۳ ایضاً (ہندی) ص ۱۷۴

۵۴ ایضاً " ص ۲۵۳

۷۔ 'غبن' کے لسانی مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے ابتدائی نصف اور آخری نصف کی زبان میں نمایاں فرق ہے۔ ابتدائی نصف میں خالص ہندی الفاظ کا استعمال ہوا ہے اور آخری نصف میں خالص فارسی و عربی الفاظ کا۔ کہیں کہیں انھیں ہندی الفاظ کے ساتھ مخلوط ترکیبوں میں پیش کیا گیا ہے۔

ہندی ترجمہ سنسکرت الفاظ سے لبریز ہے لیکن بعض جگہوں پر خالص اردو الفاظ بھی نظر آتے ہیں مثلاً سلوک، جنس، میزان۔ سبب۔ عذر۔ فنا۔ نفاست، تحمل۔ حسرت شوہر۔ شیر دل۔ جبر۔ صبر۔ ضبط۔ دست حنائی۔ خفگی۔ تنزل وغیرہ وغیرہ

مجموعی اعتبار سے 'غبن' کو اردو سے ترجمہ کیے ہوئے ناولوں کی صف میں رکھنا مناسب ہوگا۔ اب یہ کہنا ناممکن ہے کہ دونوں ایڈیشنوں کے درمیان ترمیم و اضافے کی ذمہ داری کس کے سر آئے گی۔ ہندی ایڈیشن پریم چند کی زندگی میں شائع ہو چکا تھا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہندی ایڈیشن کو ابتدا سے انتہا تک ضرور دیکھا ہوگا لیکن ان کی وفات کے بعد ناشرین نے 'غبن' میں مزید ترمیم اور اضافے کر دیے ہیں جن کی بنا پر موجودہ ایڈیشن کی ادبی حیثیت مشکوک ہو گئی ہے۔ اس ایڈیشن کو پریم چند کے زندگی کے ایڈیشن سے تقابل کر کے درست کرنے کی ضرورت ہے۔

میدانِ عمل: کرم بھومی

یہ ناول بھی گذشتہ ناولوں کی طرح متنازعہ رہا ہے کہ اس کا اصل مسودہ اردو میں تیار کیا گیا یا ہندی میں۔ امرت رائے نے 'میدان عمل' کی تصنیف اور اشاعت کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے: "پانڈولپی کے اپلبدھ انش کے آدھار پر اس کا لیکھن ۱۶ اپریل ۱۹۳۱ء سے آرمبھ ہوا، پرکاشن اگست ۱۹۳۲ء میں ہوا۔" [۵۱] پریم چند کے 'شہرت یافتہ' مترجم منشی اقبال ورما سحر ہتگامی کی خود نوشت سوانح کا ایک حصہ منشی دیریندر پرشاد سکسینہ نے پیش کیا ہے، جس میں سحر نے ان کے تقریباً تمام اہم ناولوں کے مترجم ہونے کا دعوا کیا ہے۔ [۵۲]

---

[۵۱] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۵۵۶

[۵۲] دیریندر پرشاد سکسینہ: ہماری زبان ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء

اسی طرح ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے سحر کے بیان پر اعتماد کرکے 'میدان عمل' کو اردو تخلیق قرار دینے میں پس و پیش کیا ہے۔[۵۱] پریم چند کے گذشتہ ناولوں کا جائزہ لیا جا چکا ہے اور اب اس کتاب کے قارئین کو شبہ نہیں رہنا چاہئے کہ اُن کا یہ دعوا کتنا غلط اور بے بنیاد ہے۔ چونکہ سحر کا دعوا 'گئو دان' کے متعلق بھی ہے جس پر آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی جائے گی۔ لہٰذا یہاں اس مسئلے پر مزید عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

'چوگان ہستی' کے بعد سے پریم چند کے تخلیقی عمل کا ایک دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے کہ اصل مسودات اردو میں تیار ہوتے ہیں۔ اردو میں ناشرین کے 'عنقا' ہونے کی بنا پر اس کا ہندی ترجمہ پہلے شائع ہو جاتا ہے، جس کے اعتبار سے اردو مسودہ میں دوبارہ ترمیم و تصحیح اور اضافے کیے جاتے ہیں۔ 'کرم بھومی' کا ہندی مسودہ بنارس کے مراری لال کیڈیا کے پاس محفوظ ہے لیکن اردو مسودہ دست برد زمانہ کا شکار ہو گیا۔ راقم کے استفسار کرنے پر شری پت رائے اور امرت رائے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مکتبہ جامعہ دہلی کے ارباب حل و عقد بھی معذوری ظاہر کرتے ہیں۔ اس درمیان ان کا انتظامیہ برابر تبدیل ہوتا رہا ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ 'میدان عمل' کے مسودات بھی دیگر اہم اور نایاب مخطوطات اور کتابوں کی طرح ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد جب دلی میں فرقہ واریت کی آگ میں جل رہی تھی' اُس وقت تباہ و برباد ہو گئے[۵۲] اور اب اس کے بارے میں مزید عرض کرنا دشوار ہے۔ ہمارے نزدیک 'میدان عمل' بھی پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح اردو تخلیق ہے اور اس کا اسی حیثیت سے تجزیہ کیا جانا چاہیے۔

'کرم بھومی' کے سن اشاعت کے متعلق زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ آچاریہ نند دلارے باجپائی کے خیال میں: ''کرم بھومی کی اشاعت ۱۹۳۲ء میں ہوئی''[۵۳] اس کی توثیق ڈاکٹر رام رتن بھٹناگر

---

[۵۱] مسعود حسین خاں: گئودان تصنیف یا ترجمہ فکر و فن شمارہ ۲، ۱۹۷۲ء

[۵۲] جامعہ ملیہ کے احاطے میں فرقہ وارانہ فسادات کا ہونا تاریخی حادثہ تھا کیونکہ اس ادارے کا قیام ہی ہندو مسلم یکجہتی کی بنیادوں پر ہوا تھا۔ پیارے لال کا بیان ہے کہ جب فرقہ وارانہ فسادات کے بعد مہاتما گاندھی جامعہ گئے تو انھوں نے انتہائی غم والم کے ساتھ جامعہ کے کارکنوں اور ان کے خاندان والوں کو تسلّی دیتے ہوئے کہا تھا۔ اگر آپ کو بہادری کے ساتھ اس عمدہ ادارے کے احاطے میں موت کا سامنا کرنا پڑے تو آپ اس سے بھی گریز نہ کریں۔ پیارے لال: مہاتما گاندھی دی لاسٹ فیز ج ۲ ص ۴۲۶

[۵۳] نند دلارے باجپئی: پریم چند ساہتیک و دیچن ص ۹۷

نے بھی کی ہے۔[۵۱] لیکن انھیں، زمانۂ تصنیف کے متعلق اختلاف ہے۔ منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں:
"۱۹۳۲ء میں آپ نے 'کرم بھومی' لکھا۔"[۵۲] لیکن امرت رائے نے اور مدن گوپال کے خیالات میں زبردست تصادم ہے۔ امرت رائے نے اس کے زمانۂ تصنیف کی ابتدا ۱۶ اپریل ۱۹۳۱ء سے بیان کی ہے۔[۵۳] لیکن مدن گوپال اسی کو تصنیفی کام کے اختتام کی تاریخ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں پریم چند نے ۱۹۲۹ء میں 'کرم بھومی' کی تصنیف کی تھی۔[۵۴] ڈاکٹر قمر رئیس نے ان دونوں حضرات سے اختلاف کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: "پریم چند نے یہ ناول ۱۹۳۰ء-۱۹۳۲ء میں لکھا اور ۱۹۳۲ء ہی میں اپنے ذاتی مطبع سرسوتی پریس سے طبع کرا کر شائع کیا۔"[۵۵] ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے مدن گوپال کے خیال سے اتفاق کیا ہے۔[۵۶] ان مختلف و متضاد بیانات کی روشنی میں کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ خاص طور سے امرت رائے اور مدن گوپال میں اختلاف پر حیرت ہوتی ہے کیونکہ دونوں نے ایک ہی مخطوطے پر درج اطلاع پر الگ الگ نتائج نکالے ہیں۔

پریم چند نے اپنی مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے پہلی بار 'کرم بھومی' کا حوالہ ۲۸ فروری ۱۹۲۹ء کے مکتوب میں دیا ہے۔ منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "صبح کو کرتا ہوں تو 'کرم بھومی' میں حرج ہوتا ہے۔"[۵۷] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند اوائل ۱۹۲۹ء میں 'کرم بھومی' کی تیاری میں انتہائی مصروف تھے۔ جینندر کمار نے ۲۰ فروری ۱۹۳۰ء کو پریم چند سے دریافت کیا تھا: "آپ کا ناول کیسا چل رہا ہے، مجھے بھی بہت اور برابر لکھنے کا منتر بتائے نا!"[۵۸] اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں پریم چند کوئی بڑا ناول لکھ رہے تھے۔ پریم چند نے ۲۳ اپریل ۱۹۳۰ء کے مکتوب میں اپنے کسی ناول کا ذکر کیا ہے، جو شاید 'میدان عمل' ہی ہے۔[۵۹]

---

۵۱ رام رتن بھٹناگر: پریم چند ص ۱۵۱

۵۲ دیا نرائن نگم: پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات 'زمانہ'، پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

۵۳ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۶۵۶

۵۴ مدن گوپال: منشی پریم چند ص ۲۸۲، ۲۷۴

۵۵ قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص ۳۸۲

۵۶ کمل کشور گوئنکا: پریم چند اپنیاسوں کا شلپ ودھان ص ۷۱

۵۷ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۷۱

۵۸ ایضاً: ج ۲ ص ۹

۵۹ ایضاً: ج ۱ ص ۱۷۵

اس کا دوسرا حوالہ ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء کو جینندر کے نام ایک مکتوب میں ملتا ہے: "غبن کے بعد 'میگڈیلین' چھپے گی، تب تک میرا دوسرا اپنیاس بھی لکھا جا چکے گا۔"[۵۱] یہ دوسرا ناول 'میدان عمل' ہی ہے جس کا تصنیفی کام ختم کرنے کے لیے پریم چند نے ۱۲ فروری ۱۹۳۱ء تک کا تخمینہ کیا تھا۔

پریم چند نے اپنے بعض خطوط میں 'کرم بھومی' کی اشاعت کے متعلق اہم اطلاعیں فراہم کی ہیں۔ ۱۷ جون ۱۹۳۲ء منشی دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں: "میرا نیا ناول کرم بھومی' چھپ رہا ہے۔ اٹھارہ فارم چھپ گئے ہیں۔۔۔ کوئی چھ سو صفحے کی کتاب ہوگی۔"[۵۲] پھر ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء کو جینندر کو اطلاع دی: "'کرم بھومی' کے تیس فارم چھپ چکے ہیں ابھی قریب چھ فارم باقی ہیں۔"[۵۳] ان خطوط کی بنیاد پر امرت رائے کا یہ قیاس کہ 'کرم بھومی' اگست ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا، درست نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۵ دنوں کی قلیل مدت میں ۲۰ فارم کا چھپنا، جلد بندھنا اور کتاب کا بازار میں آجانا تقریباً ناممکن ہے۔ مزید برآں امرت رائے نے اپنی اطلاع کے ماخذ کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ 'کرم بھومی' کے زمانۂ اشاعت کے تعین میں اس کی ابتدا میں شائع شدہ 'نویدن' کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے۔ اس نوٹ پر پریم چند کے دستخط کے ساتھ ۵ ستمبر ۱۹۳۲ء درج ہے جس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک ناول کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے نزدیک 'کرم بھومی' کی اشاعت ۱۹۳۲ء کے اوائل میں سرسوتی پریس بنارس سے ہوئی۔ اس کے زمانہ تصنیف کے لیے اغلب ہے کہ پریم چند نے 'غبن' ختم کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء کے اواخر میں اس نئے ناول کی ابتدا کی ہوگی۔ اردو میں 'میدان عمل'، ۱۹۳۴ء میں مکتبۂ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوا۔

زیر نظر ناول کے ہندی مسودے پر انگریزی میں پریم چند نے اپنی یادداشتیں قلم بند کی ہیں لیکن ان کا موجودہ ناول سے براہ راست تعلق قائم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ اس ناول کے ہندی میں ترجمے کے وقت ان کے ذہن پر کسی اور ناول کا خاکہ ابھرا ہو، جس کو انھوں نے سہولت کے پیش نظر درج کر دیا ہو یا دوسری صورت میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ 'چوگان ہستی'

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۷

۵۲ ایضاً ج ۱ ص ۱۹۶

۵۳ ایضاً ج ۲ ص ۲۶

کی طرح 'میدان عمل' کو ہندی ترجمے میں تبدیل کر دینے کا ارادہ تھا، لیکن بعد میں انھوں نے اردو سے ترجمہ کر دینے پر اکتفا کرلی۔ جو کچھ بھی ہو۔ ان یادداشتوں کی تاریخی اہمیت ہے۔ ذیل میں اقتباس ملاحظہ ہو :

Two aspects—an unhappy married life due to difference in outlook and mentality. There is enthusiasm, sacrifice, devotion but also a longing, an earning for love. The heart is not awakened. There is no spiritual awakening., Wife's sacrifice creats love. Spiritual awakening also comes. The whole outlook changed. The whole atmosphere is purified.

A youth punished for transportation is a political murder trial. His Vitrethed (Illegible) and father both are transformed. When he returns he finds them ready to welcome him. All fear vanished.

The details should be worked out—160 Pages—First Chapter—The trial and punishment. Price 12.

Second-The Vitrethed (Illegible) girl was present at the court. She proposes to remain with the father of her fiance., Her fiance farewell later.

Third—The father subscribes secretly to the fund of the political party and is ready to help in every way.

Fourth—The secret is divulged by one of the party. The police threaten the father but he is adamant. His daughter-in-law encourages him.

Fifth—The daughter-in-law attends a political meeting and is vociferously cheered. She is elected President of the Congress Committee.

Six—Lahore Congress. She attends and delivers a speech at Lahore. The resolution for Independance. She supports it in an excellent speech.

Seventh—The ratification. Her efforts to from a Lady Workers' Union successful. ....

[دو پہلو ــــ ذہنیت اور نظریے کے اختلاف کی بنا پر ناخوش گوار ازدواجی زندگی۔

ولولہ، ایثار، ریاضت لیکن محبت کے رشتے میں منسلک کرنے کی آرزو بھی ہے۔ قلب بیدار نہیں ہے۔ اسی طرح روحانی بیداری مفقود ہے۔ اہلیہ کے ایثار کی بنا پر محبت پیدا ہوتی ہے۔ روحانی بیداری بھی ہوتی ہے۔ تمام نظریات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ تمام ماحول پاکیزہ ہو جاتا ہے۔

نوجوان کو کسی سیاسی قتل کے مقدمہ میں سزائے دوام ہوئی۔ اس کے... (کذا) اور باپ دونوں کی قلب ماہیئت ہوتی ہے۔ جب وہ واپس ہوتا ہے تو انھیں اس کے استقبال کے لیے تیار پاتا ہے۔ تمام اندیشوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔

تفصیلات کا اندازہ کر لیا جائے۔ ۱۶۰ صفحات۔

پہلا باب۔ مقدمہ اور سزا قیمت ۱۲

دوسرا۔ ... (کذا) لڑکی عدالت میں موجود تھی۔ وہ تجویز کرتی ہے کہ اس کو اس کے منگیتر کے باپ کے ساتھ رہنے دیا جائے۔ اس کا منگیتر بعد کو رخصت ہوتا ہے۔

تیسرا ــــ باپ خفیہ طریقے سے سیاسی پارٹی کو چندہ دیتا ہے اور ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہے۔

چوتھا ــــ یہ راز پارٹی کے ایک فرد نے افشا کر دیا۔ پولیس باپ کو ڈراتی دھمکاتی ہے لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس کی بہو اس کو ہمت دلاتی ہے۔

پانچواں ــــ بہو ایک سیاسی میٹنگ میں شرکت کرتی ہے اور اس کی زبردست تحسین ہوتی ہے۔ وہ کانگریس کمیٹی کی صدر منتخب ہو جاتی ہے۔

چھٹواں ــــ لاہور کانگریس۔ وہ لاہور میں شرکت اور تقریر کرتی ہے۔ آزادی کی تجویز۔ وہ اس کی تائید میں شاندار تقریر کرتی ہے۔

ساتواں ــــ توثیق۔ اس کی کوششیں انجمن خواتین رضا کار کی تشکیل میں سرسبز ہوتی ہیں .....]

اردو میں 'میدان عمل'، کئی اعتبار سے اہم ناول قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین[1]

[1] سید اعجاز حسین: نئے ادبی رجحانات ص ۲۰۹

اور پروفیسر آل احمد سرور[۵۱] اسے پریم چند کے کامیاب ترین ناولوں میں شمار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل کو 'میدان عمل' میں "وطن پرستی کی بو" اور "سماج کو بدلنے کا جذبہ" نظر آتا ہے۔[۵۲] ڈاکٹر قمر رئیس کے نزدیک اس ناول سے پریم چند کی فکر نئی منزل کی طرف بڑھتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: "وہ مہاتما گاندھی کی عوام دوستی اور ان کی اعلا قومی جذبات کے اب بھی معترف تھے لیکن ان کا ذہنی نشو و نما اب گاندھی واد کی گرفت سے آزادی حاصل کر رہا تھا اور وہ اسے تنقیدی نظر سے دیکھنے لگے تھے"[۵۳] اس میں شبہ نہیں کہ 'گوشۂ عافیت' اور 'چوگان ہستی' کے بعد 'میدان عمل' میں پریم چند نے اس طبقاتی تصورات کے تجزیے کو موضوع قرار دیا ہے جس میں قومی تحریک کے بیشتر رہنما شعوری یا غیر شعوری طور پر گرفتار تھے۔ لیکن اس وقت تک پریم چند کو گاندھیائی تصورات سے آزادی نہیں حاصل ہو سکی تھی۔ 'میدان عمل' کا مثالی کردار امر کانت نہ صرف گاندھیت کا پرستار ہے بلکہ بغاوت و جد و جہد کی راہ پر گامزن عوام کو رجعت پسندانہ طریق کار سے روکتا ہے کیوں کہ اسے اندیشہ ہے کہ اس طرح وہ عدم تشدد کے تصورات سے الگ ہو جائیں گے۔ پریم چند نے نہ صرف مندروں میں اچھوتوں کے داخلے، شراب نوشی کی مخالفت اور تعلیم کے فروغ میں گاندھیائی زاویۂ نظر پیش کیا ہے بلکہ کالے خاں کی قلب ماہیت بھی کر دی ہے۔ ڈاکٹر سعید عارفی نے درست لکھا ہے: "اس ناول کا پس منظر مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں ۱۹۳۰ء کی تحریک آزادی سے متعلق ہے، جس میں ملک کے مختلف طبقوں اور فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کے دوش بدوش شریک تھے"۔[۵۴] ڈاکٹر شمیم نکہت لکھتی ہیں: "میدان عمل پریم چند کے ان ناولوں میں ہے جس میں انھوں نے عورت کو صحیح معنوں میں ایک سماجی و سیاسی کارکن کی حیثیت سے پیش کیا ہے"۔[۵۵]
پریم چند نے 'میدان عمل' میں تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کی ہے اور پس ماندہ افراد کے مسائل کا تجزیہ شہری پس منظر سے شروع کیا ہے لیکن رفتہ رفتہ ان کا دائرۂ عمل وسیع تر ہو گیا ہے اور اس ناول میں فنی و تخلیقی معیاروں پر بلندیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ دراصل 'میدان عمل' کے

---

۵۱ آل احمد سرور: نظر اور نظریے ص۵۷
۵۲ سید محمد عقیل: تنقید اور عصری آگہی ص۲۹۵
۵۳ قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص۳۸۶
۵۴ سعید عارفی: پریم چند اپنے عہد کے آئینے میں ص۲۶۴ (قلمی)
۵۵ شمیم نکہت: پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار ص۲۰۹

بغیر 'گئودان' کا تصور نہیں کیا جا سکتا!

ہندی میں 'کرم بھومی' کو "ایک بڑی کرتی" [۵۱] اور "مہان گرنتھ" [۵۲] قرار دیا گیا ہے لیکن اس کو اردو کے 'میدان عمل' کی طرح کی شہرت و مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ اس کا سبب دونوں زبانوں کے روایات، مزاج و کردار اور اسالیب بیان کا اختلاف ہے۔ ہندی میں 'گئودان' کے بعد کامیاب ترین ناول 'کرم بھومی' کے بجائے 'رنگ بھومی' شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ بقول ڈاکٹر کمل کشور گوئینکا: "کرم بھومی میں سورداس کے سمان کوئی دیرچرتر تو نہیں ہے۔" [۵۳]

'میدان عمل' اور 'کرم بھومی' کے تقابلی مطالعے میں متعدد اہم اور معنی خیز پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان میں چند پہلوؤں کی نشان دہی ذیل میں کی جاتی ہے:

ا۔ 'میدان عمل' کا اسلوب بیان 'کرم بھومی' کے مقابلے میں زیادہ ادبی و فنی مہارت کا مظہر ہے۔ اس کی اردو علامتوں، تشبیہوں، استعاروں اور صنائع بدائع سے مزین ہے۔ مثلاً:

"نفس کشی کی جگہ نفوس پروری، نرمی کی جگہ تندی، انکساری کی جگہ خود پروری، نزاکت کی جگہ جسارت کا اسے خوگر بنا دیا تھا۔" [۵۴]

اس کے ہندی ترجمے میں اردو کی طرح مرصع عبارت آرائی ممکن نہ ہوئی اور مترجم نے سادہ انداز میں مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی:

"تیاگ کی جگہ بھوگ، شیل کی جگہ تیج، کومل کی جگہ تیور کا سنسکار کر لیا تھا" [۵۵]

اسی طرح ایک دوسری جگہ اردو میں ہے:

"پانچ چھ مہینے میں وہ تکلفات کا دشمن، سادہ زندگی کا قصیدہ گو، اچھا

---

[۵۱] نند دلارے باجپئی: پریم چند ساہتک وویچن ص ۱۹

[۵۲] اندرناتھ مدان: پریم چند ایک وویچن ص ۱۵

[۵۳] کمل کشور گوئینکا: پریم چند کے اپنیاسوں کا شلپ ودھان ص ۴۲۵

[۵۴] پریم چند: میدان عمل ص ۲۹

[۵۵] پریم چند: کرم بھومی ص ۳۵

خاصا رئیس زادہ بن بیٹھا۔" ۵۱

ہندی میں 'قصیدہ گو' کے ترجمے کی معذوری واضح ہوگئی:

"پانچ ہی چھ مہینے میں وہ ولاستا کا دروہی، وہ سرل جیون کا اپاسک اچھا خاصہ رئیس زادہ بن بیٹھا۔" ۵۲

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"پروفیسروں کو یقین تھا کہ اسے امتیاز ملے گا۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ زندگی کی تکمیل کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے، ڈگری کی نہیں۔ ہمارا اخلاق، ہماری سیرت، ہمارا لطف حیات، ہمارا جوش عمل، اگر یہ ڈگری نہیں ملی، اگر ہمارا ضمیر بیدار نہیں ہوا، تو حروف تہجی کے دم چھلے بے سود ہیں۔" ۵۳

ہندی میں پروفیسروں کو 'ادھیاپکوں'، امتیاز کو 'چھاترورتی' اور 'تکمیل' کو 'سپھل' کردیا ہے۔ اس سے مترجم کی بوالعجبی واضح ہوگئی ہے:

"ادھیاپک کو وشواس تھا، اسے چھاترورت ملے گی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر شانتی کمار نے بھی اسے بہت سمجھایا، پر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ جیون کو سپھل بنانے کے لیے شکچھا کی ضرورت ہے ڈگری کی نہیں۔ ہماری ڈگری ہے ہمارا سیوا بھاؤ، ہماری نمرتا، ہمارے جیون کی سرتا۔ اگر یہ ڈگری نہیں ملی، اگر ہماری آتما جاگرت نہیں ہوئی تو کاغذ کی ڈگری ویرتھ ہے" ۵۴

۲۔ بعض مقامات پر مترجم نے اصل عبارت کے مقابلے میں اختصار سے کام لیا ہے، مثلاً:

"کالے خاں کی قربانی امرکانت کی زندگی کا شیرازہ بن گئی، اس میں ترتیب نہ تھی، ہمواری تھی، استحکام نہ تھا، فوری تغیرات کے جھونکے اس کے خیالوں کو پریشان کرتے رہتے تھے اس شیرازے نے اس میں توازن اور مطابقت پیدا کردی۔" ۵۵

اس کا ترجمہ یہ کیا گیا:

---

۵۱ پریم چند: کرم بھومی ص۱۰۸

۵۲ ایضاً: میدان عمل ص۲۲۳

"کالے خاں کے آتم سمرپن نے امرکانت کے جیون کو جیسے کوئی آدھار پردان کر دیا اب تک اس کے جیون کا کوئی لکچھ نہ تھا، کوئی آدرش نہ تھا، کوئی برت نہ تھا۔ اس مرتیو نے اس کی آتما میں پرکاش سا ڈال دیا۔" ۵۱

اس اختصار کا سبب اردو کو ہندی قالب عطا کرنے میں ترجمے کے بجائے مفہوم کی ادائیگی کا رجحان ہے:

"کبھی لہروں کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی، کبھی ہوا کے جھونکوں سے پیچھے ہٹتی ہوئی اور کبھی بھنور میں پڑ کر چکر کھاتی ہوئی" ۵۲

"... کبھی لہروں کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا۔ اس میں استھرتا نہ تھی، سنیم نہ تھا، اچھا نہ تھی" ۵۳

۳۔ بعض مقامات پر ادبی و تخلیقی معیاروں پہ اردو اور ہندی کی عبارتوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اگر ایک طرف عربی و فارسی کے الفاظ و روایات ہیں تو دوسری طرف شدھ ہندی یا سنسکرت کے، مثلاً:

"شادی اور دیگر مجلسی قیود کے مخالف، آزاد محبت کے مداح، بہت ہی خوش مزاج خوش گفتار، بے لوث آدمی تھے۔ اپنی تجرد کی زندگی کو ہنسی مذاق میں بہلاتے رہتے تھے۔ طلبہ سے دوستانہ برتاؤ تھا۔ سیاسی تحریکوں میں شریک ہوتے تھے مگر خفیہ طور پر کھلے میدان میں نہ آتے تھے" ۵۴

اس کا یہ ترجمہ کیا گیا:

"وواہ کے کٹر ورودھی، سوتنترتا پریم کے کٹر بھگت، بہت ہی پرسن مکھ،

---

۵۱ پریم چند: کرم بھومی ص ۳۶۸

۵۲ ایضاً: میدان عمل ص ۴۴۲

۵۳ ایضاً: کرم بھومی ص ۳۶۸

۵۴ ایضاً: میدان عمل ص ۳۱

سہردے، سیوا شیل و بیکتی تھے۔ مذاق کا کوئی اوسر پاکر نہ چوکتے تھے۔
چھاتروں سے متر بھاؤ رکھتے تھے۔ راج نیتک آندولنوں میں خوب
بھاگ لیتے تھے اور گپت روپ سے۔ ہاں میدان میں نہ آتے تھے سماجک
چھیتر میں خوب گرجتے تھے" ۵۱

۴۔ بعض مقامات پر اردو اور ہندی عبارت میں زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ترجمہ بھی اصل کی طرح جاذب نظر ہے، مثلاً:

" جو چاہو بناؤ مگر اتنا یاد رکھو کہ میں ہندو ہوں اور پرانے زمانے کا
آدمی ہوں۔ ابھی تک چھوت چھات مانے جاتا ہوں" ۵۲

اس کا ہندی ترجمہ یہ کیا گیا:

" جو کچھ بناؤ پر اتنا یاد رکھو کہ میں ہندو ہوں اور پرانے زمانے کا آدمی
ہوں ابھی تک چھو چھات کو مانتا ہوں" ۵۳

دوسری مثال ملاحظہ ہو:

" امرکانت پر فالج گر گیا۔ بجلی گر پڑی" ۵۴

اس کا ترجمہ بھی پرتاثیر ہے:

" امر پر فالج گر گیا، پہاڑ ٹوٹ پڑا، برج پات ہو گیا" ۵۵

۵۔ زیر نظر ناول پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ۱۸ (اٹھارہ) دوسرے میں ۷ (سات) اور تیسرے میں ۱۳ (تیرہ) چوتھے میں ۸ (آٹھ) اور پانچویں میں ۱۰ (دس) اجزا ہیں۔ یہ تقسیم اردو اور ہندی دونوں میں یکساں ہے۔

۶۔ 'میدان عمل' کے ہندی ایڈیشن 'کرم بھومی' میں اردو الفاظ کا استعمال کثرت

---

۵۱ پریم چند: کرم بھومی ص ۲۷

۵۲ ایضاً: میدان عمل ص ۲۱۲

۵۳ ایضاً: کرم بھومی ص ۳۴۳

۵۴ ایضاً: میدان عمل ص ۱۵۵

۵۵ ایضاً: کرم بھومی ص ۱۳۰

سے ہوا۔ مثلاً رقیب، شیرینی، جلاوطن، مفسر، شگفتہ، بدخواہ، توفیق وغیرہ یہی نہیں بلکہ ایک مقام پر انا للہ وانا الیہ راجعون بھی برقرار رہے!

پریم چند کا ہندی مترجم اردو سے اچھی طرح واقف ہے لیکن ہندی میں اس کی رسائی محدود ہے، اس لیے اردو الفاظ کے ہندی متبادل پیش کرنے میں فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، جن سے مفہوم تبدیل ہوگیا ہے اور کہیں کہیں عبارت کو سنسکرت آمیز بنانے کے شوق بیجا میں پریم چند کے اسلوب پر کند چھری پھیر دی گئی ہے۔ 'میدان عمل' میں عام بول چال کے مستعمل الفاظ و تراکیب تک کا ترجمہ کرنے کی سعی نامشکور نظر آتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کمانا: اپارجن، دل بستگی: گھنشٹھتا، اعتراض: گھرنا خودغرضی: لوبھ قربانی: آتم سمرپن، کارپرداز: اُددھوگی، مصلحت اندیشی: کوٹ نیتی، قوت بازو: پرشرم اصول پروری کا زعم: دھرم کا گھمنڈ، یونی ورسٹی: ودیالیے، مردانہ احساس: پردش کلپنا مکروہات: سعارتھ، تنگ دل: دمبھ، تکلف: ولاس، وغیرہ وغیرہ

مجموعی اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ میدان عمل کی زبان اور اسلوب، کرم بھومی کے مقابلے میں زیادہ پرتاثیر ہے اور اس میں اردو کا مزاج و روایات اور رنگ و آہنگ واضح طور پر نظر آتا ہے۔

گئودان: گودان

پریم چند کے ناولوں میں 'گئودان' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اسے اردو ادب میں عرصے تک ناقابل تسخیر قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں: "یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس منزل پر پریم چند نے ناول کو چھوڑا تھا، اس کے آگے ناول نگاری کا کارواں نہ بڑھ سکا۔" [۵۱] پروفیسر سید احتشام حسین کا خیال ہے: "گئودان، اردو ناول کی تاریخ میں ایک ایسی منزل ہے جہاں صرف پریم چند پہنچے اور وہ

---

[۵۱] سید اعجاز حسین: نئے ادبی رجحانات صفحہ ۲۹۰

بھی صرف ایک بار! یہ ناول ان کے فنی ارتقار کا نقطۂ عروج ہے شاید ان کا فن ابھی اور آگے بڑھتا لیکن موت نے راہ کھوٹی کردی کیوں کہ جس سال 'گئودان' پہلی دفعہ شائع ہوا اسی سال ان کا انتقال ہوگیا۔'' [۱]

پروفیسر آل احمد سرور[۲] اور علی سردار جعفری[۳] اسے اردو کا بہترین ناول قرار دیتے ہیں۔ عزیز احمد کے خیال میں پریم چند نے ارتقائی منزلوں کی ایسی بلندیاں حاصل کرلی ہیں، جن تک دوسرے ناول نگاروں کی رسائی نہیں ہوسکتی[۴] اسی طرح کے خیالات ہندی ادب کے مورخین اور ناقدین نے بھی ظاہر کیے ہیں۔ 'گئودان'، اردو اور ہندی میں یکساں طور پر مقبول ترین ناول قرار دیا گیا ہے لیکن یہی پریم چند کے تمام ناولوں میں سب سے زیادہ متنازع فیہ بھی رہا ہے۔ اس کے ناقدوں نے اسے مختلف و متضاد معیاروں پر دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ کسی کے خیال میں 'گئودان'، ہندوستانی کسان کا گئودان ہے۔ کوئی اسے ہندوستانی دیہی اور شہری تہذیبوں کے تصادم و جدوجہد کی داستان قرار دیتا ہے۔ کوئی اس کے معیاروں پر شہری اور دیہی زندگی کا تقابلی مطالعہ کرتا ہے تو کوئی 'گئودان'، میں پریم چند کے غیر معمولی عزم اور قوت عمل کا احساس کرتا ہے۔ ایک حلقے کے خیال میں 'گئودان'، سماجی زندگی کا نقیب ہے۔ دوسرا حلقہ اس کو سماجی نقیب قرار دینے پر معترض ہوتا ہے اور طنزاً کہتا ہے — بھلا کسان بھی انقلاب لا سکتا ہے! کسان اپنی روایتوں، دھرم اور آتما پرماتما کا پابند ہوتا ہے اس کو سست رفتاری کے ساتھ زندگی گزارنے میں لطف حاصل ہوتا ہے۔

پریم چند نے 'گئودان' کی تصنیف کس زمانے میں کی اور اس کا اصل مسودہ اردو میں تیار کیا گیا یا ہندی میں، اس مسئلے پر مختلف و متضاد خیالات ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان سطور میں بعض حقائق کی نشان دہی کی جائے گی جن کی روشنی میں 'گئودان'، کے مطالعے میں صحیح نتائج تک رسائی ہوسکتی ہے۔ امرت رائے کا قول ہے: '' پتروں کے آدھار پر

---

[۱] احتشام حسین: افکار و مسائل ص۱۱۱

[۲] آل احمد سرور: تنقیدی اشارے ص۲۱

[۳] علی سردار جعفری: ترقی پسند ادب ص۱۳۲

[۴] عزیز احمد: ترقی پسند ادب ص۲۴۶

اس کا لکھنا ۱۹۳۲ء ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ پر 'ہنس' اور 'جاگرن' کی اب تک کی کٹھنائیوں اور بعد کو سال بھر کے بمبئی پرواس کے کارن اس کی گتی بہت دھیمی رہی پستک کا پرکاشن جون ۱۹۳۶ء میں ہوا"۔[۵۱] اس بیان سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ پریم چند نے ۱۹۳۲ء میں 'گئودان' کی تصنیف شروع کی۔

۲۔ 'ہنس' اور 'جاگرن' کی مالی دقتیں پریم چند کی تصنیف وتالیف کی راہ میں حائل ہوتی رہیں۔

۳۔ پریم چند کا قیام بمبئی ان کی تصنیف وتالیف میں مخل ہوا۔

۴۔ 'گئودان' کی اشاعت ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

امرت رائے کے متذکرہ بالا قول کی بنیاد منشی دیا نرائن نگم کے نام پریم چند کا ۲۵ر فروری ۱۹۳۲ کا مکتوب ہے جس میں انھوں نے ایک نئے ناول کے لکھنے کا ذکر کیا ہے! "اِدھر ایک نیا ناول بھی شروع کر دیا ہے"[۵۲] یقینی ہے کہ 'میدان عمل' کے بعد پریم چند نے "گئودان' ہی لکھا۔ اس لیے یہ اندازہ کرنا غلط نہ ہوگا کہ پریم چند نے متذکرہ بالا خط میں 'گئودان' کی تصنیف کا ذکر کیا ہے۔

۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان پریم چند کی زندگی جد وجہد سے عبارت ہے! 'ہنس' کی اشاعت میں مسلسل نقصان کے باوجود 'جاگرن' کی اشاعت کے وقت انھوں نے ۱۵ر اگست ۱۹۳۲ء کے مکتوب میں 'ہنس' پر قانونی حملے کا ذکر کیا ہے: "ہنس پر ضمانت لگی۔ میں سمجھا تھا آرڈیننس کے ساتھ ضمانت بھی سماپت ہوجائے گی، پر نیا آرڈیننس آگیا اور اسی کے ساتھ ضمانت بھی بحال کردی گئی۔"[۵۳] اور بمبئی کے قیام کا مقصد بھی مالی دقتوں سے نجات پانا تھا ۳۰ر اپریل ۱۹۳۴ کو جینند کمار کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے۔ وے تن کی بات نہیں، کنٹریکٹ کی بات ہے =/۸۰۰۰ روپے سال۔ میں اُس اوستھا کو پہنچ گیا ہوں، جب

---

[۵۱] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص۲۵۸

[۵۲] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص۱۹۲

[۵۳] ایضاً: ج ۲ ص۲۶

میرے لیے ہاں کے سوا کوئی اُپائے نہیں رہ گیا کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے اپنیاس کو بازار میں بیچوں۔" ۵۱ لیکن بمبئی میں ان کو زندگی کے تلخ تجربے ہوئے، جن سے پریم چند بددل بھی ہوئے، وہیں سے ۲۸ نومبر ۱۹۳۴ء کو جینندر کمار کو لکھتے ہیں: "یہ سال تو پورا کرنا ہے ہی۔ قرض دار ہوگیا تھا۔ قرضہ پٹا دوں گا مگر اور کوئی لابھ نہیں۔ ادھ اپنیاس کے انتم پرشٹ لکھنے باقی ہیں۔ اُدھر من ہی نہیں جاتا۔ یہاں سے چھٹی پاکر اپنے پرانے اڈے میں جا بیٹھوں وہاں دھن نہیں ہے مگر سنتوش اوشیہ ہے۔ یہاں تو جان پڑتا ہے کہ جیون نشٹ کر رہا ہوں" ۵۲ بمبئی کے قیام میں کیا حاصل کیا، اس کی تفصیل بھی پریم چند کی زبان سے ملاحظہ ہو: ۱۴ مئی ۱۹۳۵ کو جینندر کمار کو لکھتے ہیں: "بمبئی سے کیا لایا؟ کل ۶۳۰۰ روپے ملے اس میں ۱۵۰۰ لڑکوں نے لیے ۴۰۰ لڑکی نے ۵۰۰ پریس نے دس مہینے بمبئی کا خرچ بڑی کفایت سے بھی ۲۵۰۰ روپے سے کم نہ ہو سکا۔ وہاں سے کل ۱۴۰۰ روپے لے کر اپنا سا منھ لیے چلے آئے۔" ۵۳

'گئودان' کے پلاٹ کا مرکزی نقطہ بھی قرض میں گرفتار ہو کر استحصال کی مختلف منزلوں سے گزرا ہے۔ ایک نظر سے دیکھا جائے تو یہ استحصال ہونے والوں اور استحصال کرنے والوں کی کہانی ہے۔ پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں: "گئودان اس زمانے کا ناول ہے، جب دیہاتی اپنے دکھوں سے تھک ہار کر سکون کی کھوج میں شہر آنے لگے تھے۔ الکشن اور ممبری کا چرچا سب سے بڑی سیاسی بات تھی۔ جب مل کھل رہے تھے اور سرمایہ دار کو غریبوں کا خون چوسنے کا نیا شکنجہ ہاتھ لگا تھا اس ناول میں ان حالات کی پیدا کی ہوئی ساری فضا کا جو اثر دیہات اور شہر پر پڑ رہا تھا۔ اس کا عکس ہے اس کے علاوہ دیہاتی سماج کے ہر چھوٹے بڑے پہلو کی تفصیل بھی ہے۔" ۵۴ ہوری کو پریم چند نے اپنا مثالی کردار بنایا تھا تین چار بیگھہ زمین اور پھول کی تھالی اس کا اثاثہ ہے پھٹے پرانے کپڑے پہنتا ہے ایک پھٹا پرانا کمبل ہے جو بزرگوں کے زمانے سے جاڑا کاٹنے کا سہارا ہے۔ اس کا استحصال

---

۵۱ پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص۲۷
۵۲ ایضاً ص۵۲
۵۳ ایضاً ص۵۹
۵۴ وقار عظیم: داستان سے افسانے تک ص۱۰۷

کرنے والی طاقتیں ہیں ـــــ زمیندار، کارندے، مہاجن، پولیس، برادری اور پنچ کے لوگ۔ ہوری کی محرومیوں میں پریم چند کی ذاتی زندگی منعکس ہوتی ہے۔ وہ مسلسل تگ و دو میں لگا ہے۔ مختلف ذرائع سے حالات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے، سر سے پاؤں تک قرض کے بوجھ میں دبا ہے لیکن اپنی تمناؤں کی تکمیل کے لیے مزید قرض لیتا ہے، یہی قرض پاؤں کی بیڑی بن جاتا ہے، ذلت و رسوائی کا سامنا ہے لیکن وہ سراب کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں: ”پریم چند کے فن کا کمال یہ ہے کہ اس میں وہ کسی مثالی نوجوان کے بجائے گاؤں کے ایک ادنیٰ بوڑھے کسان کو ہیرو بناتے ہیں۔“[۱] ڈاکٹر سید علی حیدر کا خیال ہے: ”گئودان میں ہوری تنہا نظر آتا ہے حالاں کہ اس کے قبل پریم چند کا کسان کبھی اکیلا نہیں رہا تھا۔“[۲] یہی ادنیٰ، بوڑھا اور تنہا ہوری پریم چند کی علامت ہے! اس ناول میں طبقاتی نظام کی کشمکش واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ایک طرف خوش حالی، عیش و عشرت اور عزت و تکریم ہے دوسری طرف ناداری، مفلسی، فاقہ اور جہالت و ذلت ہے۔ اسے پریم چند نے ذاتی سطح پر محسوس کیا تھا اور قیام بمبئی کے تلخ تجربات نے استحصال کی مختلف و متضاد کیفیتوں سے روشناس کر دیا تھا۔ اس لیے انھوں نے 'گئودان' کی تکمیل شروع کی تو شہری اور دیہاتی زندگی کے تصادم کی داستان گذشتہ ناولوں سے زیادہ پر اثر انداز میں میں سامنے آتی ہے۔ امرت رائے لکھتے ہیں: ”گودان ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ بمبئی سے لوٹ کر منشی جی اسی میں جی جان سے جٹ گئے اور اس کو پورا کر کے ہی قلم چھوڑا۔“[۳] ایک دلچسپ بات ہے کہ ”گئودان“ کی تصنیف کے زمانے میں پریم چند بنارس سے عاجز تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے الٰہ آباد میں آباد ہونا چاہتے تھے ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو جینندر کمار کو لکھتے ہیں: ”میں نے ارادہ کیا ہے کہ جون میں 'ہنس' کو اور پریس کو پریاگ لاؤں اور خود بھی یہیں رہوں۔ کاشی میں نہ تو کام ہے اور نہ ساہتہ کاروں کا سہیوگ۔ وہاں جتنے ہیں، وہ سبھی سمراٹ ہیں۔ کوئی کوی سمراٹ، کوئی آلوچنا سمراٹ، کوئی پرہنس سمراٹ۔ یہ گورو تو کاشی ہی کو ہے کہ وہاں سبھی سمراٹ موجود ہیں۔ مگر

۱؎ قمر رئیس: پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ص۲۲۲

۲؎ سید علی حیدر: اردو ناول سمت و رفتار ص۱۴۵

۳؎ امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص۵۹۷

سمراٹوں کی سمراٹوں سے پٹے گی؟ ششٹاچار کی بات اور ہے، ہاردک سہیوگ کی بات اور۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں تم بھی سال چھ مہینے میں سمراٹ ہوجاؤ تو میرا کام ہی تمام ہوجائے۔ پھر تم سے کوئی لیکھ مانگنے کا ساہس بھی نہ کرسکوں۔ اس لیے اب پریاگ آرہا ہوں، جہاں سمراٹ کم ہیں!" [۵۱]

'گئودان'، کے زمانہ تصنیف کے تعین میں پریم چند کے ۱۷ دسمبر ۱۹۳۵ء کے انگریزی مکتوب کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "ان دنوں میں اپنے اپنیاس میں مصروف ہوں، جسے تین سال ہوئے شروع کیا تھا۔ مگر دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے ختم نہ کرسکا۔" [۵۲]

'گئودان'، کا تصنیفی کام ۱۹۳۵ء کے اواخر یا ۱۹۳۶ء کے اوائل میں ختم ہوا۔ یہ ناول بھی پریم چند کے گذشتہ ناولوں کی طرح اردو کے قبل ہندی میں 'گودان'، کے نام سے سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا اور ۱۰ جون ۱۹۳۶ء کو منظر عام پر آیا۔ اس کی تائید ۹ جون ۱۹۳۶ء کے ایک مکتوب سے ہوتی ہے، جس میں پریم چند نے اوشا دیوی مترا کو لکھا: "گودان پورا چھپ گیا۔ بائنڈنگ ہونے پر بھیجوں گا۔" [۵۳] اس کے دوسرے دن پریم چند نے جینندر کمار کو بھی اطلاع دی: "گودان نکل گیا۔ تمھارے پاس جائے گا۔ خوب موٹا ہوگیا ہے ۶۰۰ سے (اوپر) گیا ہے۔ وچار لکھنا۔" [۵۴]

'گئودان'، کی پہلی اشاعت کے تعین میں منشی دیا نرائن نگم کے بیان سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، موصوف لکھتے ہیں: "۱۹۳۶ء میں آپ کا (پریم چند کا) آخری ناول 'گئودان' بھی سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار جلدیں بک چکیں اور پہلا ایڈیشن قریب اختتام ہے۔" [۵۵] یہاں جس ناول کا ذکر کیا گیا ہے، وہ 'گئودان' نہیں بلکہ 'گودان'، ہے کیوں کہ 'گئودان'، پریم چند کی وفات کے ایک سال بعد ۱۹۳۷ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے

---

[۵۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص۵۶

[۵۲] ایضاً ص۲۶۴

[۵۳] ایضاً ص۲۰۰

[۵۴] ایضاً ص۶۲

[۵۵] دیا نرائن نگم: پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات، زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

شائع ہوا۔ اردو نام کو فوقیت دینے کا سبب، اس کے اردو ناول ہونے کی بنا پر ہے۔ اس کا تجزیہ مناسب جگہ پر ہوگا۔

مخطوطات

'گئودان'، کے اردو مسودے کے متعلق پریم چند کے دونوں صاحبزادگان شری پت رائے اور امرت رائے لاعلمی ظاہر کرتے ہیں اس کے ناشرین مکتبہ جامعہ دہلی کے منتظمین کا بیان میدان عمل کے سلسلے میں پیش کیا جا چکا ہے۔ وہ لوگ وہی بیان 'گئودان' کے لیے بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن منشی دیریندر پرشاد سکسینہ کا قیاس ہے کہ 'گئودان'، کا مسودہ سحر کے خاندان والوں کے پاس محفوظ ہے۔ [1] راقم السطور نے مختلف ذرائع سے اردو مخطوطے کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوششیں کیں لیکن اس کا کسی جگہ سراغ نہ مل سکا۔ ہمارے نزدیک مکتبہ جامعہ کے منتظمین کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے 'گئودان'، کا اردو مسودہ امتداد زمانہ کا شکار ہو چکا ہے، اب اس کے حاصل ہونے کی توقع نہیں ہے۔

ہندی میں 'گو دان'، کے دو مخطوطے بھارت کلا بھون، بنارس ہندو یونی ورسٹی وارانسی میں محفوظ ہیں۔ ان میں کسی مخطوطے پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن ان کے تقابلی مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ پہلے مخطوطے کی بنیاد پر دوسرا مخطوطہ تیار کیا گیا ہے اس دوسرے مخطوطے سے 'گودان'، پہلی بار ہندی میں شائع ہوا۔ ذیل کی سطروں میں ان مخطوطوں کے بارے میں بعض معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

پہلا مخطوطہ نامکمل ہے۔ موجودہ صورت میں ۳ سے ۲۱۲ تک کے صفحات باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے ابتدائی فقرے یوں ہیں:

> "۔۔۔۔ وینیتا کے اس اتھاہ ساگر میں سہیوگ ہی وہ ندھی تھی، جو اس کے بھیت ہردے میں ترشنا تھا۔ جیسے پکڑے ہوئے وہ وہیں جھکی جاتی تھی۔ آج ان اسنیت شیدوں کے یتھارتھ کے نکٹ ہونے پر بھی مانو جھٹکا دے کر اس کے ہاتھ سے وہ تنکے کا سہارا چھین لیا۔"

---

[1] دیریندر پرشاد سکسینہ: ہماری زبان ۱۵ اردسمبر ۱۹۶۷ء

یہاں ترمیم میں "ندھی تھی جو اُس کے بھیت ہردے میں" کو قلم زد کر دیا ہے اور اب یہ فقرہ اس طرح ہو گیا ہے :

"وپتا کے اس اتھاہ ساگر میں وہ ترشنا تھا۔"

دوسرا باب یوں شروع ہوتا ہے :

"ہوری مالکوں کی ڈیوڑھی پر پہنچا تو آٹھ بج رہے تھے۔ بھون کے سنگھ دوار پر کئی پیادے بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ہوری کو ان سے معلوم ہوا کہ مالک پوجا پر بیٹھ گئے ہیں۔"

یہاں آخری فقرے میں "ہوری کو" قلم زد کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح کہ ترمیم و اصلاح ان گنت جگہوں پر کی گئی ہے۔ کئی مقامات پر پیراگراف کے پیراگراف لکھنے کے بعد کاٹ دیے گئے ہیں۔ ان میں اکثر اصلاحیں اور ترمیمیں تصنیف کے وقت اور بیشتر نظر ثانی کے دوران کی گئی ہیں۔ ان کے تفصیلی اقتباسات پیش کرنا طول امل ہے۔

پریم چند نے دیگر ناولوں کی طرح 'گئودان' کا خاکہ انگریزی میں ہی تیار کیا تھا، جو ناول کے مخطوطے پر درج ہے۔ تین جگہوں پر تین مختلف طرح کی عبارتیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً پہلے باب میں بھولا کے بارے میں مندرجہ ذیل یادداشت درج ہے :

Bhola lending his cow to sell. He has no fodder. Hori gives him the fodder.

[بھولا اپنی گائے بیچنے کی خواہش کرتا ہے۔ اس کے پاس چارہ نہیں ہے۔ ہوری اسے چارہ دیتا ہے]

ایک دوسرے مقام پر دوسرے باب میں کبیر چند کے بیٹوں کا ذکر کرنے کے بعد انگریزی میں یہ عبارت درج ہے :

Hori Zamindar—Preparation for Deshahra going on. Drama and Dhanush Yagya. The Thakur pleads his own helplessness. His son and his two grandsons and granddaughters.

[ہوری زمیندار دسہرا کے لیے تیاری ہو رہی ہے۔ ناٹک اور دھنش یگیہ۔ ٹھاکر اپنی معذوری ظاہر کرتا ہے۔ اس کا بیٹا اور اس کے دو پوتے اور دو پوتیاں]

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر بارہ نکات کی یادداشت ہے، جس میں کرداروں کی خصوصیات پیش کی گئی ہیں۔ ابتدائی چار نکات پیش کیے جاتے ہیں :

1. Hori has two brothers Shobha and Hira. Bhola has two sons Kamta and Jangi and one daughter Jhunia, who is a widow. Hori has one son Gobar and two daughters Sona and Rupa. His wife is Jhinki.
2. Shobha is widower. Hira hardworking but rash and short temper.
3. Hori purchases the cow. The whole village comes to have a look, Shobha is indifferent but Hira grows jealous. He poisons the cow. Hori seen it but cannot report him to the police.
4. The whole village goes to the Zamindar to celebrate Dashahara festival. Hori sells his store of barley. He could not hide his face. He wants to increase his territory. Zamindar must be impressed. The party goes to Zamindar. There is a drama. A show and Dhanush Yagya..........

[۱۔ ہوری کے دو بھائی شوبھا اور ہیرا ہیں۔ بھولا کے دو بیٹے کامتا اور جنگی اور ایک بیٹی جھُنیا ہے، جو بیوہ ہے۔ ہوری کے ایک بیٹا گوبر اور دو بیٹیاں سونا اور روپا ہیں۔ جھنکی اُس کی بیوی ہے۔

۲۔ شوبھا رنڈوا ہے۔ ہیرا محنتی، جلد باز اور چڑچڑا ہے۔

۳۔ ہوری گائے خریدتا ہے۔ پورا گاؤں اُسے دیکھنے آتا ہے۔ شوبھا بے نیاز ہے۔ لیکن ہیرا کے دل میں جذبۂ حسد پیدا ہوتا ہے۔ وہ گائے کو زہر دے دیتا ہے۔ ہوری اسے دیکھتا ہے لیکن پولیس کو اطلاع نہیں کرتا۔

۴۔ پورا گاؤں دسہرا منانے کے لیے زمیندار کے گھر جاتا ہے۔ ہوری اپنا جَو کا بکھار بیچ ڈالتا ہے۔ وہ اپنا منہ نہیں چھپا پاتا۔ وہ رقبہ بڑھانا چاہتا ہے۔ زمیندار کو متاثر ہونا چاہیے۔

یہ لوگ زمیندار کے پاس جاتے ہیں وہاں ڈراما ہے۔ ایک منظر اور رقص ہو گیا]

زیر نظر مخطوطہ، ۲۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس مخطوطے اور شائع شدہ 'گؤدان' کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو صدہا ترمیمات اور اضافے نظر آ سکتے ہیں۔

دوسرا مخطوطہ مکمل ہے۔ اس مخطوطے میں بھی مختلف مقامات پر پہلے مخطوطے کی طرح ترمیمیں اور اضافے ہیں۔ پیراگراف کے پیراگراف قلم زد کر کے دوبارہ لکھے گئے ہیں لیکن بیشتر اصلاحیں معمولی ہیں۔ یہاں مشتے نمونہ از خروارے دو مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔ ایک جگہ مخطوطے میں ہے:

"جس طرح مرد کے مرجانے سے عورت ودھوا ہو جاتی ہے، اناتھ ہو جاتی ہے اُسی طرح عورت کے مرجانے سے مرد کے ہاتھ پاؤں کٹ جاتے ہیں۔"

یہاں "ودھوا ہو جاتی ہے" قلم زد کر دیا گیا ہے۔ یہ عبارت اب اس طرح ملتی ہے:

"جس طرح مرد کے مرجانے سے عورت اناتھ ہو جاتی ہے اُسی طرح عورت کے مرجانے سے مرد کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے ہیں۔"

"ہاتھ پاؤں کٹ جاتے ہیں" کو "ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے" کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اصلاح سے پریم چند کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو:

"جب تم کہو تمھاری اچھا ہو چلو۔"

یہاں پریم چند نے "جب تم کہو" کو اصل مخطوطے میں قلم زد کیا ہے۔ اب یہ فقرہ اس طرح ملتا ہے:

"جب تمھاری اچھا ہو چلو۔"

ہمارے نزدیک صرف ان مخطوطات کی بنیاد پر 'گودان' کو ہندی تخلیق قرار دینا گمراہ کن ہے۔ اس دور میں پریم چند کے اردو سے ہندی میں ترجمے کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ اغلب ہے کہ ان میں ہندی کا پہلا مخطوطہ اردو کے ابتدائی مسودے اور دوسرا مخطوطہ دوسرے مسودے پر مشتمل ہے کیونکہ اس کی مثالیں گذشتہ ناولوں کے تجزیے میں پیش کی جا چکی ہیں کہ ایک بار اردو میں تصنیف ہونے کے بعد ہندی مسودہ کی روشنی میں دوبارہ اردو میں منتقل کیا گیا۔ اس طرح ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے ہوئے سین کے سین بدل جانے کا[لے] اعتراف خود پریم چند نے کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے کا تجزیہ کر لیا جائے۔

لے پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۱۰

گئودان یا گودان

پریم چند ادبیات کے بعض دیگر مباحث کی طرح 'گئودان' کے متعلق غلط فہمیوں کی ابتدا منشی دیا نرائن نگم کے بیانات سے ہوتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں "منشی صاحب کے قریب قریب تمام قصے اور ناول اردو زبان میں منتقل ہو چکے ہیں۔ البتہ ان کا آخری ناول 'گئودان'، جو ان کی وفات کے چند ہی ہفتے پہلے شایع ہوا، ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ہوا ہے۔ مسز پریم چند صاحبہ اور ان کے صاحبزادے عنقریب اردو میں شایع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے ایڈیٹر زمانہ کی معرفت لائق مترجم کی تلاش میں ہیں۔ جو صاحب اس خدمت کو اپنے ذمہ لینا پسند کریں، وہ ایڈیٹر زمانہ کان پور کو اپنی شرائط سے مطلع فرمائیں۔" ۵۱ پریم چند کے "قریب قریب تمام قصے اور ناول اردو میں منتقل' ہونے کی حقیقت اس کتاب کے قارئین پر بخوبی روشن ہے، جس کے اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ 'گئودان'، کے متعلق اس انکشاف کی صداقت معلوم کرنے کے قبل مذکورہ بالا نوٹ کی اگلی سطریں بھی دیکھ لیجیے: "پریم چند کی یادگار میں زمانہ کا جو خاص نمبر شائع ہونے والا ہے، اس کے قریب قریب سب مضامین لکھے جا چکے ہیں صرف دو ایک مضامین کی کتابت باقی ہے۔ اس کا حجم اندازے سے متجاوز ہو گیا ہے اور منشی صاحب کی نجی زندگی اور ادبی کارناموں کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس یادگار نمبر میں نظر انداز ہو گیا ہو۔" ۵۲

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'زمانہ' پریم چند نمبر کی تیاری تک 'گئودان' اردو میں نہیں تھا۔ اس کے لیے ایڈیٹر 'زمانہ' کی معرفت، مترجم کی تلاش تھی لیکن اسی 'زمانہ' پریم چند نمبر میں منشی دیا نرائن نگم کی یہ سطریں بھی ہیں: "۱۹۳۶ء میں آپ کا آخری ناول 'گئودان'، بھی سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوا۔ اس کی دو ہزار کاپیاں بک چکی ہیں۔ پہلا ایڈیشن قریب اختتام ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد ہی شائع ہوگا۔" ۵۳

مذکورہ بالا بیانات میں تضادات نمایاں ہیں۔ ایک طرف مترجم کی تلاش ہے تو دوسری طرف سحر کی امداد سے اشاعت کا اعلان ہے۔ کس بیان پر اعتماد کیا جائے؟! اگر ان بیانات کا تجزیہ کیا جائے تو بعض گوشے اصل حقیقت کی جانب خود بہ خود بالواسطہ غمازی کرنے لگتے ہیں۔ پریم چند کے ہندی ناول کا نام 'گئودان' نہیں 'گودان'، ہے۔ اگر 'گئودان'، 'گودان'، کا ترجمہ ہے تو ترجمے کے قبل 'گئودان' کیونکر وجود میں آگیا۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ ترجمہ کی داستان کے قبل اردو 'گئودان' موجود تھا۔ امرت رائے کے

---

۵۱ دیا نرائن نگم: علمی خبریں اور نوٹ، زمانہ جنوری ۱۹۳۷
۵۲ ایضاً ایضاً ایضاً
۵۳ ایضاً: پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات، زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے راقم السطور سے بیان کیا کہ انھوں نے پریم چند کی حیات میں گئودان کا اردو مسودہ بچشم خود دیکھا تھا، جو بڑے سائز کے کاغذ پر تھا اور پریم چند نے اس کے سرِورق پر سرخ روشنائی سے جلی حروف میں 'گئودان' لکھا تھا۔ منشی نگم کے اعلان کا دوسرا جزو بھی انتہائی مبالغہ آمیز ہے کہ ہندی ناول پریم چند کی وفات کے چند ہی ہفتے پہلے شایع ہوا۔ اس کے ترجمے کا قضیہ آئندہ سطروں میں آئے گا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ منشی دیا نرائن نگم نے بلا وجہ کیوں غلط بیانی کی۔ بات صاف ہے۔ عین ممکن ہے کہ انھوں نے کسی سنی سنائی بات پر بھروسہ کر کے بغیر خود تحقیق کیے، لکھ دیا ہو۔ اس طرح کی ژولیدہ گفتاری، متضاد بیانی اور غلط گوئی موصوف کی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے، جنھیں اردو ہندی کے اکثر و بیشتر محققین کرام معتبر روایت قرار دے کر اسناد کا درجہ عطا کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ انھوں نے محض صحافیانہ انداز میں بعض یادداشتیں قلم بند کر دی ہیں، جو تحقیق و تدقیق کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔[1] بلاشبہ ان

---

[1] پریم چند کے ناولوں کے بارے میں منشی دیا نرائن نگم کے ایک مضمون کے چند بیانات ملاحظہ ہوں:

"ہندی میں ان کا پہلا ناول 'پرتگیا' نامی ہے جو غالباً ۱۹۰۶ء میں لکھا گیا تھا اور جس کا اردو ترجمہ 'بیوہ' کے نام سے ہوا... انھوں نے اپنا دوسرا ناول 'سیوا سدن' لکھا... غالباً ۱۹۱۴ء کی بات ہے... غالباً ۱۹۲۸ء میں آپ نے چوتھا ناول 'رنگ بھومی' لکھا... اب تک جو کچھ لکھتے تھے، اسے پہلے اردو رسم الخط ہی میں لکھتے تھے۔ بعد کو ناگری حروف میں اس کی نقل ہو جاتی تھی لیکن 'رنگ بھوم' ہندی ہی میں لکھا گیا۔"

'زمانہ' پریم چند نمبر ص ۸۹

دوسری جگہ پریم چند کے اردو ہندی ناولوں کی الگ فہرست پیش کی ہے۔ اردو ناولوں میں تنہا بازارِ حسن کو 'سیوا سدن' کا اردو ترجمہ" قرار دیا ہے۔ ہندی ناولوں کی فہرست کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"(۱) سیوا سدن — بازارِ حسن کا ہندی ترجمہ
(۲) پریم آشرم — "
(۳) نروان — "
(۴) پرتگیا — بیوہ کا ہندی ترجمہ جو پہلے प्रेमा نام سے شائع ہوا تھا
(۵) رنگ بھومی (دو جلد)
(۶) غبن
(۷) کرمی بھومی — میدانِ عمل کا ہندی ترجمہ ہے۔" زمانہ پریم چند نمبر ص ۲۵۲

'زمانہ' اکتوبر ۱۹۲۶ء کے 'علمی خبریں اور نوٹ' میں لکھتے ہیں:

"منشی پریم چند کے مشہور و معروف ہندی ناول 'رنگ بھوم' کا اردو ترجمہ 'چوگان ہستی' کے نام سے دارالاشاعت پنجاب میں زیرِ طبع ہے۔ صاحبِ موصوف نے 'پریم آشرم' کے نام سے ایک اور ضخیم افسانہ ہندی میں لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ بھی 'گوشۂ عافیت' کے نام سے ہو گیا ہے اور جلد شائع ہو گا۔"

مدِ نظر رہے کہ پہلے اقتباس میں ایک جگہ ۱۹۰۶ء سے ہندی میں لکھنا، دوسری جگہ ۱۹۱۴ء سے، تیسری جگہ ۱۹۲۸ء سے پھر یہ بھی کہ ۱۹۲۸ء تک اردو رسم خط میں ہی لکھتے تھے۔ جس کی ناگری حروف میں نقل کر لی جاتی تھی۔ دوسرے اقتباسات میں ایک جگہ 'بازارِ حسن' کو اردو ترجمہ، تو دوسری جگہ 'سیوا سدن' کو ہندی ترجمہ قرار دیا ہے اسی طرح 'پرتگیا' کو 'بیوہ' کا ہندی ترجمہ اور 'کرم بھومی' کو 'میدانِ عمل' کا ہندی ترجمہ کہہ دیا ہے۔ تیسرے بیان میں 'چوگان ہستی' اور 'گوشۂ عافیت' کو ہندی ترجمہ قرار دیا ہے۔

کے بیانات پر اعتماد کرنے کی صورت میں ذہن سکندری کہا سکتا ہے!

'گئودان' کے اردو یا ہندی تخلیق ہونے کی بحث کا آغاز علمی و تحقیقی معیاروں پر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پہلی بار ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں 'میرا صفحہ' عنوان سے کیا۔ پھر انھوں نے اسی عنوان کے تحت ۸ مئی اور ۱۵ جون ۱۹۷۱ء کو مزید لکھا اس کے بعد انھوں نے علی گڑھ یونی ورسٹی کے فکشن سیمی نار ۲۷ تا ۲۹ اگست ۱۹۷۱ء میں اپنے فکر انگیز محققانہ مقالے 'گئودان: تصنیف یا ترجمہ' میں فیصلہ صادر کیا: "اردو میں 'گئودان' پریم چند کی اصل تصنیف نہیں، بلکہ ان کے ہندی ناول کا ترجمہ ہے' جسے ایک دوسرے شخص نے کیا۔ 'گئودان' کا اردو ناول نگاری کی تاریخ میں کوئی مقام نہیں۔ اس کو محض ترجمے کی حیثیت سے بہترین ناول نہیں قرار دیا جا سکتا۔"[1] انھوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں چند 'خارجی' اور 'داخلی' شواہد پیش کیے ہیں۔ ذیل میں ان کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے خارجی شواہد میں منشی اقبال ورما سحر ہتگامی کے بیان کو بنیادی اہمیت دی ہے جس میں سحر نے پریم چند کے دیگر اہم ناولوں کے ساتھ ہی ساتھ 'گئودان' کا بھی مترجم ہونے کا دعوا کیا ہے۔ لیکن انھیں اس بیان میں "سحر کی انانیت پر گنجائش" نظر آئی ہے[2]۔ اس کے علاوہ پریم چند کے ان فقروں سے: "ہندی میں سیوا سدن، پریم آشرم، رنگ بھوم، کایا کلپ چاروں ناول دو دو سال کے وقفے کے بعد نکلے۔ ان کے اردو ترجمے عنقریب شائع ہوں گے۔"[3] غلط فہمی پیدا ہوئی کہ "پریم چند کے ان اردو ترجموں کے پس پردہ منشی اقبال بہادر ورما سحر ہتگامی کا ہاتھ رہا ہے"[4]۔ اس تحقیقی مقالے کے قارئین کے لیے اس مفروضے کے تردید کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔ ان تمام ناولوں کے بارے میں تفصیلی بحث گذشتہ صفحات میں ہو چکی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب چار ناولوں (گوشۂ عافیت، چوگان ہستی، نرملا، میدان عمل) کے بارے میں یقینی ہے کہ وہ اردو ناول ہیں تو انھیں بیانات کی روشنی میں 'گئودان' کو اردو ناول کیوں نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس طرح منطقی اعتبار سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی اساسی بحث ہی غیر صحیح ہے۔ لیکن موصوف نے منشی دیا نرائن نگم کے ایک بیان کا حوالہ بھی دیا ہے: "اس کا (گئودان کا) اردو ترجمہ بھی سحر صاحب کی امداد سے جلد شائع ہوگا۔"[5] اس سے اس مفروضہ کو تقویت ملی کہ سحر نے 'گئودان' کی تصنیف یا ترجمہ

۱۔ مسعود حسین خاں: گئودان تصنیف یا ترجمہ، فکر و نظر شمارہ ۲، ۱۹۷۱ء

۲۔ ایضاً ایضاً

۳۔ پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۶۲

۴۔ مسعود حسین خاں: گئودان تصنیف یا ترجمہ، فکر و نظر شمارہ ۲، ۱۹۷۱ء

۵۔ دیا نرائن نگم: پریم چند کی بعض تصانیف کے حالات، زمانہ پریم چند نمبر ۱۹۳۷ء

کیا تھا۔ مدنظر رہے کہ یہاں نگم نے سحر سے ترجمہ کرانے کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ صرف ان کی "امداد" کا حوالہ ہے لیکن اس سے یہ سوالیہ نشان لگ جاتا ہے کہ سحر نے 'گئودان' کی اشاعت میں کس طرح کی مدد کی۔ سحر کا دعوا ملاحظہ ہو: "ابھی ان کا (پریم چند کا) آخری ناول جامعہ ملیہ سے شایع ہو چکا ہے۔ جس کا اردو ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے۔"[1] اس اردو ترجمے کے بارے میں منشی ورِیندر پرشاد سکسینہ کا بیان ہے: "گئودان کا وہ مسودہ جس کا ترجمہ سحر ہتگامی مرحوم نے ہندی سے اردو میں کیا تھا، اس کی منشی پریم چند نے خود نظرثانی کی تھی۔ سحر صاحب کے خاندان والوں سے حاصل کر کے کسی لائبریری میں محفوظ کر لینا چاہیے۔ جس سے 'گئودان' کی اصل حقیقت معلوم ہو جائے۔"[2] سکسینہ نے 'گئودان' کے مسودے کے بارے میں وثوق سے بیان دیا ہے لیکن انھوں نے اپنا ماخذ نہیں ظاہر کیا ہے۔ بر دست اسے ان کے قیاس کی جولاں بیانی قرار دیا جا سکتا ہے ——!

اس بحث میں صحیح حقایق کی رسائی کے لیے پریم چند کے ایک بیان کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ۲۷ فروری ۱۹۳۶ء کو اختر حسین رائے پوری کے نام ایک مکتوب میں 'گئودان' اور 'گودان' دونوں کا ذکر کیا ہے: "میرا ناول 'گودان' ابھی حال میں نکلا ہے۔ اس کی ایک جلد بھیج رہا ہوں۔ اردو میں ریویو کرنا..... اب 'گئودان' کے لیے بھی ایک پبلشر تلاش کر رہا ہوں، مگر اردو میں تو حالت جیسی ہے تم جانتے ہی ہو۔ بہت ہوا تو ایک روپیہ فی صفحہ کوئی دے دے گا۔"[3] اس سے چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

۱۔ پریم چند کی زندگی میں ہندی ناول چھپ گیا تھا، جس کی توثیق 'گودان' کے پہلے اڈیشن سے بھی ہوتی ہے۔

۲۔ پریم چند نے زندگی ہی میں اردو ناول کا مسودہ تیار کیا تھا اور اس کی اشاعت نہ ہونے کا سبب اردو ناولوں کی کساد بازاری تھی۔ اس طرح ان بیانات کی تردید ہو جاتی ہے کہ 'گئودان' کا ترجمہ پریم چند کی وفات کے بعد کیا گیا۔ سحر کے اپنے دعوے کی معقولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بیک نفس 'گئودان' کے علاوہ: "کئی ناول مثلاً 'رنگ بھوم'، 'کرم بھوم'، 'پریم آشرم'، 'نرملا' وغیرہ" کے مترجم ہونے کا دعوا کیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ان کا دعوا ہے کہ ۱۹۱۸ء کے بعد کے پریم چند اردو میں لکھتے ہی نہیں تھے، ہندی سے ان کے تمام ترجمے موصوف فرماتے تھے![4] ان ناولوں کے بارے میں تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ اب ان کے بارے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہنا چاہیے کہ ان کے

---

[1] اقبال ورما سحر ہتگامی: ہماری زبان ۱۵ دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء

[2] ورِیندر پرشاد سکسینہ: ایضاً

[3] پریم چند: چٹھی پتری ج ۲ ص ۲۵

[4] راقم السطور نے دیگر ذرایع سے پریم چند اور سحر کے تعلقات معلوم کرنے کی غرض سے متعدد (بقیہ ۲۶۴ پر)

متعلق سحر کا دعوا کتنا غلط اور بے بنیاد ہے۔ مدنظر رہے کہ یہ دعوا پریم چند کی وفات کے برسوں بعد کیا گیا ہے۔ پریم چند کے واضح بیان کے بعد کسی شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان کی زندگی میں 'گئودان' کا اردو مسودہ تیار ہو گیا تھا۔

۳۔ سحر نے ۱۹۲۵ء میں ترجمے کے لیے "۸ رنی صفحہ" کا مطالبہ کیا تھا[۱]۔ ۱۹۳۵ء میں مزید گرانی آگئی تھی اور ان کی اجرت کم از کم ایک روپیہ فی صفحہ ہوتی۔ پھر پریم چند "بہت ہوا تو ایک روپیہ فی صفحہ" کی رقم پر قناعت کرنے کو کیوں تیار ہوتے۔ قرائن سے بھی سحر کے دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ اس طرح خارجی شواہد کے اعتبار سے سحر کے دعوا کی تردید ہو جاتی ہے اور پریم چند کے مذکورہ بالا مکتوب کی روشنی میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا استدلال ساقط الاعتبار نظر آتا ہے۔

بقیہ حاشیہ ص۲۶۳
واقف کاروں سے استفسار کیا، جو ان سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے۔ ان میں ہر ایک شخص نے ایک ہی بیان دیا کہ دونوں کے تعلقات بہت خوش گوار نہیں رہ گئے تھے۔ اس زمانے میں 'ہنس' کے منیجر منشی پرواسی لعل ورما نے عجیب و غریب انکشاف کیا کہ سحر کو چوری کی لت تھی، جس کی وجہ سے پریم چند ان سے دور دور رہتے تھے۔ اور ان کو اپنے پاس آنے سے روک رکھا تھا لیکن وہ وہاں آنے سے باز نہ آتے تھے۔ پریم چند نے دفتر والوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ سحر سے ہوشیار رہیں۔ پھر بھی سحر موقع پاکر قلم وغیرہ کی طرح کی چھوٹی چھوٹی چیزیں جیب میں رکھ لیتے تھے۔ اب خدا بہتر جانے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کردار کے شخص کے قول و فعل پر کیا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ منشی دیا نراین نگم کو سحر کے متعلق زیادہ علم نہ رہا ہو۔ کیونکہ سحر اور نگم کے ساتھ ساتھ رہنے کا ذکر نہیں ملتا اور پریم چند کے لیے اتنی معمولی بات کا ان سے ذکر کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ شاید سحر نے پریم چند کی وفات کے بعد کسی طرح منشی دیا نراین نگم یا کسی اور ذریعے سے مکتبہ جامعہ تک رسائی حاصل کی ہو اور ان کے ذریعہ "گئودان" کی اشاعت میں کام کیا ہو۔

برادرم ڈاکٹر ابو محمد سحر نے منشی اقبال ورما سحر ہتگامی کے تخلص کی معنویت کی طرف متوجہ کیا، جو عام طور پر یہ کیسر سین یا سکون ہاشمی مشہور ہوگیا ہے حالانکہ سحر فتح والے حطی ہے۔ منشی سحر کے مقطعوں سے ڈاکٹر سحر کے قول کی تصدیق ہوتی ہے:

مرے وجود سے ہے کائنات کی تکمیل — جو کچھ ہو سحر! خود اپنا مگر جواز نہیں (زمانہ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

خاموش ہے فسانہ نگاری کی آج سحر — رخصت ہوا فسانہ نگاری کا ہم کلام (زمانہ، پریم چند نمبر)

اس معنویت نے لطف کا سامان فراہم کیا ہے۔ جادو ٹونے کا چمتکار ہے کہ لوگ نظربندی کا شکار ہو گئے! لیکن اصلیت اور جادوگری میں فرق ہے۔ آخر حقیقت روشن ہو گئی۔

[۱] پریم چند: چٹھی پتری ج ۱ ص ۱۵۵

اب پروفیسر مسعود حسین خاں کی داخلی شواہد کی بحث ملاحظہ ہو۔ انھوں نے بعض ترجموں کے متبادل اجزا اور ہندی اردو الفاظ کے مترادفات کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس طرح کی متعدد مثالیں گذشتہ صفحات میں پریم چند کے دیگر ناولوں کے سلسلے میں پیش کی جا چکی ہیں، اور 'گئودان' کے متعلق آئندہ صفحات میں پیش کی جائیں گی۔ لیکن ان کے ایک دل چسپ انکشاف کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں: "ایک اور جدت جو مترجم نے 'گئودان' کے ترجمے میں کی ہے وہ تلفظات اور مترادفات کے لیے قوسین کا استعمال ہے۔ بعض اوقات بہ خیال خویش اردو والوں کی سہولت کے لیے دیہاتی مکالمات کے لہجے کو قائم رکھتے ہوئے اردو لفظ کے صحیح تلفظ کو قوسین میں لکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ مثلاً سیکھی (شیخی) کھیرات (خیرات)..... یہ لغت کاری کسی زبان کے ناول میں آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔" عرض کرنا ہے جسارت نہ ہوگی کہ "یہ لغت کاری کسی زبان کے ناول میں آج تک" آئی ہو، یا نہ آئی ہو لیکن پریم چند کے دیگر ناولوں میں اس کی مثالیں مل جائیں گی، ان ناولوں میں بھی جن کے بارے میں پروفیسر صاحب موصوف کو شبہ نہیں ہے۔ یہ قوسین ہندی سے اردو ترجمہ کے لیے نہیں بلکہ اردو سے ہندی کرنے میں بعض اوقات مترجم نے اپنی رہنمائی کے لیے بنائے ہیں۔ اس کی تصدیق اس واقعے سے ہوتی ہے کہ ایک بار پریم چند نے منشی دیا نراین نگم کو ایک کہانی بھیجی جس کا ترجمہ پہلے ہندی میں کرا چکے تھے۔ کہانی بھیجتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا: "اس میں کہیں الفاظ Underlined نظر آئیں گے۔ وہ ہندی مترجم نے بنائے ہیں۔ اس کے کچھ معنی نہیں ہیں"۔[1] اب اگر ہم اس میں کچھ معنی نہ ہونے پر معنی تلاش کریں تو بلاشبہہ یہ ہماری زیادتی ہوگی!

'گئودان'، 'گے' 'گودان' بننے کے بارے میں پنڈت جناردن پرساد جھا دوج کا بیان ہے کہ پریم چند نے ابتدا میں اس ناول کا نام 'گئودان' رکھا تھا لیکن ان کے مشورے سے 'گئو' کو 'گو' کر دیا گیا۔[2] اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اصل ناول 'گئودان' تھا، جس سے ہندی میں ترجمہ کیا گیا۔

پریم چند نے 'گئودان' کے جس قصے کا انتخاب کیا تھا، اس میں مروجہ ہندی الفاظ 'عوامی

---

[1] پریم چند: چٹھی پتری ص ۱۷۳

[2] جناردن پرساد جھا دوج: پریم چند کی اپنیاس کلا ص ۱۴-۱۵

بولیوں اور غیر تعلیم یافتہ دیہاتی عوام کے اندازِ بیان کی ضرورت تھی۔ بسا اوقات اس مزاج و آہنگ کو سرسری نظر سے دیکھنے والے ہندی کا اسلوب قرار دے دیتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ پریم چند جس ماحول سے کہانی بنتے ہیں، اس میں فارسی زدگی کے بجائے عوام کی زبان کا استعمال زیادہ فطری ہوتا ہے۔ یہی عوامی زبان پریم چند کے اسلوب کا حُسن و جوہر ہے۔ اس کا اعتراف پریم چند کے بالغ نظر ناقدین نے بھی کیا ہے۔

'گودان' اور 'گئودان' کے تقابلی مطالعے میں متعدد نتیجہ خیز مسائل سامنے آتے ہیں۔ واضح ہے کہ مترجم نے سراسر غیر محتاط رویہ اختیار کیا ہے۔ متعدد موقعوں پر اُردو عبارت ہندی سے زیادہ فطری اور پُر تاثیر ہے۔ اس کے برعکس ہندی ترجمہ غیر فطری اور مصنوعی ہے، لیکن چند مقامات پر صورتِ حال برعکس بھی ہے۔ وہاں اردو کے بجائے ہندی متن زیادہ دل چسپ اور پرتاثیر ہے۔ ان میں کن عبارتوں کو پریم چند نے نظرِ ثانی کے وقت بنا سنوار دیا ہے اور کن عبارتوں کو ان کے بعد دیگر ماہرینِ زبان نے، سر دست معلوم کرنا دشوار ہے۔ اردو مسودے کے مفقود ہونے کی بنا پر اس کے متعلق رائے زنی درست نہیں ہو سکتی۔ ذیل کی سطروں میں 'گئودان' اور 'گودان' کے یکساں اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) 'گئودان' کے برعکس 'گودان' میں خالص سنسکرت الفاظ پیش کیے گئے ہیں جس سے زبان کی لطافت و نفاست پر ضرب پڑی ہے۔ مثلاً:

"ان کے سہلانے میں ہی بھلائی ہے"۔[۱]

اس کا ترجمہ ہندی میں 'سہلانے' کے ساتھ "پاؤں" کا اضافہ اور بھلائی کا ترجمہ "کشل" کر دیا گیا:

"ان پاؤں کو سہلانے میں ہی کشل ہے"۔[۲]

اسی طرح ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو:

"گائے من مارے اُداس بیٹھی تھی۔ جیسے کوئی بہو سسرال آئی ہو"۔[۳]

---

[۱] پریم چند: گئودان ص ۶

[۲] پریم چند: گودان ص ۷

[۳] پریم چند: گئودان ص ۶۲

اس کا ترجمہ کرنے میں 'بہو' کو تقسیم کرکے 'ودھوا' کر دیا گیا:

" گائے من مارے اداس بیٹھی تھی جیسے کوئی ودھو سسرال آئی ہو"۔ [۱]

متذکرہ بالا اردو اقتباسات میں پریم چند کا اسلوب بیان فطری، دلچسپ اور پرتاثیر ہے۔ اس کی متعدد مثالیں ناول میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً:

" یہ الفاظ جلتے ہوئے بالو کی طرح دل پر پڑے اور چنے کی طرح سارے ارمان جھلس گئے"۔ [۲]

ہندی میں 'الفاظ' کو 'شبد' اور 'جلتے' کو 'تپتے'، اور 'دل' کو 'ہردے' کر دیا گیا لیکن 'طرح' اور 'ارمان' ہندی میں بھی ہے:

" یہ شبد تپتے ہوئے بالو کی طرح ہردے پر پڑے اور چنے کی بھانتی سارے ارمان جھلس گئے"۔ [۳]

ایک دوسری مثال بھی نظر میں رکھیے:

" مگر انھوں نے ان لڑکوں کا منھ دیکھا اور تجردانہ زندگی کی مشق وریاضت قبول کر لی"۔ [۴]

اس کا ہندی ترجمہ کیا گیا:

" مگر انھوں نے ان بالکوں کا منھ دیکھا اور ودُھر جیون کی سادھنا سویکار کر لی"۔ [۵]

۲۔ متعدد مقامات پر شدھ ہندی لکھنے کے زعم میں محاوروں کے ترجمے کر دیے ہیں۔ مثلاً:

(۱) خاک میں ملنا ـــــ تباہ و برباد ہو جانا۔

---

[۱] پریم چند: گودان ص ۱۴۱

[۲] پریم چند: گئودان ص ۳۶۵

[۳] پریم چند: گودان ص ۲۱۵

[۴] پریم چند: گئودان ص ۲۱۵

[۵] پریم چند: گودان ص ۳۰۲

"بے عزتی سے زیادہ افسوس تھا، زندگی کے مجتمع خواہشات کے خاک میں مل جانے پر۔"[1]

—— "ایمان سے بھی بڑھ کر دکھ تھا، جیون کی سنچت ابھیلاشاؤں کے دھول میں مل جانے کا۔"[2]

(۲) خوف کھانا —— ڈرنا۔

"مجلس پر خوف چھا گیا۔"[3]

—— "مجلس پر آتنک چھا گیا۔"[4]

(۳) چہرہ اُترنا —— رنجیدہ ہونا۔

"رائے صاحب کا چہرہ اتر گیا۔"[5]

—— "رائے صاحب کا منہ گر گیا۔"[6]

۳۔ متعدد مقامات پر اردو اور ہندی عبارت میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ دونوں کی زبان یکساں ہے۔ صرف رسم الخط بدل گیا ہے، مثلاً:

"ہر ایک کی اوکھ تولاتے تھے دام کا پرزہ لیتے تھے۔"[7]

—— "ہر ایک کی اوکھ تولاتے تھے دام کا پرزہ لیتے تھے۔"[8]

اسی طرح کی دوسری مثال:

"یہ بات ان کے پیٹ میں اس طرح کھلبلی مچا رہی تھی جیسے تازہ چونا پانی میں پڑ گیا ہو۔"[9]

---

[1] پریم چند: گئو دان ص ۵۲۵

[2] پریم چند: گودان ص ۳۰۵

[3] پریم چند: گئو دان ص ۱۱۱

[4] پریم چند: گودان ص ۶۹

[5] پریم چند: گئو دان ص ۳۸

[6] پریم چند: گودان ص ۲۲۳

[7] پریم چند: گئو دان ص ۱۷۶

[8] پریم چند: گودان ص ۲۷۹

[9] پریم چند: گئو دان ص ۲۶۱

——"یہ بات ان کے پیٹ میں اس طرح کھلبلی مچا رہی تھی جیسے تازہ چونا پانی میں پڑ گیا ہو۔" [۱]

(۴) متعدد موقعوں پر اردو ہندی اسلوب بیان کے مطابق ترجمہ کرنے کی غرض سے ترمیمات کی گئی ہیں لیکن ان سے تاثر مجروح نہیں ہوتا۔ مثلاً:

"مہتا اپنی مردیت کی توہین نہ سہہ سکے۔" [۲]

——"مہتا اپنے پرشتو کا اپمان نہ سہہ سکے۔" [۳]

(۵) بعض مقامات پر 'گودان' کی زبان 'گئودان' سے بہتر نظر آتی ہے۔ بسا اوقات اردو اور ہندی الفاظ اور ترکیبوں کو ایک ساتھ استعمال کرنے کی بنا پر اردو عبارت کمزور ہو گئی ہے مثلاً:

"اس کی ماں والے درجے کا لحاظ کرتے ہوئے۔" [۴]

—— اس کے ماتر پد کی رکشا کرتے ہوئے۔" [۵]

ایک جگہ پر 'سانسارکتا' کا ترجمہ 'دنیاوت' کیا گیا ہے:

"تمھارا دل دنیاوت کی طرف دوڑتا ہے۔" [۶]

——"تمھارا من سانسارکتا کی اور دوڑتا ہے۔" [۷]

ایک دوسری جگہ اصل اور ترجمہ دونوں انتہائی مضحکہ خیز ہیں:

"کوئل زاگوں کا خفیہ خیرات کر رہی تھی۔" [۸]

---

[۱] پریم چند: گودان ص ۴۱۸
[۲] پریم چند: گئودان ص ۱۳۱
[۳] پریم چند گودان ص ۸۱
[۴] پریم چند: گئودان ص ۱۳۲
[۵] پریم چند: گودان ص ۲۲۳
[۶] پریم چند: گئودان ص ۵۵۵
[۷] پریم چند: گودان ص ۳۱۵
[۸] پریم چند: گئودان ص ۳۲۹

"____ کوئل گیتوں کا گیت دان کر رہی تھی۔" [1]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے 'پرستو' 'سانسار کنا' 'اوکہ چڑھنا' 'چڑھانا' 'یا چڈنا چڈانا' کے غیر فطری استعمال کی بنیاد پر اسے ہندی ناول کا اردو ترجمہ قرار دیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کمل کشور گوئینکا کا خیال ہے کہ 'گودان' میں الفاظ اور فقروں کی ساخت معیاری ہندی کے مطابق نہیں ہے [2] ڈاکٹر راج پال شرما نے مزاج و کردار اور الفاظ و تراکیب کے غلط استعمال کی نشان دہی کی ہے اور اس کی ذمہ داری اردو کے سر ڈالی ہے: "اشدھیوں کے دشٹے میں ہم پنہ یہ کہیں گے کہ یہ سادھارن بھولیں ہیں اور کداچت اردو کا واکیہ دنیاس ہے۔" [3] اسی کو کہتے ہیں، تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھ کو! اردو اور ہندی میں ان گنت مثالیں تلاش کی جاسکتی ہیں، جن میں کہیں اردو الفاظ و تراکیب کا استعمال فطری اور موزوں ہے۔ اور اس کا ترجمہ غلط کیا گیا ہے اور کہیں ترجمہ اصل سے بہتر ہو گیا ہے۔ اردو میں زبان و بیان کی غلطیاں کم ہیں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"منفرد اور تنک مزاج"	"اکشیپ کا جواب"
"لیاقت کا امتحان"	"لیاقت کی پریکشا"
"ان کا سارا اعتقاد اور نجی برتری کا سارا خیال کافور ہو گیا"	"ان کی ساری نشٹھا ساری سریشٹھتا کافور ہو گئی"
"شکریہ اور مبارک باد کی تقریریں"	"مبارکباد کے بھاشن"
"پردہ نشین عورتوں"	"پردہ نشین مہیلاؤں"
"اس کے بیان کا لب و لباب ہی اس کے حافظے میں باقی رہ گیا تھا"	"اس کے سارے کتھن کا خلاصہ ماتر اس کے اسمرن میں چپکا رہ گیا تھا۔"
"اس کی ساری نیک نامی پر پانی پھر گیا"	"اس کے سارے یش میں کالما پت جائے گی۔"
"ہم اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ ہمیں مکاری اور کمینہ پن میں مزا آتا ہے۔"	"ہم اتنے بڑے آدمی ہو گئے ہیں کہ ہمیں نیچتا اور کٹلتا میں نسوارتھ اور پرم آنند ملتا ہے۔"

[1] پریم چند: گودان ص ۱۹۴

[2] کمل کشور گوئنکا: پریم چند کے اپنیاسیوں کا شلپ ودھان ص ۲۷۵

[3] راج پال شرما: گودان پنرمولیانکن ص ۱۶

'گئودان' اور 'گودان' میں پریم چند کے گذشتہ ناولوں کی طرح بعض مقامات پر ترمیم اور اضافے نظر آتے ہیں۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ مترجم کا عطیہ ہے یا پریم چند نے نظر ثانی کے وقت ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:

"چاروں طرف سے مبارکباد مل رہی تھی۔ وقار تو ان کا پہلے بھی کسی سے کم نہ تھا مگر اب تو اس کی جڑ اور بھی گہری اور مضبوط ہو گئی تھی۔ وقتی اخباروں میں ان کی تصویر اور سوانح عمری زوروں سے نکل رہی تھی۔ قرض بہت بڑھ گیا تھا مگر اب رائے صاحب کو اس کی فکر نہ تھی"۔ [1]

اس کا ترجمہ ہندی میں ترمیم و اضافے کے ساتھ نظر آتا ہے:

"چاروں اور سے بدھائیاں مل رہی تھیں۔ تاروں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اس مقدمے کو جیت کر انھوں نے تعلقداروں کی پرتھم شرینی میں استھان براپت کر لیا تھا۔ سمان تو ان کا پہلے بھی کسی سے کم نہ تھا مگر اب تو اس کی جڑ اور بھی گہری اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ سامیک پتروں میں ان کے چتر اور چرتر دنا دن نکل رہے تھے۔ قرض کی ماترا بہت بڑھ گئی تھی مگر اب رائے صاحب کو اس کی پرواہ نہ تھی"۔ [2]

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"دونوں۔ بچوں کے پیار میں ہی میں نے متوفیہ کے متعلق وفاداری کو نباہا ہے"۔ [3]

اس کا ہندی ترجمہ کیا گیا:

"دونوں۔ بچوں کے پیار میں ہی اپنے پتی ورت کا پالن کیا ہے"۔ [4]

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"سلیا کا باپ ساٹھ سال کا بوڑھا تھا۔ کالا، دبلا اور لال مرچ کی طرح چنگا ہوا"۔ [5]

---

[1] پریم چند: گئودان ص ۳۰۰

[2] پریم چند: گودان ص ۵۱۱

[3] پریم چند: گئودان ص ۳۷۷

[4] پریم چند: گودان ص ۲۲۳

[5] پریم چند: گئودان ص ۲۵۳

اس کے لیے ہندی میں صرف اتنا ہے :

"سوکھی لال مرچ کی طرح چپکا ہوا"۔[1]

گودان کے مختلف ایڈیشنوں میں بھی اختلاف ہے۔ پریم چند کی زندگی میں شایع شدہ اور موجودہ ایڈیشن میں بعض مقامات پر شدید اختلافات ہیں۔ باخبر حلقوں نے راقم السطور سے بیان کیا کہ پریم چند کے ناشرین ہندی ایڈیشن کی زبان کو درست کرنے کے لیے ان کی موت کے بعد ہندی زبان کے واقف کاروں سے ترمیمات و اصلاحات کراتے رہتے ہیں۔ مثلاً گیارہویں باب میں "ایسے اساد دھارن کا نڈ......کستا ہونے لگی"۔ ۱۹۳۹ء کے دوسرے ایڈیشن میں ہے۔ لیکن موجودہ ایڈیشن میں اس پر ترمیم و اضافے کے ساتھ اس کے دو پیراگراف کر دیے گئے ہیں۔ متذکرہ بالا ایڈیشن میں "بیچ کے چٹان اس کے دانتوں سے لگے تھے" کو "بیچ کی چٹانیں اس کے دانتوں کو لگی تھیں" کر دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ترمیم اور اضافے سے پریم چند کا تعلق نہیں ہے کیونکہ یہ کام ان کی وفات کے بعد ہوا ہے۔ ہندی ایڈیشنوں کے برعکس اردو ایڈیشن میں طباعت کی غلطیاں بھی درست کرنے کی زحمت نہیں کی گئی ہے۔ پہلے ایڈیشن کی غلطیاں تمام و کمال اسی طرح سے آج بھی بدستور ہیں۔ بلکہ ان کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔

'گودان' یا گئودان کے اسلوب بیان پر عوامی اور دیہاتی زندگی کا گہرا عکس ہے۔ اس میں فارسی عربی کے مشدد اور شین قاف والے الفاظ کی زیادہ گنجائش نہ تھی۔ مگر پریم چند کی منشیانہ مزاجی نے انھیں فارسی عربی الفاظ کے استعمال کے بغیر چین نہ لینے دیا۔ یا دوسری صورت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مترجم نے ہندی میں ترجمہ کرتے ہوئے اردو کے بعض الفاظ باقی رہنے دیے کیونکہ وہ ان کے مترادف تلاش کرنے سے معذور تھا۔ جو کچھ ہو 'گودان' میں کثرت سے عربی و فارسی الفاظ نظر آتے ہیں۔ مثلاً قصیدہ، جنازہ، معشوق، مجلس، فدا، کلاہ، صفت، شریعت، تکلف، تجویز، معاہدہ، ذلت، حسرت، اسباب، مزاحم، بے وفا، قحط، تیمار داری، توفیق، خدمت گار وغیرہ وغیرہ۔

مجموعی اعتبار سے اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ 'گودان' ہندی ناولوں کی تاریخ میں اور 'گئودان' اردو ادب کی تاریخ میں یکساں طور پر اہمیت کا مالک ہے۔ اردو ہندی کے ادبی خزانے سے پریم چند کا زیر نظر ناول خارج کر دیا جائے تو دونوں ادبیات تہی مایہ نظر آئیں گی۔ زیر نظر ناول کے

---

[1] پریم چند: گودان ص۷۶

ہندی یا اردو ادب ہونے کے بارے میں حتمی طور پر کوئی فتویٰ صادر کرنا اشکال سے خالی نہیں لیکن پریم چند کے گذشتہ ناولوں کی روایت کے پیش نظر اسے اردو تخلیق قرار دینا زیادہ صحیح ہوگا۔

منگل سوتر

"ہاں یش ملا ان کے آتم سنتوش کے لیے اتنا کافی تھا۔ سنچے میں ان کا وشواس نہ تھا۔ سمبھو ہے، پراستھیوں نے اس وشواس کو درڑھ کیا ہو لیکن انھیں کبھی سنچے نہ کر سکنے کا دُکھ نہیں ہوا۔ سمان کے ساتھ نباہ ہوتا جائے اس سے زیادہ اور کچھ نہ چاہتے تھے۔ ساہتیہ رسکوں میں جو ایک اکڑ ہوتی ہے چاہے اسے شیخی ہی کیوں نہ کہہ لو وہ اس میں بھی تھی ....."[1]

متذکرہ بالا فقروں میں پریم چند خود جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 'منگل سوتر' کے ہیرو کی شکل میں انھوں نے خود اپنی سوانح عمری لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن پروفیسر احتشام حسین کے الفاظ میں" ایک غیر معمولی تخلیق کے نشان بردار"[2] کی حیثیت سے قبول کرنے کے باوجود اسے پریم چند کا نامکمل ناول قرار دیا جائے گا۔ اس کا آغاز انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں کیا تھا۔ یہ ناول انکشاف ذات کے ساتھ اپنی محرومیوں کی خوں چکاں کہانی تھی۔ ایسا لگتا ہے جیسے انتہائی ستعدی اور احتیاط کے ساتھ گویا اپنا وصیت نامہ لکھ رہے ہوں ——— میری جائداد میری دولت مستقبل کے ہندوستان کے مصنفین اور دانشوروں کے نام! زندگی کے آخری مرحلے ہیں۔ درد و تکلیف کرب و اضطراب، منزل تک پہنچنے کی تھکن اور ہزنا کامی کا غم دامن گیر ہے۔ لیکن قلم ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتا۔ معلوم نہیں کہ دل کی گہرائیوں میں کون آواز دے رہا ہے، جس کی صدا پر لبیک کہنے کے لیے مجبور ہیں۔ اگر اسے نہ لکھا تو اب تک کی تمام تحریریں بے مقصد اور لایعنی ہیں۔ پریم چند لکھیں گے ضرور، چاہے اس کے لیے جتنی مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ امرت رائے لکھتے ہیں:" اور منشی جی اس تکلیف میں بستر چھوڑ کر فرش پر آ بیٹھتے ہیں اور 'منگل سوتر' اٹھا لیتے ہیں۔ جس کے نائک دیو کمار وہ خود ہیں۔ ایک نامی گرامی سچے ایمان دار سوابھانی اور غریب لیکھک"[3] یہ غریب مصنف بھی

---

[1] منگل سوتر ص ۳۷۵

[2] احتشام حسین: افکار و مسائل ص ۱۱۷

[3] امرت رائے: پریم چند قلم کا سپاہی ص ۶۳۴

عجیب وغریب ہے جو غریبی کو زندگی کا جوہر قرار دیتا ہے۔ اگر کسی شخص کو امیر دیکھ لیتا ہے تو گمان کرتا ہے کہ اس نے استحصال پر مبنی سماجی نظام کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ پریم چند دیو کمار کے لیے لکھتے ہیں:

"کتنے ہی رئیس اور راجے اچھک تھے کہ وہ دربار میں آئیں، اپنی رچنائیں سنائیں، ان کو بھینٹ کریں لیکن دیو کمار نے آتم سمان کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کسی نے بلایا بھی تو دھنیہ واد دے کر ٹال گئے۔ اتنا ہی نہیں وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ راجے اور رئیس میرے دوار پر آئیں، میری خوشامد کریں۔ جو انہونی بات تھی۔" [۱]

اسی دیو کمار کو بنیاد بنا کر پریم چند اپنی نفسیاتی گتھیاں کھولتے ہیں۔ اس کے بیٹے سنت کمار اور سادھو کمار اور بیٹی پنکجا کی صورت میں اپنے بیٹوں شری پت رائے اور امرت رائے اور بیٹی کملا کا تصور کرتے ہیں۔ امید وبیم کی کشمکش سے لبریز اس کہانی میں دیو کمار کی تخلیقات پر ان کا تبصرہ اہمیت رکھتا ہے:

"انھیں ایسا جان پڑنے لگا کہ ساہتیہ پریمیوں کی ان سے وہ پہلے کی سی بھگتی نہیں رہی۔" [۲]

کیا ان فقروں میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اختلافات میں اردو اور ہندی کے درمیان خلیج کے اضافے کا کرب نہیں نظر آتا۔ کیوں کہ اس کے بعد سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے انتہا پسندوں نے پریم چند سے اور ان کی طرح کے وسیع النظر ادیبوں اور دانشوروں سے نہ صرف بے تعلقی اختیار کر لی تھی بلکہ ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جا رہے تھے۔ اس طرح ان کی ہردل عزیزی اور مقبولیت کو زخمی کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دیو کمار کے بارے میں درج فقرے پریم چند کے المیے کی داستان بن جاتے ہیں:

"ادھر انھوں نے جو دو پستکیں بڑے پرشرم سے لکھی تھیں اور جن میں انھوں نے اپنے جیون کے سارے انوبھو اور کلا کی ساری پروڑھتا بھر دی تھی، ان کا کچھ بھی آدر نہ ہوا۔" [۳]

---

[۱] پریم چند: منگل سوتر ص ۳۶۵

[۲] ایضاً ایضاً

[۳] ایضاً ایضاً

کیا ان سطروں میں اردو اور ہندی ادبیات کی خدمت میں خود کو فراموش کر دینے کے باوجود احساس محرومی نہیں ہے ؟ یہ فن کار کے شعور و احساس کی وہ منزل ہے جہاں قطرۂ خون جگر کو دل بنانے کی خلش و تمنا اسے تضحیک، طنز و استہزا کا نشانہ بنا دیتی ہے۔ اپنے گھر کو جلا کر چراغاں کرنے والا ادیب و فن کار سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ شام غم کی تیرگی باقی ہے اور دل نہیں بہل سکتا!

'منگل سوتر' مستقبل کے ادبی افق کا روشن ستارہ ہے۔ یہاں حقیقت نگاری اور مثالیت پسندی کے امتزاج میں پریم چند کو ایسے مرد عارف کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے جس نے زندگی کے زہر کی تلخ کامیوں کو آب نشاط میں بدلنے کی کوشش کی ہو۔ ایسی زندگی جس میں صداقت، اخلاق، ایثار اور قربانی کے چراغ روشن ہوں۔ جہاں زندگی بامعنی، بامقصد اور نصب العین رکھتی ہو۔ زندگی کا یہی تصور 'منگل سوتر' میں زندگی کا معیار و میزان ہو کر ایک آدرش کے روپ میں سامنے آتا ہے۔

پریم چند کی تخلیقات میں مشاہدات و تجربات کی حدت ہے۔ مگر 'منگل سوتر' میں خود سوزی کی کیفیت نظر آتی ہے۔ فن کار نے سنی سنائی باتوں پر بھروسہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے اپنے درد کا پیمانہ چھلک اٹھا ہے۔ یہ انکشاف ذات سے آگے کی منزل ہے۔ ماحول کی جبریت کی سیاہ رات میں اپنے لہو کے چراغ جلا کر مستقبل کو روشن بنانے کی آرزو ہے۔ یہ ناول مکمل ہو گیا ہوتا تو نئی نسل کا ناول ہوتا۔ 'گئودان' آنے والے اشتراکی سماج میں گورکی کے ناولوں کی طرح تاریخی دستاویز بن کر رہ جائے گا۔ 'منگل سوتر' زندگی کی ان بنیادی اقدار کی نشان دہی کرتا ہے، جسے نہ تاریخ دھندلا سکتی ہے نہ ماہ و سال کی گرد ——— !

'منگل سوتر' پریم چند کی وفات کے بارہ برسوں کے بعد ۱۹۴۸ء میں سرسوتی پریس الٰہ آباد سے ہندی میں شائع ہوا۔ اردو میں مسودے کا پتہ نہیں ہوتی اشاعت ہوئی لیکن ہندی مسودے سے ترجمہ کرکے گزشتہ ناولوں کی طرح اس کے ہندی مخطوطے کی بنیاد پر یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند 'منگل سوتر' کو ہندی میں لکھ رہے تھے۔ یہ نامکمل ناول بھی یقینی طور پر اردو ہندی ادب کا انمول رتن ہے۔!

اِس دور کے پریم چند کو اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ادیب کی حیثیت سے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ماہ و سال کی گردش کے ساتھ انھوں نے ہندی میں بھی تخلیق کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ ممکن ہے کہ ضرورت کے اعتبار سے کبھی پہلے ہندی میں لکھا ہو لیکن اردو ان کی پہلی زبان تھی اور انھیں یقیناً اردو میں لکھنے میں سہولت لگتی تھی۔

اس دور میں پریم چند کی نگارشات کے ترجمے ہندی کے علاوہ دیگر زبانوں میں بھی شایع ہوئے۔ ہمارے نزدیک پریم چند اردو کے ادیب و فن کار ہیں۔ ہندی ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے! ▲▲▲

حرفِ آخر

پریم چند کے اردو اور ہندی افسانوی ادب کے تقابلی مطالعے میں نہ صرف یہ کہ متعدد لسانی اور تکنیکی پہلوؤں کی نشان دہی ہوتی ہے بلکہ ان کی نگارشات کی روشنی میں زبان و ادب کے مسائل، تخلیقی عمل، فنی محرکات اور زاویہ نظر کے تجزیہ و تفہیم کی نئی راہیں کھلتی ہیں، جو ملک کے سیاسی سماجی اور معاشی رجحانات اور میلانات پر از سرِ نو غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ پریم چند نے ملکی مسائل پر فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے، جن سے ان کے آفاقی ذہن و ادراک کا احساس ہوتا ہے۔ پریم چند اردو ہندی کے ادیب و فن کار ہی نہیں بلکہ ڈکنس، تھیکرے، ہارڈی، طالسطائے اور گورکی کی طرح بین الاقوامی ادبیات کا حصہ ہیں۔ ان کی نگارشات میں انسانی دلوں کی دھڑکن ہے۔ وہ ماضی یا حال کے ہی نہیں مستقبل کے بھی ادیب و فن کار ہیں۔

پریم چند اردو سے ہندی کی طرف گئے۔ اس کے مختلف اسباب و محرکات تھے، جس کے پس پشت تاریخ کی جبریت، سیاست کی کرشمہ سازی اور سامراجی حکمرانوں کی حکمت عملی شامل ہے، جو ہندوستان کی شیرازہ بندی کو منتشر کرنا چاہتی تھی، جن کے پیشِ نظر صرف خطے کی تقسیم نہ تھی، دلوں کی تقسیم تھی، جسے بروئے کار لانے کے لیے زبان، ادب، تہذیب اور روایات کی مشترکہ میراث کی تقسیم ناگزیر تھی۔ ان ملک دشمن عناصر نے مطلب برآری کے لیے مختلف انداز میں انتشار و بے ربطی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مدِ نظر رہے کہ قدیم سے شمالی ہند کے لسانی حالات مختلف ادوار میں ارتقا پذیر رہے ہیں لیکن ان کے معیار و میزان میں زیادہ اختلاف نہیں پیدا ہوتا تھا۔ سنسکرت کے لسانی و تہذیبی تسلط سے پراکرتوں اور اپ بھرنشوں کے ارتقا میں نہ صرف یہ کہ شمالی ہند کی لسانی سالمیت نہیں مجروح ہوئی بلکہ اس علاقے کی بڑی زبانیں ایک دوسرے کے فطری ارتقا میں سرپرستی اور تعاون کرتی رہیں۔ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل عوامی زبانیں کثرت میں وحدت کا مظہر تھیں لیکن اسے حالات کی ستم ظریفی کے علاوہ اور کیا کہا جائے کہ ایک ہی زبان جس کی یکساں لسانی معیاروں پر نشو و نما ہوئی تھی، دو مختلف زبانوں کی حیثیت سے منقسم ہو گئی اور سماجی سیاسی معیاروں پر علاحدگی پسندگی کی علامت قرار پائی۔ اگر صرف رسم خط کے

مختلف ہونے کی دشواری ہوتی تو امید کی جاسکتی تھی کہ ان میں زیادہ فطری رسم خط کم فطری رسم خط کو اپنے آپ خارج کردے گا لیکن ان دونوں زبانوں کے مسائل سماجی، سیاسی، تاریخی اور مذہبی بنیادوں پر ترتیب پانے لگے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقے پر اپنی زبان مسلط کرنے کے لیے جد و جہد کرنے لگا۔ اردو سے مقامی، دیسی اور فطری زبان کے الفاظ و محاورات خارج کیے گئے اور ان کی جگہ پر عربی فارسی الفاظ و تراکیب، اصطلاحیں اور روایتیں شامل کی گئیں۔ ہندی سے مخلوط تہذیب و تمدن کے نقوش حرف غلط کی طرح معدوم کر دیے گئے، اور 'ہندی' زبان و ادب ہندوستان کے اکثریتی فرقے کی میراث قرار پائی، ملک کے دیگر اقوام کے لوگ بے دخل کر دیے گئے۔ زبان کو مذہبی نوعیت عطا کرنے کا انجام یہ ہوا کہ اسے تہذیبی اور سماجی بنیادوں پر قبول کرنے کے بجائے فرقہ واریت اور تنگ نظری کی راہ پر ڈال دیا گیا۔ اس وقت کے برسر اقتدار طبقے کی سیاست کا تقاضہ یہی تھا کہ اس طرح رجحانات کو زیادہ سے زیادہ ابھارا جائے۔ مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ اردو کو اسلامی زندگی کا ترجمان قرار دینے لگا۔ در تہذیبی مسائل کو مذہبی رنگ دیا جانے لگا۔ ہندی کے حامی 'ہندی ہندو ہندوستان' کے مثلث کو سینے سے لگا کر مجاہدانہ سرفروشی کا اظہار کرنے لگے۔ یہ عجیب و غریب جہاد تھا جس میں اپنا سر اپنے ہاتھوں سے قلم کیا جا رہا تھا۔ ان لوگوں کا گمان تھا کہ ہندوستانی زندگی کی ترجمانی کے لیے کسی خارجی اثر کی پیدا کردہ زبان کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس سیاسی موقع پرستی میں قومی خیالات کے رہنماؤں نے درمیان کی راہ نکالنے کی کوشش کی اور ایک ایسی زبان کے نظریے کو پیش کیا جو عام ہندوستانیوں کی زبان ہو۔ جسے فارسی رسم خط میں لکھا جائے تو اردو کہلائے اور ناگری رسم خط میں قلم بند کر دیا جائے تو وہی ہندی بن جائے۔ ظاہر ہے کہ اس زاویۂ نظر کے پس پشت لسانی مطالعہ و تجزیہ یا لسانی مسئلے کا سائنسی حل تلاش کرنا مقصود نہ تھا بلکہ رواداری، وسیع النظری اور صلح پسندی کی نظر سے درمیانی راستہ تلاش کیا گیا تھا، کیونکہ تمام بیدار مغز رہنماؤں کو احساس تھا کہ ملکی آزادی کی راہ میں زبان کا مسئلہ سب سے زیادہ حائل ہو رہا تھا اور ہندوستان کے دو بڑے لسانی گروہوں کو ساتھ لیے بغیر سیاسی کامیابی کی منزل تک رسائی دشوار تھی۔ سیاسی رہنماؤں کے ساتھ اس تصور کی تائید میں متعدد دانشور علما، و حکما و ادیب و فن کار شامل ہو گئے۔

پریم چند نے لسانی مسئلے کو قومی رہنماؤں کی نظر سے دیکھا۔ وہ ماہر لسانیات نہ تھے اور نہ انھوں نے زبان کے سائنسی و تکنیکی پہلوؤں پر غور و خوض کیا تھا۔ زبان ان کے لیے محض وسیلۂ اظہار تھی۔ جو کسی شکل میں اور کسی طرح استعمال کی جاسکتی تھی۔ 'ہندستانی' کو قبول کرنے میں انھیں ایک طرح کی ذاتی سہولت تھی۔ وہ ناگری اور اردو دونوں رسم الخط سے آشنا تھے اور اس طرح ایک عوامی زبان کو

مروج کرنے میں انھیں زیادہ آسانیاں تھیں۔ لیکن ان کی تخلیقات کے مختلف ادوار میں لسانی اعتبار سے مختلف رجحانات نظر آتے ہیں۔

پریم چند کا اولیں ناول 'اسرار معابد' اور ان کا آخری ناول 'منگل سوتر' دونوں نامکمل تخلیقات ہیں۔ ان کے افسانوی ادب کا سلسلہ 'ہم خرما و ہم ثواب' سے شروع ہو کر 'گئودان' تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کا زمانہ تصنیف کم و بیش چار دہائیوں پر محیط ہے۔ ان چاروں دہائیوں کے سماجی سیاسی اور لسانی مسائل کا جائزہ ناگزیر ہے۔ کیونکہ پریم چند ان ادیبوں میں نہیں تھے جو اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر تخلیق کرتے ہیں جن کے مسلط کردہ تجربات حقیقت سے واسطہ نہیں رکھتے بلکہ وہ ذات و انفرادیت کی بنیادوں پر ادبی تخلیقات پیش کرتے ہیں۔ پریم چند کی تخلیقات کی بنیاد ہندوستان کا دیہی نظام معیشت ہے جس کی اپنی روایتیں ہیں۔ اپنے مصائب' ناکامیاں اور کامیابیاں ہیں۔ استحصال ہے' بد نصیبی ہے اور اسے مقدر قرار دے کر برداشت کرنے کی قوت ہے۔ پریم چند نے ہندوستانی گاؤں اور قصبوں کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہاں کی رسمی زندگی، صنعتی اور مشینی کاروبار، مغربی اثرات اور چمک دمک سے پریم چند کی آنکھیں خیرہ ہوئی تھیں لیکن انھوں نے وہاں کی زندگی میں اپنے دل کی دھڑکنیں نہیں محسوس کی تھیں۔ انھوں نے شہری تہذیب کو ہندوستانی زندگی کے لیے عذاب کی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ انھیں وہاں کی زندگی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، اس لیے وہاں ان کا دل بھی نہیں لگتا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کے ان تناقضات کے تناظر میں پریم چند کے لسانی رویے کی تفہیم صحیح سمتوں کی طرف لے جائے گی۔ کتنی عجیب و غریب بات ہے کہ دیہاتی زندگی کے لیے اس قدر یگانگت، خلوص اور عقیدت کے جذبات کے باوجود پریم چند دیہاتی بولیوں کے لیے وسیع الخیال نہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے کردار دیہات کے ہوتے ہیں مگر وہ دیہاتی نہیں بولتے، ہندستانی بولتے ہیں۔ عوامی زندگی کے اظہار میں عوامی بولیوں کی چاشنی مل جاتی ہے مگر دال میں نمک کے برابر۔ پریم چند کے مثالی کردار اکثر و بیشتر کھڑی بولی بولتے ہیں۔ اودھی، برج اور بھوجپوری اجڈ، گنوار اور غیر مہذب لوگ استعمال کرتے ہیں۔ شاید اس کے پس منظر میں ویدک دور کی لسانی روایتیں ہیں، جن میں راجا، منتری، گیانی اور مہذب افراد سنسکرت بولتے ہیں لیکن پس ماندہ طبقے کے لوگ اور عورتیں پراکرت بولتی ہیں۔

پریم چند کے اسلوب بیان اور لسانی رویے میں سنسکرت کے تتسم الفاظ کے استعمال پر ڈاکٹر جگن ناتھ شرما نے دل چسپ بات کہی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مولوی پنڈت بننے کی کوشش میں ہے[1] دوسری طرف اردو حلقوں میں پریم چند کی اردو اس قدر پسند کی جاتی رہی ہے کہ اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک بار مولانا شبلی نے فرمایا تھا ــــ ہندوستان میں

---

[1] جگن ناتھ شرما: پریم چند کی بھاشا شیلی، پریم چند سمرتی (مرتبہ) اندر ناتھ مدان ۱۸۷

پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں لیکن ان میں دم نہیں کہ اس کافر سے اردو زبان چھین لیں! یہ وہی کافر ہے جسے اردو دنیا دیکھ کے جیتی ہے اور جس پر اس کا دم نکلتا ہے۔ یہ تاکید المدح بما یشبہ الذم پریم چند کے اسلوب کا سچا اعتراف ہے۔ پریم چند کا اسلوب بیان زندگی بسر کرنے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ اس کی جڑیں ہندوستان کی عوامی زندگی میں پیوست تھیں۔ اسے پریم چند نے شعوری طور پر اپنایا تھا اور مختلف ادوار میں بھی ان کا یہ اسلوب نکھرتا اور سنورتا گیا، لیکن اس اسلوب کی ماہیت کے حقیقی ادراک کے لیے مختلف ادوار کا تجزیہ ناگزیر ہے۔ اس لیے یہاں ان کے اسلوب بیان کے مختلف ادوار پر اجمالی نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

پریم چند کی تخلیقات میں خالص اردو الفاظ و روایات کا استعمال ۱۹۳۵ء تک غالب عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں صنائع بدائع، تشبیہات و استعارات، تصنع اور غیر فطری انداز نظر آتا ہے۔ حقیقت مجاز میں ابھرنے کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اردو الفاظ و محاورات، ترکیبوں اور روایتوں کا کثرت سے استعمال عام قارئین بھی محسوس کر لیتے ہیں کہ اس دور کی اردو تخلیقات، جو بعد میں ہندی میں منتقل ہوئیں، ان کا اسلوب بیان ہندی زبان و ادب کی روایتوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس دور کی تخلیقات میں پریم چند کی شایع شدہ اور موجودہ صورت میں امرت رائے کے ترجمے کی حیثیت سے شایع شدہ نگارشات کے اسلوب بیان میں زبردست فرق نظر آتا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ پریم چند کی زندگی میں شایع شدہ نگارشات کا ترجمہ ان لوگوں نے کیا ہے، جو اردو اور ہندی کی خصوصیات و روایات سے کماحقہٗ باخبر نہ تھے۔ اس ضمن میں خاص طور پر 'پریما' کی زبان کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جو پریم چند کے اردو ناول 'ہم خرما و ہم ثواب' کا ہندی ترجمہ ہے۔ اتنا یقینی ہے کہ اس وقت تک پریم چند ہندی میں تخلیقی مہارت پیدا نہیں کر سکے تھے، اس لیے اس کا مترجم جو شخص بھی ہو اس نے 'پریما' میں اپنے اظہار علم کا ڈھونگ رچایا ہے جو نامانوس اور ناہموار ہے۔

پریم چند کی تخلیقات کا دوسرا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان پندرہ برسوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس دور کے ابتدائی برسوں کی تخلیقات پر گذشتہ دور کے اثرات ہیں۔ پریم چند بنیادی طور پر اردو کے ادیب ہونے کی بنا پر اردو کی روایات، رنگ و آہنگ سے بے نیاز نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے لسانی رویے میں رفتہ رفتہ ترمیم و تنسیخ ہوئی۔ اس دور میں 'گوشۂ عافیت' کے ہندی ترجمہ 'وردان' کو خاص طور پر سامنے رکھا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں نہ صرف 'پریما' کی طرح زبان کے تجربے ہوئے ہیں بلکہ متعدد مقامات پر اس سے بھی زیادہ سنسکرت آمیز اور غیر فطری زبان و اسلوب کا استعمال ہوا ہے۔ 'بازارِ حسن'

کا ترجمہ 'سیوا سدن' ہونے تک پریم چند کی ہندی صاف و شفاف ہوجاتی ہے۔ حالانکہ اس کے بعد بھی اردو آمیزی پریم چند کی تحریروں میں برقرار رہتی ہے لیکن اس کے بعد سے اردو اور ہندی کے عام فہم الفاظ کا اختلاط حسب ضرورت کیا گیا ہے' جس سے ان کے زبان و اسلوب کی نئی منزلوں کا احساس ہوتا ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے اس دور کی تخلیقات کا مطالعہ اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ ہندی میں زبان کی خامیاں' اردو رنگ و آہنگ کی کثرت 'پردۂ مجاز' کے ہندی ترجمہ 'کایا کلپ' تک نمایاں ہے۔ 'نرملا' تک غیر معمولی طور پر تبدیل ہوجاتی ہے۔ حالانکہ خالصتاً سنسکرت الفاظ کا استعمال پہلے کی تخلیقات کے مقابلے میں بڑھتا گیا ہے لیکن ان میں خامیوں کی رفتار سست ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قواعد کی بنیاد پر صحیح ہندی لکھنے میں پریم چند کسی دور میں قدرت نہ پیدا کر سکے۔ یہ اور بات ہے کہ بتدریج اس میں اردو کے اثرات کم ہوتے گئے۔

پریم چند کی تخلیقات کا آخری دور جو ۱۹۳۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ لسانی مطالعے کی نظر سے انتہائی اہم ہے۔ اس دور میں عوامی زندگی شہری زندگی کا تصادم زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ اسی دور کی تخلیقات کے مطالعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ پریم چند نے لسانی زاویۂ نظر سے اسلوب بیان پر قابو پالیا ہے' جس کا سبب عوامی زندگی کے مشاہدات و تجربات ہیں۔ اسی عوامی زندگی کے اثرات طاقت ور زبان لکھنے کی قوت عطا کرتے ہیں۔ ہوری مثالی کردار ہے۔ اس کی زبان بھی مثالی ہے جس میں پوری دیہاتی زندگی محو گفتار نظر آتی ہے۔

پریم چند اردو اور ہندی افسانوی ادب کے تقابلی مطالعے میں ترجمے کے مسائل خاص طور سے متوجہ کرتے ہیں۔ پریم چند نے کتنی تخلیقات اردو میں کیں اور کتنی ہندی میں' ایک زبان سے دوسری زبان میں کس نے منتقل کیا ہے۔ چند نام ملتے ہیں لیکن تمام نگارشات کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام اتنا پھیلا ہوا ہے کہ کسی ایک شخص کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔ حالانکہ زیر نظر مطالعے میں اب تک دستیاب تقریباً تمام ناولوں اور کہانیوں کا زمانۂ تصنیف و اشاعت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ حرف آخر نہیں ہے۔ تحقیق و تلاش میں حرف آخر کی گنجائش نہیں ہوتی! اس امر کی ضرورت ہے کہ باخبر صاحبانِ نظر اس کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز انداز میں روشنی ڈالیں۔ اگر پریم چند نے خود دونوں زبانوں میں نہیں لکھا ہے انھیں دونوں زبانوں میں تخلیقی مصنف کی حیثیت سے قبول کرنا کہاں تک انصاف پر مبنی ہو گا۔

زیر نظر مطالعے میں پریم چند کے ہندی اور اردو افسانوی ادب سے متعدد اقتباسات پیش کیے گئے ہیں جن میں اصل تحریر اور اس کے ترجمے میں شدید اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی ذمے داری کس کے سر

جائے گی؛ غالباً سہل انکاری کہے کہ جب ان کی زندگی میں ترمیم اور اضافے کیے گئے تو اس کے ذمے دار پریم چند ہیں۔ ہمیں اس زاویۂ نظر سے اختلاف ہے کیونکہ اسے تسلیم کر لینے کے بعد کہ تخلیقات کے ترجمے خود پریم چند نے نہیں کیے ہیں، اسے ان کے مترجموں کے سر ڈالنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس سلسلے کی ایک دل چسپ صورت حال یہ ہے کہ ترمیم اور اضافے کا سلسلہ پریم چند کی وفات کے بعد بھی جاری رہا ہے۔ اُن کے ناشرین جو حسنِ اتفاق سے ان کے فرزند بھی ہیں، پریم چند کی تخلیقات کی تصحیح و اصلاح کا سلسلہ ہنوز جاری کیے ہوئے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں مختلف تخلیقات کے ضمن میں اس کا تفصیلی بیان ہو چکا ہے۔ ان تحریفات کو کس خانے میں رکھا جائے گا ــــ!

پریم چند کے ہندی اور اردو افسانوی ادب میں الفاظ کا انتخاب ترکیبوں، علامتوں اور صنائع بدائع کا استعمال اردو مزاج و آہنگ کے اعتبار سے کیا گیا ہے جس کے اصل محرک کو نظر انداز کر دینے کے سبب سے پریم چند کے کئی ناقدوں نے ہندی ویاکرن اور النکاروں کی بنیاد پر غلطیوں کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اردو اور ہندی کے لسانی معیار کی یکسانیت کے باوجود ان کے استعمال میں وقت کے اعتبار سے ترمیم ہوتی رہی ہے اور رفتہ رفتہ دونوں کا لسانی خاکہ تبدیل ہو گیا ہے۔ ان کے تخلیقی عمل میں بھی متعدد موقعوں پر بنیادی فرق آ گیا ہے۔ عام الفاظ میں جذبات و خیالات کی ادائیگی کے مختلف پہلو ہیں۔ ان تمام پہلوؤں کا تجزیہ کرتے وقت نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کا سلسلہ محاوروں کے استعمال تک پہنچتا ہے۔ پریم چند کے مترجموں کی انتہا پسندی متعدد مقامات پر بہت واضح ہے۔ ان کی اردو محاوروں کا ہندی کرن کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کسی عمامہ و قبا پوش کی پیشانی پر قشقہ کھینچ دیا جائے!

پریم چند کے لسانی رویے پر ان کی تخلیقات کی روشنی میں غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔ پریم چند اردو اور ہندی ناولوں کی ساخت کے متعلق مخصوص تصورات رکھتے تھے۔ اردو اور ہندی کی روایتوں کو دیسی اور عوامی معیار پر استعمال کرنے کی کوشش ان کی مختلف تخلیقات میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے اس کوشش میں الفاظ کو اُس کے صحیح تناظر کے اعتبار سے استعمال کیا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی ہر طرح کے معیار کا خیال رکھا ہے۔ ڈاکٹر کیلاش چندر بھاٹیا نے پریم چند کے یہاں استعمال شدہ انگریزی الفاظ کی تعداد تقریباً پانچ سو قرار دی ہے۔ ان الفاظ کا استعمال اُن کے اولین ناول 'اسرار معابد' سے شروع ہو کر آخری ناول 'منگل سوتر' تک پھیلا ہوا ہے[1]۔ دیسی زبانوں کے علاوہ عربی و فارسی کے الفاظ و روایات سے مکمل طور پر آگہی کی ساتھ پریم چند نے ہر طرح کے الفاظ کا مناسب استعمال کیا ہے جس سے ان کے ذریعہ اردو اور ہندی زبانوں

---

[1] کیلاش چندر بھاٹیا: پریم چند کی بھاشا شیلی، اپنیاس کار پریم چند مرتبہ سریش چندر گپت وغیرہ ص ۱۰۱

کے ذخیرۂ الفاظ میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اگر ایک طرف سنسکرت، ہندی اور دوسری مقامی بولیوں کے متعدد الفاظ ہیں تو دوسری طرف فارسی و عربی الفاظ کی بھی کثرت ہے۔ جن کو مترجموں نے الفاظ کے فنی استعمال کو حرف بہ حرف ترجمہ کرنے کے جوش میں متعدد موقعوں پر مجروح کیا ہے اس سے نہ صرف زبان کے فطری رجحان کو صدمہ پہونچا ہے بلکہ پریم چند کا عطا کردہ ذخیرۂ الفاظ بھی محدود ہوا ہے۔

پریم چند کی تخلیقات میں اردو اور ہندی الفاظ و روایات کا فرق مکالموں میں زیادہ واضح ہوتا ہے۔ پریم چند کرداروں کے مزاج و ماحول کے اعتبار سے مکالمے کے الفاظ پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔ شہری زندگی اور مسلم کرداروں کی گفتگو میں عربی و فارسی الفاظ و روایات پر زور ہوتا ہے۔ دیہاتی زندگی اور ہندو کرداروں کے بیان میں عوامی اور دیسی بول چال کے الفاظ کو اوّلیت ملتی ہے۔ اگر ان دونوں طرح کے لسانی تجربوں کے درمیان کوئی خلیج حائل ہے تو انھوں نے ہندوستانی کے پل کے ذریعہ ایک کو دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ اس سے ان کی تخلیقات کے فطری رویے میں فرق نہیں آیا ہے۔

پریم چند کو اردو اور ہندی افسانوی ادب کے معماروں میں متعدد حیثیت سے امتیاز حاصل ہے۔ ان کا رویہ شدھ ہندی یا فصیح و بلیغ اردو کے حامیوں کے رویوں سے مختلف و متضاد ہے جو زبان کے ماتھے پر سنسکرت الفاظ و تراکیب کا چندن یا فارسی الفاظ و روایات کی کُلاہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ پریم چند ان کے لیے زندہ چیلنج کی حیثیت سے اپنی زندگی میں تھے اور آج بھی اسی چمک دمک کے ساتھ موجود ہیں۔ مستقبل کے ہندوستان کے لسانی رویے کے تعین میں پریم چند کے زبان و اسلوب سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کیونکہ پریم چند نے اپنی تخلیقات میں جس 'ہندوستانی' کو وسیلۂ اظہار بنایا تھا وہ نہ صرف تعداد کے اعتبار سے وسیع تر ہے بلکہ پورے ملک کی زبان ہے۔ ایسے علاقوں کی بھی زبان ہے جہاں کے باشندوں کی مادری زبان کچھ اور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند کی طرح کی زبان بولنے والے ہندوستان کے کسی ایک خطے تک محدود ہونے کے بجائے پورے ملک میں کشمیر سے کنیا کماری تک پھیلے ہوئے ہیں بلکہ اسی ملک کے گوشت پوست میں شامل پاکستان اور بنگلہ دیش کے مختلف علاقوں اور بیرونجات کے ممالک میں بھی سکونت پذیر ہیں۔ مجموعی اعتبار سے اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ اردو ہندی ادبیات میں پریم چند کے زبان و اسلوب کو وقت کی گرد نہ دھندلا سکی بلکہ وقت کی گرد نے ان کی زبان و اسلوب کے ساتھ ابٹن کا کام کیا ہے! وہ اور نکھرتا و سنورتا گیا اس کے نکھار، بانکپن اور حسن میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔

پریم چند کے لسانی زاویۂ نظر پر گاندھیائی اثرات کے بھی متعدد پہلو ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کرنا

چاہیئے۔ ہمارے نزدیک پریم چند پر گاندھیائی اثرات عظیم روسی فن کار طالسطائی کی نگارشات کے توسط سے پڑے تھے کیونکہ طالسطائی سے مہاتما گاندھی اور پریم چند دونوں متاثر تھے۔ طالسطائی کی طرح مثالیت پسندی کی مختلف شکلیں پریم چند کی نگارشات میں ملتی ہیں۔ کرداروں کے انتخاب میں کہانی کے بننے میں اور تخلیق کے مقصد کی ادائیگی میں پریم چند پر ایسی مثالیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ یہ واضح ہے کہ پریم چند قصے کا مواد سماجی مسائل سے حاصل کرتے تھے اور اُسے اصلاح پسندی کے جذبے کے ساتھ دیکھتے تھے۔ اس کی جیتی جاگتی مثال سُمن ہے جو طوائفیت ترک کرکے آشرم میں پناہ لیتی ہے۔ اسی مثالیت پسندی نے تخلیقات میں حادثات کے بیان کو تقویت بخشی ہے کیونکہ پریم چند اپنے قصے کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے جس منزل کی طرف لے جانا چاہتے تھے، ان میں فطری اور حقیقی نتائج حادثات کے ذریعہ ممکن ہو سکتے تھے۔ ان حادثات کی بنا پر عام کرداروں اور واقعات کی تکرار بھی ہو گئی ہے۔ ایسے موقعوں پر محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند حقائق کا سامنا کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ اس کا سبب ان کا تصوراتی معیار ہے جس میں سائنسی ایجادات، صنعت و حرفت، مشین اور مادیت کے لیے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ یہی دیہاتی زندگی کی طرف مائل ہونے کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ شہری زندگی جن حقائق سے دوچار تھی پریم چند انھیں برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ ان کے تصورات کی دنیا دیہات میں بستی ہے جس میں غیر تعلیم یافتہ انسانی گروہ زندگی گذارتا ہے۔ ضعیف الاعتقاد اور مقدر کا پرستار۔ ان کا مذہب منطقی بنیادوں کی بجائے رسمیات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس پس ماندہ اور استحصال شدہ طبقے کے لیے پریم چند فطری طور پر محبت آمیز رویہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی ترقی اور خوش حالی کے لیے کسی طرح کے باہری اثرات شامل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ پریم چند کا المیہ ہوری کی شکل میں بیان ہوتا ہے اور سودا اس کی حیثیت سے گاؤں والوں کے درمیان نمایاں ہو کر رہ نمائی کرتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کی تخلیقات کے اردو ہندی ایڈیشنوں میں فرق نہیں ہے۔ جو ترمیمات اور اضافے کیے گئے ہیں ان کی اہمیت ترجمے کے زاویۂ نظر سے ہے۔ اس سے پریم چند کے فن و اسلوب کے کسی خاص رجحان کا اندازہ نہیں ہوتا۔ فنی نقطۂ نظر سے پریم چند کی تخلیقات کو عام طور پر ابتدا سے 'بازار حسن' تک اور 'بازار حسن' سے 'گئودان' تک منقسم کیا گیا ہے۔ یہ تقسیم ان کی تمام تخلیقات کو تخلیقی معیاروں کو قبول کرنے کی حد تک درست قرار دی جا سکتی ہے ۔۔۔ پریم چند کا 'گئودان' فنی نقطۂ نظر سے عروج کی آخری منزل ہے۔ اسی طرح ان کی متعدد کہانیوں کا نقطۂ عروج 'کفن'، نے جو اردو ہندی کہانیوں کی راہیں متعین کرتی ہیں۔ 'کفن' کو جدید کہانی کا نقطۂ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے ۔۔۔۔۔ پریم چند کی تخلیقات اردو اور ہندی کے بارے میں جتنا بھی تنازع کیا جائے اس کی اہمیت کم نہیں کی جا سکتی۔ یہ ان کی ہر دل عزیزی کا بین ثبوت ہے کہ انھیں بیک وقت اردو اور ہندی دونوں میں

اعلاترین مرتبہ حاصل ہے۔ وہ ایک ایسے پل کی طرح ہیں، جو اپنی شخصیت کی دل آویزی سے اردو ہندی کے پیش پا افتادہ کناروں کو مسلسل جوڑ رہے ہیں۔

پریم چند کے ادبی زاویۂ نظر کے متعلق اکثر مبالغہ آمیز خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ جس کا تجزیہ اس مطالعہ کے حیطۂ عمل کے باہر ہے لیکن کسی فن کار کی تخلیقات میں زاویہ کو مدنظر رکھے بغیر تقابلی مطالعہ میں صحیح نتائج تک رسائی ممکن نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہاں اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ پریم چند بنیادی طور پر انسانیت پرست، قومیت کے پرستار اور انسانوں کی خوش حالی کے دل دادہ تھے۔ حالانکہ ان کی تخلیقات سے واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے منضبط انداز میں مارکسیت کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حق و ناحق کے جہاد میں پریم چند حق کے ساتھ ہیں۔ سرمایہ پرست اور مفلس کی جدوجہد میں مفلس کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اگر ساہوکار اور کسان کے درمیان تصادم ہوتا ہے تو وہ کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ ہیں۔ زمین دار اور اس کے کارندے نادار کسان کا استحصال کرتے ہیں تو پریم چند استحصال کے خلاف کسان سے لاٹھی اٹھانے کو کہتے ہیں۔ اگر حکم راں طبقہ مظالم کرتا ہے تو پریم چند عوام کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ پریم چند کسی منزل پر رجعت پسند عناصر کی علامت نہیں بنتے۔ حالانکہ ان کے غیر سائنسی زاویۂ نظر کو افراط و تفریط کے ساتھ بیان کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا زاویۂ نظر مثالیت پسند اور انسانیت نواز رہتا ہے۔ اس مثالیت پسندی اور انسانیت نوازی کی بنیادوں کو سمجھنے کے لیے انیسویں صدی کی آخری دہائی سے لے کر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے ہندوستان کو دیکھنا چاہیے جس میں حقیقت مختلف شکلوں میں نشو و نما پا رہی تھی۔ پروفیسر احتشام حسین کے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے: "یہ ایسا عہد تھا جب کعبہ اور کلیسا دونوں اپنی اپنی جانب کھینچ رہے تھے اور لکھنے والوں کا رومانی بن جانا بھی ممکن تھا اور حقیقت پسند بھی۔ برل بن جانا بھی ممکن تھا اور کانگریسی بھی۔ انسان فرقہ پرست بن سکتا تھا اور قومیت کا حامی بھی۔ برطانوی حکومت کا ساتھی بھی ہو سکتا تھا اور مخالف بھی۔"[1] اس کش مکش میں پریم چند کو تلاش کیا جائے تو پریم چند اپنے دور کے حالات کے اعتبار سے انتہائی ترقی پسند نظر آتے ہیں۔ وہ عام لوگوں کی طرح تشکیک کے شکار نہیں ہیں لیکن ان کی قدامت میں اسلاف پرستی کا رجحان نظر آتا ہے۔ مثلاً انھیں ہندوستان کے سامراجی نظام سے ہمدردیاں ہیں، جس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے سرزمین ہند کے وقار کو شمالی قدیم ہندوستانی راجاؤں اور مہاراجاؤں کے طرز حکومت میں دیکھا تھا جس کا نقطۂ عروج رام راج تھا۔ سرمایہ پرستی یا ذخیرہ اندوزی پریم چند کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ لیکن سامراجی دولت کو ذخیرہ کرنے کے برعکس اسے افراط و تفریط کے ساتھ صرف کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی، سماجی اور معاشی معیار الگ الگ انداز میں دیکھا جاتا ہے۔ پریم چند سیاسی انقلاب کے متعلق موجودہ مفکروں سے

---

[1] سید احتشام حسین: تنقید اور عملی تنقید ص ۱۲۹

ہم خیال نہیں تھے۔ اسی طرح تاریخ کے مادی ارتقا کے متعلق خیالات بھی دقیانوسی نظر آتے ہیں۔ پریم چند عصری زندگی کی اصلاح میں انسانیت پسندی کے مزاج کے بنا پر سائنسی تجزیے سے گریز کرتے ہیں۔ اسی طرح عورت کے حقوق و اختیارات کے متعلق پریم چند کا زاویۂ نظر عصری تناسبات میں تنگ نظری کا حامل نظر آتا ہے۔ انھوں نے مذہب کو اخلاقی معیاروں پر قبول کرنے کے بجائے جذبات کی کشمکش میں دیکھا تھا، جسے موجودہ مادہ پرست ناقدین بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں ان کی باتوں میں حقیقت ہے لیکن یہ ادھوری حقیقتیں ہیں۔ پریم چند کو ان کے زمانے کے مسائل اور معیاروں سے جدا کر کے دیکھنے پر گمراہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

پریم چند کو اردو ہندی ادبیات میں مختلف حیثیتوں سے امتیاز حاصل ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے اردو ہندی ادیبوں کے لیے جس ترقی پسند فکر کا اظہار اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کیا تھا وہی عصر حاضر میں بھی تخلیقی و فنی کاوشوں کا معیار بنی ہوئی ہے۔ یہ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ ہندوستان رفتہ رفتہ اشتراکیت کے نصب العین کی طرف قدم بڑھاتا جائے گا۔ پریم چند کی تخلیقات کی اہمیت میں وقت کے ساتھ مزید اضافہ ہوگا۔ اسی لیے پریم چند ادبیات کی وسیع تر مقبولیت میں لسانی اختلافات کی گنجائش نہیں ہے۔

کتابیات

• بنیادی مآخذ (اردو)

آخری تحفہ، پریم چند، نراین دت سہگل اینڈ کمپنی، طبع سوم ۱۹۴۰ء
بازارِ حسن (حصہ اول و دوم): پریم چند دارالاشاعت، پنجاب لاہور، ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء
بیوہ: پریم چند، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جنوری ۱۹۵۹ء
پردہ مجاز (حصہ اول و دوم) پریم چند، لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور۔ سن درج نہیں۔
پریم چند کے خطوط (مرتبہ مدن گوپال) مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۶۸ء
پریم چالیسی (حصہ اول و دوم)، پریم چند، گیلانی الکٹرک پریس، لاہور ۱۹۲۹ء
پریم پچیسی (حصہ اول و دوم) پریم چند، دارالاشاعت پنجاب لاہور، ۱۹۳۹ء
پریم بتیسی (حصہ اول) پریم چند، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۲۱ء
پریم بتیسی (حصہ دوم): پریم چند، زمانہ پریس، کانپور، سن درج نہیں۔
جلوۂ ایثار: پریم چند، کتاب منزل، لاہور، سن درج نہیں۔
جہانِ پریم چند: مرتبہ ڈاکٹر جعفر رضا (زیر طبع)
خاکِ پروانہ: پریم چند، گیلانی الیکٹرک پریس لاہور۔ سن درج نہیں۔
خواب و خیال: پریم چند، لاجپت رائے اینڈ سنس، دہلی ۱۰واں ایڈیشن
دودھ کی قیمت: پریم چند: عصمت بک ڈپو، دہلی ۱۹۴۳ء
روٹھی رانی: پریم چند، لاجپت رائے اینڈ سنس، دہلی۔ سن درج نہیں۔
زادِ راہ: پریم چند، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سن درج نہیں۔

غبن (حصہ اول و دوم): پریم چند، دارالاشاعت پنجاب لاہور ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء

فردوس خیال: پریم چند، ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد، سن درج نہیں۔

گوشۂ عافیت (حصہ اول و دوم) پریم چند، ادارہ فروغ اردو، دہلی، سن درج نہیں

گئو دان: پریم چند، مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۷ واں ایڈیشن ۱۹۷۲ء

مضامین پریم چند (مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، یونی ورسٹی پبلشرز، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۰ء

میدان عمل: پریم چند، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، فروری ۱۹۶۰ء

نرملا: پریم چند، گیلانی الکٹرک پریس، لاہور، سن درج نہیں۔

واردات: پریم چند، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۰ء

• بنیادی مآخذ (ہندی)

अग्नि-समाधि : प्रेमचंद : रामकुमार प्रेस, लखनऊ, प्र० व० नहीं।

अलग्योझा और अन्य कहानियाँ : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४५।

कफ़न : प्रेमचद; सरस्वती प्रेस, बनारस, १९३४।

कर्मभूमि : प्रेमचद, सरस्वती प्रेस, बनारस, द्वितीय संस्करण, १९३८

,, : हंस प्रकाशन, इलाहाबाद; नवीन संस्करण अक्तूबर, १९६८।

कायाकल्प, भाग १ तथा २ : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस; तृतीय संस्करण, १९४०।

,, : सरस्वती प्रेस, इलाहाबाद, वर्तमान सस्करण, १९६६

क़लम तलवार और त्याग : प्रेमचंद सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४६।

कुछ विचार : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९३९।

ग़बन : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस; द्वितीय संस्करण, १९३७।

'' : हंस प्रकासन, इलाहाबाद, ३१वां संस्करण, १९६०।

गल्परत्न : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४८।

गल्पसमुच्चय : प्रेमचद, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद १९५३।

गुप्तधन, भाग १ तथः २ : प्रेमचद (संपादक : अमृतराय) हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, प्र० सं० १९६२।

गुप्तधन, भाग ३ : प्रेमचंद (संपादक डॉ० जाफ़र रजा) (प्रेस में)

गोदान : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस; संस्करण, १९३६।
" : सरस्वती प्रेस, इलाहाबाद, वर्तमान संस्करण, १९७२।
ग्यारह राजनीतिक कहानियां और समरयात्रा : प्रेमचद, सरस्वती प्रेस, १९४६
ग्राम्य जीवन की कहानियां : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९५५।
जगत की कहानियां : प्रेमचंद, हिन्दुस्तानी पब्लिशिंग हाउस, इलाहाबाद, प्र० व० नहीं।
दो बहनें : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४८।
दो बैलों की कथा और बाबा जी का भोज : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, प्र० सं० नहीं।
नवजीवन : प्रेमचद, गोपाल पब्लिशिंग हाउस, पटना, १९३५।
नवनिधि : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस. १९४६।
निर्मला : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस; द्वितीय संस्करण, १९३८।
" : हंस प्रकाशन, इलाहाबाद; १३वां संस्करण फ़रवरी, १९६१।
पंचपरमेश्वर : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, प्र० व० नहीं।
पंच-प्रसून : प्रेमचंद, हिंदी पुस्तक एजेंसी, बनारस, १९५२।
पांच फूल : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४८।
प्रतिज्ञा : प्रेमचंद, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, नवीन संस्करण, जुलाई, १९६६।
प्रेम की वेदी : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४७।
प्रेमचन्द की सर्वश्रेष्ठ कहानियां : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९५५।
प्रेम-चतुर्थी : प्रेमचंद, हिंदी पुस्तक एजेंसी, बनारस, १९५२।
प्रेमतीर्थ : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४६।
प्रेम द्वादशी : प्रेमचंद, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, १९५४।
प्रेम पंचमी : प्रेमचंद. दक्षिण भारत हिंदी प्रचार सभा, मद्रास, १९३६।
प्रेम पचीसी : प्रेमचंद, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, प्र० व० नहीं।
प्रेम पीयूष : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९५५।
प्रेम पूर्णिमा : प्रेमचंद, हिंदी पुस्तक एजेंसी, बनारस सं० २२०७।
प्रेमाश्रम : प्रेमचंद, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, नवीन संस्करण, अक्टूबर, १९६७।

प्रेरणा और अन्य कहानियां : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस प० व० नहीं।

मंगलाचरण : (संपादक-अमृतराय) हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, प्रथम संस्करण, १९६२।

मानसरोवर (भाग १ से ८ तक) : प्रेमचंद, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, ११वां संस्करण १९६५।

रंगभूमि : प्रेमचंद, गंगा पुस्तकमाला, लखनऊ, १४वां संस्करण, संवत् २०१८
,, : सरस्वती प्रेस, इलाहाबाद, वर्तमान संस्करण, १९७१।

वरदान : प्रेमचंद, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, नवीन संस्करण, १९६५।

विविध प्रसंग (भाग १ से ३ तक) : प्रेमचंद (संपादक : अमृतराय) हंस प्रकाशन इलाहाबाद, प्रथम संस्करण, १९६२।

सप्त सरोज : प्रेमचंद, हिन्दुस्तानी पब्लिशिंग हाउस; इलाहाबाद, १९४४।

सप्त सुमन : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९५१।

समर यात्रा और ग्यारह अन्य राजनैतिक कहानियां : प्रेमचंद, हिंदुस्तानी पब्लिशिंग हाउस, इलाहाबाद, १९५१।

साहित्य का उद्देश्य : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस. जुलाई, १९५४।

सेवासदन : प्रेमचंद, हिंदी पुस्तक एजेंसी, कलकत्ता, ८वां संस्करण, संवत् १९९३ वि०।
,, : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, इलाहाबाद, संस्करण, १९६८।

हिंदी की आदर्श कहानियां : प्रेमचंद, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४५।

● ثانوی مآخذ (اردو)

اُردو ادب آزادی کے بعد: ڈاکٹر سید اعجاز حسین، کارواں پبلیکشنز الہ آباد ۱۹۶۱ء

اُردو کا المیہ: ڈاکٹر مسعود حسین خاں، شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مارچ ۱۹۷۳ء

اُردو مرثیہ: سفارش حسین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۶۵ء

اُردو مرثیے کا ارتقا: ڈاکٹر مسیح الزماں، کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۵۹ء

اُردو مثنوی کا ارتقا: ڈاکٹر سید محمد عقیل شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۶۵ء

اُردو شاعری میں سماجی پس منظر: ڈاکٹر سید اعجاز حسین کارواں پبلیکیشنز الہ آباد طبع اول ۱۹۶۸ء

اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۷۲ء

اُردو مثنوی شمالی ہند میں: ڈاکٹر گیان چند، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۹ء
اُردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر: ڈاکٹر سید مجاور حسین، شاہین پبلیکیشنز الہ آباد دسمبر ۱۹۷۵ء
اُردو ناول سمت و رفتار: سید علی حیدر، شبستان الہ آباد طبع اول ۱۹۷۷ء
افکار و مسائل: پروفیسر سید احتشام حسین، نسیم بک ڈپو لکھنؤ طبع اول اپریل ۱۹۱۳ء
انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ: عبداللہ یوسف علی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۶ء
اُردو ناول نگاری: ڈاکٹر سہیل بخاری، الحمرا پبلشرز، دہلی ۱۹۷۶ء
بیسویں صدی میں اُردو ناول: پروفیسر عبدالسلام، اُردو اکیڈمی، سندھ کراچی طبع اول ۱۹۷۳ء
بیسویں صدی میں اُردو ناول: ڈاکٹر یوسف سرمست: نیشنل بک ڈپو حیدر آباد طبع اول ۱۹۷۳ء
پریم چند کہانی کا رہنما: ڈاکٹر جعفر رضا، رام نرائن لال بینی مادھو الہ آباد طبع اول ۱۹۶۹ء
پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار: ڈاکٹر شمیم نکہت، نصرت پبلشرز، لکھنؤ طبع اول ۱۹۷۵ء
پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر قمر رئیس سرسید بک ڈپو علی گڑھ طبع اول ۱۹۵۹ء
پریم چند شخصیت اور کارنامے: ڈاکٹر قمر رئیس مکتبہ عالیہ رام پور طبع اول ۱۹۶۲ء
پریم چند اپنے عہد کے آئینے میں: سعیدہ عارفی تحقیقی مقالہ بعنوان "پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں پر گاندھیائی اثرات" (غیر مطبوعہ)
پریم چند - ڈاکٹر عبداللہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی ڈگری لاہور (غیر مطبوعہ)
پنجاب میں اُردو: حافظ محمود شیرانی، سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۷۰ء
تنقید اور عملی تنقید: پروفیسر سید احتشام حسین، ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ طبع سوم ۱۹۶۴ء
تنقید اور عصری آگہی: ڈاکٹر سید محمد عقیل، انجمن تہذیب نو الہ آباد طبع اول ۱۹۷۶ء
تنقیدیں: ڈاکٹر خورشید الاسلام، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ طبع دوم ۱۹۶۴ء
تلاش و توازن: ڈاکٹر قمر رئیس، خرام پبلیکیشنز دہلی بار اول ۱۹۶۸ء
تحریریں - ڈاکٹر گیان چند، ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ طبع اول ۱۹۶۴ء
تنقیدی اشارے: آل احمد سرور، ادارہ فروغ اُردو لکھنؤ، طبع سوم ۱۹۵۵ء
ترقی پسند ادب: علی سردار جعفری، اشاعت اُردو حیدر آباد دکن طبع اول ۱۹۴۵ء
تاریخ ادب اُردو - جلد اول ڈاکٹر جمیل جالبی ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۷ء
تمدن ہند پر اسلامی اثرات، ڈاکٹر تاراچند (ترجمہ) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۴ء
جدید اُردو ادب: ڈاکٹر محمد حسن، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ طبع اول نومبر ۱۹۷۵ء

جدیدیت اور ادب: مرتبہ پروفیسر آل احمد سرورؔ، شعبہ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۶۹ء
حیاتِ جاوید: مولانا الطاف حسین حالیؔ، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۳۹ء
خطوطِ سرسید، سر راس مسعود، مرتبہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء
دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی: ڈاکٹر جعفر رضا، نیشنل کتاب گھر الٰہ آباد طبع اوّل ۱۹۷۲ء
داستان سے افسانہ تک: پروفیسر وقار عظیم، طاہر بک ایجنسی دہلی جون ۱۹۷۲ء
داستانِ تاریخ اُردو۔ مولانا حامد حسین قادری، لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ ۱۹۵۷ء
ذوق و جستجو: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ادارہ فروغِ اُردو لکھنؤ طبع اول ۱۹۶۷ء
روشنائی: سید سجاد ظہیر۔ آزاد کتاب گھر دہلی طبع اول ۱۹۵۹ء
روشن مینار: اختر حسین رائے پوری، اُردو اکیڈمی سندھ کراچی بار اوّل ۱۹۵۵ء
سوانحات سلاطین اودھ (حصہ اول) کمال الدین حیدر، نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۹۶ء
سرسید کی صحافت: ڈاکٹر اصغر عباس، انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی طبع اوّل دسمبر ۱۹۷۵ء
علی گڑھ تحریک: نسیم قریشی (ایڈیٹر) شعبۂ اُردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۶۳ء
قلم کا مزدور: مدن گوپال، مکتبۂ جامعہ نئی دہلی مئی ۱۹۶۶ء
قومی تہذیب کا مسئلہ: ڈاکٹر عابد حسین، انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۵ء
لسانی مطالعے۔ ڈاکٹر گیان چند، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی طبع اوّل ۱۹۷۳ء
معیار و میزان۔ ڈاکٹر مسیح الزماں رام نرائن لال بینی مادھو الٰہ آباد طبع اوّل ۱۹۶۸ء
مختصر تاریخ ادب اردو: ڈاکٹر سید اعجاز حسین، فروغ اُردو لکھنؤ۔ ۱۹۶۵ء
مجموعہ لکچرہائے سرسید: مرتبہ منشی سراج الدین۔ ہلالی پریس ساڈھورہ ۱۸۹۲ء
مغل اور اُردو: نواب نصیر حسین خیالؔ، ایم اے عثمانی اینڈ سنس کلکتہ ۱۹۳۳ء
مشترکہ زبان: مہاتما گاندھی مترجم ڈاکٹر عابد حسین، انجمن ترقی اُردو ۱۹۵۰ء
مقدمہ تاریخ زبان اُردو: ڈاکٹر مسعود حسین خاں، سرسید بک ڈپو علی گڑھ
نئے ادبی رُجحانات: ڈاکٹر سید اعجاز حسین، کتابستان الٰہ آباد ۱۹۵۷ء
ناول کیا ہے: ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نسیم بک ڈپو لکھنؤ طبع چہارم ۱۹۶۸ء
نظر اور نظریے: پروفیسر آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۳ء

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اُردو مثنویاں، گوپی چند نارنگ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی جنوری ۱۹۶۲ء

ہماری قومی زبان: ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، انجمن ترقی اُردو (ہند) ۱۹۴۱ء

ہندی ادب کی تاریخ ڈاکٹر محمد حسن اورینٹ لانگ مین، نئی دہلی طبع دوم ۱۹۷۳ء

ہندستانی: مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۶۹ء

ہندوستانی لسانیات: ڈاکٹر محی الدین قادری، نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۰ء

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ: پروفیسر سید احتشام حسین، دانش محل لکھنؤ، طبع سوم ۱۹۶۳ء

● ثانوی ماخذ (ہندی)

अरस्तू का काव्यशास्त्र : डॉ नगेन्द्र, भारती भण्डार, इलाहाबाद, संवत् २०१३ वि० ।

आधुनिक कहानियां : डॉ० हरदेव बाहरी, मेहरचंद मुंशीराम, दिल्ली, १९५२ ।

आधुनिक हिंदी कथा साहित्य और मनोविज्ञान : डॉ० देवराज उपाध्याय, एम० चांद एण्ड कपनी, दिल्ली, प्रथम संस्करण १९६४ ।

आधुनिक परिवेश और नवलेखन : डॉ० शिव प्रसाद सिंह, लोकभारती प्रकाशन, इलाहाबाद १९७० ।

उपन्यासकार प्रेमचंद : (संपा०) डॉ० सुरेश चंद्र आदि : अशोक प्रकाशन, दिल्ली, प्रथम संस्करण, १९६५ ।

उपन्यास सम्राट प्रेमचंद : शिव नारायण श्रीवास्तव, प्रकाशन विभाग, सूचना और प्रसारण मंत्रालय, भारत सरकार, नयी दिल्ली, प्र० स० १९६६ ।

उर्दू साहित्य का आलोचनात्मक इतिहास : प्रो० सैयद एहतेशाम हुसैन, लोकभारती प्रकाशन, इलाहाबाद, १९६६ ।

उर्दू साहित्य का इतिहास : ब्रजरत्नदास : हिंदी साहित्य कुटीर, काशी, स० २००७ वि० ।

कथाकार प्रेमचंद : डॉ० जितेन्द्र नाथ पाठक, सरस्वती मंदिर, बनारस, नवंबर १९५५ ।

कथा के तत्व : डॉ० देवराज उपाध्याय, ग्रंथमाला कार्यालय, पटना १९५७ ।

क़लम मज़दूर : मदन गोपाल, राजकमल प्रकाशन, दिल्ली, सं० १९६५ ।

कला और आधुनिक प्रवृत्तियां : रामचंद्र शुक्ल, प्रकाशन शाखा, सूचना विभाग, उत्तर प्रदेश सरकार, लखनऊ, प्र० सं० १९५८।

कला के हस्ताक्षर : देवेन्द्र सत्यार्थी, एशिया प्रकाशन, नयी दिल्ली, प्र० सं० १९५४।

कलाकार प्रेमचंद : डॉ० रामरतन भटनागर, युनिवर्सल प्रेस इलाहाबाद, प्र०व० नहीं।

कहानी कला और प्रेमचंद : श्रीपति शर्मा, विद्या मंदिर, काशी, १९४८।

खड़ी बोली का आंदोलन : शितिकंठ मिश्र, नागरी प्रचारिणी सभा, काशी, सं० २०१३ वि०।

खड़ी बोली का लोकसाहित्य : डॉ० सत्या गुप्त, हिंदुस्तानी एकेडेमी, इलाहाबाद, १९६५।

खड़ी बोली हिंदी साहित्य का इतिहास : व्रजरत्नदास, हिंदी साहित्य कुटीर, बनारस, सं० १९९८ वि०।

गांधी और गांधीवाद : डॉ० बी० पट्टाभि सीतारमैया, शिव ए० क०, आगरा, १९५९।

गांधीवाद और मार्क्सवाद : श्रीकृष्णदत्त पालिवाल, अग्रवाल एण्ड कं० आगरा, प्र० व० नहीं।

गोदान : अध्ययन की समस्याएँ : डॉ० गोपालराय, ग्रंथ निकेतन, पटना, प्र० सं० १९५८।

गोदान : पुनर्मूल्यांकन : डॉ० राजपाल शर्मा, अशोक प्रकाशन, दिल्ली प्र० सं० १९७३।

गोदान : मूल्यांक और मूल्यांकन : (संपा०) डॉ० इन्द्रनाथ मदान, नीलाभ प्रकाशन, इलाहाबाद, प्र० सं० १९७१।

ग्रामीण हिंदी : डॉ० धीरेन्द्र वर्मा, साहित्य भवन, इलाहाबाद, १९५५।

दक्खिनी हिंदी : डॉ० बाबूराम सक्सेना, हिंदुस्तानी एकेडेमी, इलाहाबाद, १९५२।

नया हिंदी साहित्य—एक भूमिका : प्रो० प्रकाशचद गुप्त,, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४६।

नये पुराने झरोखे : हरवंशराय बच्चन, राजपाल एंड सस, दिल्ली प्र० सं० १९६२।

निबध और निबंध : इन्द्रनाथ मदान, बंसल एण्ड कंपनी, दिल्ली; १९६६।

प्रेमचंद : डॉ० रामरतन भटनागर, किताब महल, इलाहाबाद, १९४८।

प्रेमचंद : डॉ० गंगा प्रसाद बिमल, राजकमल प्रकाशन, दिल्ली प्र० सं० १९६८

प्रेमचंद : डॉ० त्रिलोकी नारायण दीक्षित, साहित्य निकेतन, कानपुर १९५२।

प्रेमचंद : एक कृति व्यक्तित्व : जैनेन्द्र कुमार, पूर्वोदय प्रकाशन, दिल्ली, प्र० सं०, १९६७ ।

प्रेमचंद एक अध्ययन : डॉ० राजेश्वर गुरु, मध्य प्रदेशीय प्र० समिति, भोपाल, प्र० सं०, १९६१ ।

प्रेमचंद—एक विवेचन : डॉ० इन्द्रनाथ मदान, राजकमल प्रकाशन; दिल्ली, प्र० व० नहीं ।

प्रेमचंद, आलोचनात्मक परिचय : डॉ० रामविलास शर्मा, सरस्वती प्रेस, बनारस, १९४१ ।

प्रेमचंद और उनका युग : डॉ० रामविलास शर्मा, मेहरचंद मुंशीराम, दिल्ली, १९५२ ।

प्रेमचंद और उनका साहित्य : डॉ० (श्रीमती) शीला गुप्त, साहित्य भवन, प्र० लि०, इलाहाबाद, १९७२ ।

प्रेमचंद और उनकी कहानी कला : डॉ० सत्येन्द्र, भारतीय रत्न भण्डार, आगरा, प्र० व० नहीं ।

प्रेमचंद और उनकी साहित्य साधना : डॉ० पद्मसिंह शर्मा 'कमलेश', अत्तरचंद कपूर एण्ड संस, दिल्ली, प्र० व० नहीं ।

प्रेमचंद और गांधीवाद : डॉ० रामदीन गुप्त, हिंदी साहित्य संसार, पटना, प्र० सं०, मार्च, १९६१ ।

प्रेमचंद और गोर्की : (संपा०) शचीरानी गुर्टू, राजकमल प्रकाशन, बम्बई, १९५५ ।

प्रेमचंद और ग्राम-समस्या : डॉ० प्रेम नारायण टण्डन, रामप्रसाद एण्ड संस, आगरा, १९४१ :

प्रेमचंद, क़लम का सिपाही : अमृतराय, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद प्र० सं०, १९६२ ।

प्रेमचंद—कला और कृतित्व : हंसराज रहबर, आत्माराम एण्ड संस, दिल्ली, द्वि० सं०, १९६२ ।

प्रेमचंद की उपन्यास-कला : जनार्दन प्रसाद झा 'द्विज', वाणी मंदिर, छपरा, तृतीय सं०, १९४६ ।

प्रेमचंद उनकी कृतियां और कला : डॉ० प्रेमनारायण टण्डन, पब्लिशिंग हाउस, प्रयाग, १९४२ ।

प्रेमचंद के उपन्यासों का शिल्प-विधान : डॉ० कमल किशोर गोयनका, सरस्वती प्रेस, दिल्ली, प्र० सं०, १९७४ ।

प्रेमचंद के साहित्य-सिद्धांत : डॉ० नरेन्द्र कोहली, अशोक प्रकाशन, दिल्ली, १९६६ ।

प्रेमचंद घर में : शिवरानी देवी, आत्माराम एण्ड संस, दिल्ली, सं० १९५६ ।
प्रेमचंद—चिंतन और कला : डॉ० इन्द्रनाथ मदान, सरस्वती प्रेस, बनारस, प्र० व० नहीं ।
प्रेमचंद, जीवन कला और कृतित्व : हंसराज 'रहबर', आत्माराम एण्ड संस, दिल्ली, १९५१ ।
प्रेमचंद पूर्व हिंदी उपन्यास : डॉ० कैलाश प्रकाश, हिंदी साहित्य संसार, दिल्ली, प्र० सं० १९६२ ।
प्रेमचंद प्रतिभा (संपा०) : डॉ० इन्द्रनाथ मदान, सरस्वती प्रेस, इलाहाबाद, प्र० सं० १९६७ ।
प्रेमचंद व्यक्तित्व और कृतित्व : (संपा०) शचीरानी गुर्टू, इंडिया पब्लिशिंग हाउस, नयी दिल्ली ।
प्रेमचंद व्यक्तित्व और साहित्यकार : मन्मथनाथ गुप्त, सरस्वती प्रेस, इलाहाबाद, प्र० सं० १९६१ ।
प्रेमचंद साहित्यिक विवेचन : आचार्य नन्ददुलारे वाजपेयी, हिंदी भवन, इलाहाबाद, १९५२ ।
प्रेमचंद स्मृति : अमृतराय, हंस प्रकाशन, इलाहाबाद, १९५९ ।
बापू और भारत : पं० कमलापति त्रिपाठ, सरस्वती मंदिर, बनारस, १९४८ ।
बापू के हरिजन : महात्मागांधी (अनु० परिपूर्णानंद वर्मा) स० २००६ वि० ।
भारत में अंग्रेजी राज : सुन्दरलाल, प्रकाशन विभाग, नयी दिल्ली, जुलाई, १९६० ।
भाषा और समाज : डॉ० रामविलास शर्मा, पीपुल्स पब्लिशिंग हाउस (प्र०) लि०, नयी दिल्ली, १९६१ ।
राष्ट्रभाषा की समस्या : रविशंकर शुक्ल, गंगा ग्रंथागार लखनऊ, स० २००२ वि० ।
राष्ट्रभाषा पर विचार : पं० चन्द्रबली पाण्डेय, सरस्वती मंदिर, काशी, सं० २००२ वि० ।
राष्ट्रभाषा हिंदी समस्याएँ और समाधान : डॉ० देवेन्द्र शर्मा, राजकमल प्रकाशन, दिल्ली १९६५ ।
राष्ट्रीयता और समाजवाद : आचार्य नरेन्द्रदेव, ज्ञान मण्डल, बनारस, सं० २००६ वि० ।
सन् सत्तावन की राज्यक्रान्ति : डॉ० रामविलास शर्मा, विनोद पुस्तक मंदिर, आगरा, १९५७ ।
सर्वोदय तत्व दर्शन : गोपीनाथ धवन, सस्ता साहित्य मण्डल, नयी दिल्ली, १९५१ ।

साहित्य : राम अवध द्विवेदी, भारती भण्डार, इलाहाबाद, प्र० सं० २०१८ वि० ।

साहित्य का नया परिप्रेक्ष्य : डॉ० रघुवंश, भारतीय ज्ञानपीठ काशी, प्र० सं० १९६३ ।

साहित्यिक शब्दावली : प्रेमनारायण टण्डन, हिंदी सा० भण्डार, लखनऊ, प्र० म० १९६२ ।

साहित्यशास्त्र : डॉ० रामकुमार वर्मा, भारतीय विद्या भवन इलाहाबाद, १९५६

हिंदी उद्भव विकास और रूप डॉ० हरदेव बाहरी, किताब महल, इलाहाबाद, प्र० स० १९६५ ।

हिंदी उपन्यास : डॉ० शिवनारायण श्रीवास्तव, सरस्वती मंदिर, वाराणसी, प्र० स० स० २०१६ वि० ।

हिंदी उपन्यास : डॉ० रामदरश मिश्र, राजकमल प्रकाशन, दिल्ली, प्र० सं० १९६८ ।

हिंदी उपन्यास-उद्भव विकास : डॉ० सुरेन्द्र सिन्हा, अशोक प्रकाशन, दिल्ली, प्र० स० १९६५ ।

हिंदी उपन्यास—एक सर्वेक्षण : डॉ० महेंद्र चतुर्वेदी, नेशनल पब्लिशिंग हाउस, दिल्ली, प्र० सं० १९६२ ।

हिंदी उपन्यास का उद्भव और विकास : डॉ० प्रताप नारायण टण्डन, हिंदी साहित्य भण्डार लखनऊ, १९६० ।

हिंदी उपन्यास—समाज शास्त्रीय विवेचन : डॉ० चण्डी प्रसाद जोशी, अनुसंधान प्रकाशन, कानपुर, प्र० सं०, १९६२ ।

हिंदी उपन्यास साहित्य : ब्रजरत्नदास, हिंदी साहित्य कुटीर, बनारस, प्र० सं०, सं० २०१३ वि० ।

हिंदी कहानी, उद्भव और विकास : डॉ० सुरेश सिन्हा, अशोक प्रकाशन, दिल्ली, १९६७ ।

हिंदी कहानियों की शिल्प-विधि का विकास : डॉ० लक्ष्मीनारायण लाल, साहित्य भवन प्रा० लि० इलाहाबाद, १९५३ ।

हिंदी कहानी की रचना-प्रक्रिया : डॉ० परमानंद श्रीवास्तव, ग्रंथकार, कानपुर, फ़रवरी, १९६५ ।

हिंदी कहानी, स्वरूप विकास और प्रतिनिधि कहानीकार : डॉ० रा० प्रकाश प्रकाश दीक्षित, विनोद पुस्तक मंदिर, आगरा, प्र० सं० १९६० ।

हिंदी के उपन्यासकार डॉ० ब्रजदत्त शर्मा, भारती (भाषा) भवन, दिल्ली, अक्टूबर, १९५१ ।

हिंदी-भाषा आंदोलन : लक्ष्मीचंद, हिंदी साहित्य सम्मेलन, इलाहाबाद, म० १९८५ ।

हिंदी-भाषा और सामान्यज्ञान : डॉ० हरदेव बाहरी, लोक भारती प्रकाशन, इलाहाबाद नवम्बर, १९७१ ।

हिंदी-भाषा का इतिहास : डॉ० धीरेन्द्र वर्मा, हिंदुस्तानी एकेडेमी, इलाहाबाद, १९४९ ।

हिंदी-साहित्य : डॉ० हजारी प्रसाद द्विवेदी, अतरचंद कपूर एण्ड संस, दिल्ली, १९६४ ।

हिंदी-साहित्य का इतिहास : आचार्य रामचन्द्र शुक्ल, नागरी प्रचारिणी सभा, वाराणसी, सं० २०१८ वि० ।

हिंदी-साहित्य की भूमिका : डॉ० हजारी प्रसाद द्विवेदी, हिंदी ग्रंथ रत्नाकर कार्यालय, बम्बई, १९५० ।

हिंदी-साहित्य के अस्सी वर्ष : डॉ० शिवदानसिंह चौहान, राजकमल प्रकाशन, दिल्ली, द्वितीय सं० १९६१ ।

हिंदी-साहित्य कोश, भाग १ व २ : (संप) डॉ० धीरेन्द्र वर्मा, ज्ञान मण्डल लि० वाराणसी, प्र० सं० संवत् २०१५ ।

हिंदी-साहित्य—बीसवीं शताब्दी : आचार्य नन्ददुलारे वाजपेयी, इंडियन प्रेस, इलाहाबाद, सं० १९५८ ।

हिंदू-मुस्लिम समस्या : डॉ० बेनी प्रसाद, साहित्य भवन लि०, प्रयाग, १९४३

● ثانوی مآخذ (انگریزی)

Comparative Grammer of Modern Aryan Languages of India : John Beams, Trubner & Co., London, 1975.

Communalism and the Writing of Indian History : Dr. R. Thaper, Dr. H. Mukhia & Dr. B. Chandra, Peoples' Publishing House, New Delhi, 1969.

Congress Ideology : P. D. Kaushik, Allied Publishers, Bombay, 1964.

(The) Deoband School and Demand for Pakistan : Ziaul Hasan Farooqi, Asia Publishing House, Bombay, 1963.

Mahatma Gandhi, The Last Phase, Vol. I & II : Pyare Lal, Navjivan Publishing House, Ahmadabad, February, 1958.

Major Government of Asia : G. M. Kahin (Ed)., Cornell University Press, New York, 1958

Modern Islam in India : Wilfred Cantwell, Minerva Bookshop, Lahore, 1963.

National Language for India : Z. A. Ahmad, Kitabistan, Allahabad, 1941.

Our Language Problem : M. K. Gandhi, A. T. Hingorani, Karachi.

Munshi Prem Chand : Madan Gopal, Asia Publishing House, Bombay, 1964.

Renanscent India : H. E. C. Zacharias, Allen Unwin, London, 1933.

Selected Works Vol I & II : Karl Marx & Frederick Engels, Foreign Language Publishing House, Moscow, 1962.

Social Background of the Indian Nationalism : A. R. Desai, Popular Book Depot, Bombay, 1959.

(A) Survey of Indian History : K. M. Panikar, Asia Publishing House, Bombay, 1962.

Thoughts on National Language : M. K. Gandhi, Navajivan Publishing House, Ahmadabad, 1957.

(The) Unity of India : Jawahar Lal Nehru, Lindsay Drummand London, 1941.

(The) Discovery of India : Jawahar Lal Nehru, Signe & Press, Calcutta, 1945.

(The) Hindi Prachar Movement : M. P. Desai, Navajivan Publishing House, Ahmdabad, 1957.

(The) History of the Congress : Dr. B. Pattabhi Sitaramayya, Padma Publ. Ltd., Bombay, 1946.

History of the Freedom Movement in India. Vol. II : Dr. Tara Chand, Publication Division, New Delhi 1961.

(A) History of Urdu Literature . Mohd. Sadiq, Oxford University Press, London, 1964.

India Divided : Dr. Rajendra Prasad, Hind Kitab, Bombay, 1947.

(The) Indian Federation : Dr. Sir Shifat Ahmad Khan, Mac., London, 1937,

(The) Indian Nationalism and Hindu Reform : Chales H. Heimsmath, Princeton University Press; 1964.

Indo-Aryan & Hindi : Dr. Sunit Kumar Chaterji, Firma K. L. Mukhopadhyaya, Calcutta, II Ed., 1960.

Language Conflict and National Development : Jyotirindra Das Gupta, University California Press, 1970.

Linguistic Affairs of India : Ram Gopal, Asia Publishing House, Bombay, 1966.

Linguistic Survey of India, Vol. I, Part I, Government of India, Central Publication Branch, 1977.

Lokamanya Tilak, A Biography : Ram Gopal, Asia Publishing House, Bombay, 1956.

● اُردو رسائل و اخبارات

ادیب : الٰہ آباد ستمبر ۱۹۱۰ء سے اپریل ۱۹۱۳ء تک

اُردو : اورنگ آباد، اپریل ۱۹۳۶ء

اُردو ادب : علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۶ء

العصر : لکھنؤ : اکتوبر ۱۹۱۱ء سے دسمبر ۱۹۱۴ء تک

بہارستان : لاہور : فروری ۱۹۲۷ء

تہذیب الاخلاق : علی گڑھ ۱۸۸۱ء

جامعہ : دہلی : دسمبر ۱۹۳۵ء

چندن : لاہور : گست - ستمبر ۱۹۳۱ء تک

زمانہ : کانپور- جنوری ۱۹۰۵ء سے ستمبر ۱۹۳۷ء تک

شاعر : بمبئی- مئی جون ۱۹۶۱ء

شاہکار : لاہور- مئی ۱۹۳۹ء

صبح امید : لکھنؤ- مارچ ستمبر ۱۹۳۰ء

عصمت : دہلی- جنوری ۱۹۳۳ء سے دسمبر ۱۹۳۴ء تک

فروغ اردو : لکھنؤ- اردو پریم نمبر جنوری- فروری ۱۹۶۸ء

فکر و نظر : علی گڑھ- حصہ ۱۱ شمارہ ۲-۱۹۷۱ء

قومی زبان کراچی ۱۶ فروری ۱۹۶۱ء

ہمدرد : ۱۷ جولائی ۱۹۱۳ء

ہندی رسائل و اخبارات

उषा, जम्मू, मई १९३० ।

चांद, इलाहाबाद, अप्रैल ४९२३ से अगस्त २२३५ तक ।

जागरण, बनारस, १९३२ से १९३७ तक

प्रभा, कानपुर, जुलाई १९२३ से जुलाई १९३१ तक

भारत, इलाहाबाद, १९२८ (ग)

भारतीय, इलाहाबाद, फ़रवरी, १९१४ ।

भारतेन्दु, मथुरा, दिसंबर, १९२८ ।

मतवाला, ११ अगस्त, १९२६ ।

माधुरी, लखनऊ, अगस्त, १९२२ से दिसंबर, १९३६ ।

माया, इलाहाबाद, जनवरी, १९३० ।

विशाल भारत, कलकत्ता, ७ अप्रैल १९२४ से जनवरी १९११ ।

वीणा, इन्दौर, जुलाई १९३० ।

शुद्धिसमाचार, श्रद्धानंद बलिदान विशेषांक ।

सरस्वती, इलाहाबाद, दिसंबर १९१५ से जनवरी १९२६ ।

साहित्य, पटना, जनवरी, १९६० ।

साप्ताहिक हिन्दुस्तान, दिल्ली १७ फरवरी, १९६३ ।

सुधा, लखनऊ आश्विन ३०५ तुलसीसंवत ।

स्वदेश, फ़रवरी १९१९ से अगस्त १९३५ तक ।

हंस, बनारस, अक्तूबर १९२५ से स्मृति अंक, १९३७ ।

اشاریہ

ت

ٹ

ج

ر

ز

س

ن و

ہ

ی